بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن حیدر آباد نے بذریعہ سرکلر نمبر ED/PUB/ED 61-698 مورخہ 8 12/61 برائے انٹرمیڈیٹ منظور فرمائی

اسلامی

نظامِ حیات

شیخ محمد اقبال ایم اے (عربی) - ایم اے (اسلامیات)

علمی کتاب خانہ، اردو بازار، لاہور

اشاعتیں

(۱) ستمبر ۱۹۶۱ء (۲) ستمبر ۱۹۶۱ء
(۳) اکتوبر ۱۹۶۱ء (۴) جنوری ۱۹۶۲ء
(۵) مارچ ۱۹۶۲ء (۶) مئی ۱۹۶۲ء
(۷) ستمبر ۱۹۶۲ء (جدید ایڈیشن مع ترمیم و اضافہ)
(۸) ستمبر ۱۹۶۲ء (۹) ستمبر ۱۹۶۲ء
(۱۰) نومبر ۱۹۶۲ء (۱۱) مئی ۱۹۶۳ء
(۱۲) جون ۱۹۶۳ء (۱۳) جون ۱۹۶۳ء
(۱۴) اگست ۱۹۶۳ء (۱۵) ستمبر ۱۹۶۳ء
(۱۶) اکتوبر ۱۹۶۳ء (۱۷) فروری ۱۹۶۴ء
(۱۸) مئی ۱۹۶۴ء (۱۹) جولائی ۱۹۶۴ء

دین اور تہذیب کا ذکر

مولوی سردار محمد پرنٹر پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر علمی کتاب خانہ،
اردو بازار لاہور سے شائع کیا۔

عنوانات

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

پیش لفظ

(پہلا اڈیشن)

اسلامی نظامِ حیات پر اپنی کوشش ناتمام ہدیۂ ناظرین کر رہا ہوں
میں نے مختلف عنوانات کو فنی شکل دینے اور ان کے مضامین کو ترتیب
سے پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ مواد کا کوئی حصہ بغیر سند کے نہیں ہے۔
اس تالیف کے کئی عنوان اس سے قبل میری بعض اور تالیفات
میں چھپ چکے ہیں۔ ان میں ضروری ترمیم، اضافہ کر دیا ہے۔ جہاں
موزوں سمجھا مواد کی ترتیب بدل دی ہے اور ضمنی سرخیاں قائم
کر دی ہیں۔
اللہ تعالےٰ سے دعا ہے کہ اس تالیف کو قبول کا جامہ
عطا فرمائے۔

دوسرا ایڈیشن

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن

اسلامی نظام حیات کو مقبول نصیب ہوا کہ چند ماہ میں چھ بار طبع ہوئی۔ اس کی طلب بدستور جاری ہے۔ خلعت قبول اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جسے عزت بخشنا چاہے اپنے بندوں کے دل میں بھی اس کی قدر و محبت پیدا کر دیتا ہے۔

خدائے رحمٰن و رحیم کی ستائش کے ہمراہ حبیب خدا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عاجز نوازی کا ذکر بھی لازم ہے جس کا نام مجھ عاجز کے لئے راحت کا پیغام ہے اور جس کے طفیل بارگاہِ خداوندی سے عزت و آبرو کی دولتِ لازوال نصیب ہوتی ہے۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

اَللّٰھُمَّ بَارِكْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

میں اہل علم طبقہ کا شکر گزار ہوں جنھوں نے اس کتاب کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ انھیں نیک نیتی کا اجر عطا فرمائے۔

اس وقت اسلامی نظامِ حیات کا دوسرا ایڈیشن ہدیۂ قارئین ہے اس کا حجم بڑھا دیا گیا ہے۔ پہلے ایڈیشن میں عجلت کے

اسلامی زندگی

وحدتِ حیات

کمالِ وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوکِ نشتر سے تو جو چھیڑے
یقیں ہے مجھ کو گرے رگِ گُل سے قطرہ انسان کے لہو کا
(اقبال)

اسلام زندگی کو وحدت کے طور پر قبول کرتا ہے۔ زندگی کے بے شک کئی شعبے ہیں لیکن ان کی ایک وحدت ہے۔ یہ سب شعبے باہم مربوط اور ایک دوسرے سے متاثر رہتے ہیں۔
اسلامی نقطۂ نگاہ سے انفرادی اور معاشرتی زندگی کا ایک مشترکہ اور وحدانی نظام ہے۔ اس نظام سے جو عنصر الگ اور بے قید ہو جائے وہ فساد کا موجب بن جاتا ہے۔ مثلاً کوئی مسلمان یہ کہے کہ میں اپنے لباس اور وضع و قطع کو دینی انضباط سے آزاد کرنا چاہتا ہوں تو وہ درحقیقت اپنی سازی شخصیت کو اسلام سے بغاوت پر آمادہ کرتا ہے۔ اس رُجحان کے بھرپور اثرات شاید بیسیوں برس بعد شدنما ہوں لیکن اس شجر خبیثہ کی کونپلیں پہلے ہی دن سے پھوٹنے لگتی ہیں۔ یہ کونپلیں ظاہر کی آنکھ کو بے شک نظر نہ آئیں لیکن بصیرت کی آنکھ انھیں فوراً دیکھ لیتی ہے۔
جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تعلیمات نے نظری اور عملی ہر دو لحاظ سے ایک کامل نظامِ حیات پیش کیا ہے۔ اس نظام کے اندر روح بدن سے اور بدن روح سے وابستہ ہو کر زندہ رہتی ہے! اس

نظام میں اخلاق قانون پر اور قانون اخلاق پر مبنی ہے۔ فرد ملت سے اور ملت فرد سے قائم ہے۔ اسلام کی نگاہ میں ہر وہ دل جس کی حرکت امت کی دھڑکن پر نہیں ایک بے جان پتھر کے مانند ہے یا اس سے مردہ تر۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے:

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ (لقمان)

ترجمہ:- تم سب کا پیدا کرنا اور اٹھانا نفس واحد کی طرح ہے۔

کوئی قوم کائنات کے اصول تکوینی سے انحراف کرکے تمکن اور استحکام نہیں پا سکتی۔ اگر وہ دیگر اقوام سے کٹ کر رہنا چاہے تو ترقی کے جادہ پر گام زن نہیں رہ سکتی۔ اس کی خوش حالی یا ترقی پذیری اس وقت تک دیرپا نہیں رہ سکتی جب تک وہ دیگر اقوام کو بھی ساتھ چلانے کی سعی نہ کرے۔ افضل وہ ہے جو دوسروں کو بھی اعلیٰ بنانے کی صلاحیت اور تڑپ رکھتا ہے۔ کوئی مومن اس وقت تک کاملاً صاحب ایمان نہیں ہوتا جب تک وہ دوسروں کو بھی صاحب ایمان بنانے کی کوشش نہ کرے۔

ساری کائنات وحدت کے اصول پر چل رہی ہے۔ روح اور مادہ کی وحدت، زمین اور افلاک کی وحدت، انسان اور کائنات کی وحدت، انسان اور انسان کی وحدت، فرد اور جماعت کی وحدت۔ کائنات میں بظاہر جو دوئی اور تضاد نظر آرہا ہے اس سے انکار نہیں لیکن حقیقت میں یہ بھی ایک ہی وحدتِ حیات کے دو رخ ہیں۔

اگر انسان کے دل میں وحدت حیات کا احساس پیدا ہو جائے تو اس کے ذہنی اور جسمانی نظام ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ فکر کے دائرے

ایک دوسرے کی تقویت کرتے ہیں۔ فکری انتشار اور ذہنی ابتری معدوم
ہو جاتی ہے۔ انسان نہ صرف اپنا بلکہ ہر شے کا مقام متعین کر لیتا ہے
[illegible] ظلم اور بے اعتدالی [illegible] دور رہتا ہے۔

اسلامی زندگی کا نظام

عناصرِ ترکیبی

زندگی کے کئی دائرے ہیں جو ایک دوسرے کو محیط ہیں۔ مثلاً ایک دائرہ فرد کا ہے، ایک گھر کا، ایک معاشرہ کا۔ ایک حکومت کا۔ یہ سب دوائر ایک دوسرے سے ہم آغوش ہیں۔ اسلام نے ان کی اصلاح و فلاح کے لیے کچھ ضوابط مقرر کئے ہیں۔ ان ضوابط کی دو قسمیں ہیں: اخلاقی اور قانونی۔ اگر اخلاق کی آزادی چھین کر اس کو قانون کی چار دیواری میں بند کر دیا جائے تو اس کی روح پژمردہ ہو جاتی ہے اور اگر قانون کو اخلاق کے آسرے پر چھوڑ دیا جائے تو قانون کا سارا زور پانی ہو جاتا ہے اگر ان دونوں کو اپنی حدود میں رکھا جائے اور ان کو ایک دوسرے پر غارت کرنے کی اجازت نہ دی جائے تو یہ باہم مددگار بلکہ جاں نثار ثابت ہوتے ہیں۔

اسلامی زندگی کا اولین نصب العین اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے۔ یہ نصب العین عمدہ اور مکمل اخلاق ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ ہادی برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ

ترجمہ (مجھے اس لئے بھیجا گیا ہے کہ عمدہ اخلاق کی تکمیل کروں)

غور سے دیکھا جائے تو قانون کے مقابلہ میں اصل نصب العین کی حیثیت اخلاق کو حاصل ہے۔ قانون اخلاق کا پاسبان ہے۔ لیکن اس پاسبان کا وجود اس قدر لابدی ہے کہ اس میں بھی ایک دائم اور غیر منقطع مقصدیت پیدا ہو جاتی ہے۔ قانون اخلاق کی فصیل ہے۔ اخلاق کی

(۱) کلمۂ طیبہ یا کلمۂ شہادت۔
(۲) نماز۔
(۳) زکوٰۃ۔
(۴) صیام۔
(۵) حج۔

جس طرح اجزائے ایمان انسان کی جذباتی اور ذہنی دنیا کی بنیاد ہیں اس طرح ارکانِ اسلام عملی زندگی کی بنیاد ہیں۔

اسلام کے لفظی معنی ہیں اپنے کو سپرد کر دینا۔ اصطلاح میں اسلام کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام کی پیروی کرنا۔ یہ پیروی ارکانِ اسلام کی بجا آوری کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ جو شخص ارکانِ اسلام کو مکمل طور سے بجا لانے کی کوشش کرتا ہے اس کے دل میں نیکی کے لئے شدید جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اسے نیکی میں راحت اور مسرت محسوس ہونے لگتی ہے۔ وہ نیکی محض نیکی کے لئے اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے بجا لاتا ہے۔ اس کو نیکی پر مجبور کرنے کی حاجت نہیں ہوتی اور نہ اُسے گردن سے پکڑ کر بُرائی سے دُور کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

اجزائے ایمان اور ارکانِ اسلام کی اگر پوری پابندی کی جائے تو دنیا میں قانون اور پولیس کی قطعاً ضرورت نہ ہو لیکن انسان آخر انسان ہے۔ اس سے لغزشیں اور کوتاہیاں سرزد ہوتی ہیں۔ اس لئے قانون اور حکومت کی اخلاقی نگرانی کے بغیر چارہ نہیں۔

۳- اخلاق

مفہوم اَخلاق، خُلق یا خُلُق کی جمع ہے۔

خُلق انسان کی فطرت یا طبیعت کو کہتے ہیں۔ جو اوصاف انسان میں رچ بس کر اس کی طبیعت کا جزو بن جائیں اُن کو اخلاق کہتے ہیں۔

رذائل سے بچنے اور فضائل سے آراستہ ہونے کا نام حسنِ خلق ہے مثلاً جھوٹ سے احتراز کرنا اور صداقت کو اختیار کرنا حُسنِ خُلق ہے۔

اخلاق کے رذائل و فضائل کے بارہ میں یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ صرف رذائل ہی سے بچنا ضروری نہیں بلکہ اسلام ہر اس شے سے دُور رہنے کا حکم دیتا ہے جو رذیلت کی طرف مائل کرتی ہے جہاں تک فضائلِ اخلاق کا تعلق ہے وہاں یہ لابدی ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی نیکی کو بھی چھوٹا نہ سمجھا جائے۔

اخلاق کی بعض ایسی چیزیں ہیں جن میں اسلام نے انسان کو آزادی دے دی ہے۔ لیکن بعض امور میں قانونی پابندیاں لگا دی ہیں تاکہ لوگ بالکل بے پروا اور بے خوف نہ ہو جائیں۔ یہی قانون اور اخلاق کی حدِ فاصل ہے۔

اسلامی فلسفہ اخلاق کے امتیازات اسلام نے اخلاق کا ایک نہایت ہی جامع مانع نظام پیش کیا ہے۔ دیگر مذاہب نے بھی اخلاقی نظام پیش کئے ہیں لیکن اسلام نے جو نظام پیش کیا ہے اس کے کچھ ایک امتیازات و خصائص ہیں جو دیگر مذاہب میں نہیں ملتے۔ مثلاً

(۱) عمل پذیری۔
(۲) جامعیّت۔
(۳) تعدیل۔
(۴) دوام۔

ان چاروں خصائص کا ہم فرداً فرداً ایک مختصر جائزہ لیں گے۔

۱۔ **عمل پذیری:** اسلام نے جو اخلاقی تصور پیش کیا ہے وہ آسانی سے عمل کے سانچے میں ڈھل سکتا ہے۔ یہ اخلاق محض دیوی دیوتاؤں کے ہی بس کی چیز نہیں بلکہ عام انسان بھی اس پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔ یہ فلسفۂ اخلاق نہ صرف جناب پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کردار میں نمودار ہوا بلکہ صحابۂ کرام رضؓ بھی اس پر کامیابی سے کاربند ہوئے اور دنیا کے سامنے یہ ثابت کر گئے کہ اسلامی فلسفۂ اخلاق کوئی ایسا فلسفہ نہیں جو عمل کے دائرہ میں نہ سما سکے بلکہ اس کی ہو بہو پیروی کی جا سکتی ہے۔

سوائے پیغمبر کے ہر ایک سے گناہ سرزد ہو سکتا ہے۔ پیغمبر کے علاوہ کوئی اور ایسی ہستی نہیں جس کے بارے میں معصومیت کا دعوےٰ کیا جا سکے لیکن جہاں تک اسلامی فلسفۂ اخلاق کا تعلق ہے یہ دعویٰ ضرور پیش کیا جا سکتا ہے کہ اس میں کوئی ایسی شق نہیں جس پر عمل ممکن نہ ہو۔ البتہ کسی کے اعمال کتنے ہی بلند کیوں نہ ہوں اس کے اور پیغمبرؐ کے درمیان اتنا فاصلہ ہوتا ہے کہ انسان کے گمان میں بھی نہیں آ سکتا۔

۲۔ **جامعیّت:** اسلامی فلسفۂ اخلاق کی جامعیت کے دو پہلو ہیں یعنی

(ل) اسلامی فلسفۂ اخلاق پر ہر طبقہ کے انسان عمل کر سکتے ہیں۔ یہ ایک

ہمہ گیر دستورِ عمل مہیا کرتا ہے۔ فرد اور معاشرہ۔ امیر و غریب، بلند و پست مالک و مملوک، عرب و عجم سب اس پر کامیابی سے عمل کر سکتے ہیں۔ اس کا سنگِ بنیاد نیت ہے۔ اللہ تعالیٰ جس چیز کو ملحوظ رکھتا ہے وہ انسان کی نیت اور کوشش ہے۔ ایک کروڑپتی شخص نمائش کی خاطر لاکھوں روپے قوم کے لیئے خرچ کرتا ہے۔ ایک غریب آدمی صدقِ نیت سے رُوکھا ٹکڑا گداگر کو دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس غریب آدمی کا درجہ کروڑپتی امیر سے بلند ہوگا۔ ایک صحیح اور قوی انسان جہاد میں حصّہ لیتا ہے۔ ایک معذور شخص اس موقع پر تڑپ تڑپ کر رہ جاتا ہے کہ کاش میں بھی جہاد میں شریک ہوتا۔ اللہ تعالیٰ اس کا نام بھی مجاہدین میں لکھ لیتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

اِنَّمَا الاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ

(اعمال کا مدار نیت پر ہے)

نیّت چونکہ ہمہ گیر چیز ہے۔ اس لیئے اسلامی دستورِ اخلاق بھی ہمہ گیر ہے۔

(ب) اسلامی فلسفۂ اخلاق انسان کے سب احوال کو پیشِ نگاہ رکھتا ہے۔ آج دُکھ ہے، کل سُکھ۔ آج ایک آدمی دوست ہے، کل دشمن، آج دشمن غالب ہے کل مغلوب، غرض زندگی کے احوال بدلتے رہتے ہیں۔ اسلام بتاتا ہے کہ سُکھ میں کیا چلن ہونا چاہیے اور دُکھ میں کیا روش ہو، دشمن غالب آجائے تو کیا رستہ اختیار کرنا چاہیے اور مغلوب ہو تو اس سے کیا سلوک

کیا جائے۔

اسلامی فلسفۂ اخلاق ہمیشہ ایک ہی طرزِ عمل کی تلقین نہیں کرتا کبھی نرمی کبھی سختی، گاہے غصہ گاہے عفو کی حاجت ہوتی ہے۔ اسلام ان سب بدلتے ہوئے احوال و ظروف کے لئے جامع ہدایات دیتا ہے۔

۳۔ تفصیل : اسلامی فلسفۂ حیات نہایت پُر دامن ہے۔ یہ زندگی کے کسی جزئیہ کو نظر انداز نہیں کرتا۔ اسلامی نظامِ اخلاق میں اوّل تو ہر جزئیہ کے بارے میں الگ حکم مل جاتا ہے ورنہ ایسا کُلیہ مہیا ہو جاتا ہے جس کے تحت اس جزئیہ کے خوب و ناخوب ہونے کے بارے میں بآسانی فیصلہ ہو سکتا ہے۔

۴۔ دوام : اسلامی فلسفۂ حیات میں دائمی رُوح ہے۔ یہ صرف ایک آدھ عہد کے احوال پر نظر نہیں کرتا بلکہ قیامت تک کے ادوار کو پیشِ نگاہ رکھتا ہے۔ انسانی فطرت چونکہ غیر متبدل ہے اس لئے اس کے نفسیاتی اصول بھی غیر متغیر ہیں۔ اسلام نے نفسیاتی اصول کو سامنے رکھ کر دستورِ اخلاق وضع کیا ہے جو قیامت تک ہر عہد اور ہر انقلاب کے لئے رہنمائی کا کام کرے گا۔

اسلامی دستورِ اخلاق کے بنیادی اصول میں کوئی لچک نہیں۔ ہر دَور کے انسان کو ان کی پابندی لازم ہے۔ البتہ فروع میں اسلامی اصول کی روشنی میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ تبدیلی ایسی نہ ہو کہ اسلام کی رُوح سے غیر موافق ہو جائے۔

اہمیت | اخلاق کو اسلام میں کس قدر اہمیت حاصل ہے

اس کا اندازہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد سے کیجیے:

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ

(میں اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ عمدہ اخلاق کی تکمیل کروں)

اخلاق گویا اسلام کا دوسرا نام ہے۔

حسنِ اخلاق کے بارے میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نہایت تاکیدی احادیث منقول ہیں۔ مثلاً

۱- اَكْمَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ اِيْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا (ترمذی)

(مومنین میں کامل ترین ایمان والا وہ ہے جس کا اخلاق خوب ترین ہے)

۲ اِنَّ مِنْ خِيَارِكُمْ اَحْسَنَكُمْ اَخْلَاقًا (متفق علیہ)

(تم میں جو عمدہ ترین اخلاق والے ہیں وہ تمہارے بہترین آدمیوں میں سے ہیں)

۱۰۰۴۵

۳- نیکی حسنِ خلق کا نام ہے۔ (مسلم)

۴- مومن اپنے حسنِ خلق سے ہمیشہ کے روزہ دار اور نماز گزار کا درجہ پا لیتا ہے۔ (ابوداؤد)

۵- قیامت کے روز مومن بندے کے ترازو میں حسنِ خلق سے زیادہ بھاری کوئی چیز نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کو فحش زبان آدمی سے بغض ہوتا ہے۔ (ترمذی)

۶- میں جنت کی بلندی میں اس شخص کے لئے ایک گھر کا ذمہ لیتا ہوں جو اپنے خلق کو خوش نما بنائے (ابوداؤد)

۷۔ قیامت کے روز تم میں سے میرا محبوب ترین شخص اور میرا قریب ترین جلیس وہ ہوگا جو تم سب سے عمدہ اخلاق والا ہوگا۔ (ترمذی)

۸۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک بار پوچھا گیا کہ کیا چیز سب سے زیادہ جنت میں داخل ہوگی۔ آپ نے فرمایا تقویٰ اور حسنِ خلق (ترمذی)[1]

جناب ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی اُسوۂ حَسَنہ ہے۔ آپؐ حسنِ اخلاق کی معراج پر تھے۔ سُورۃُ القلم میں اللہ تعالیٰ کا آپؐ سے ارشاد ہے:

وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ؁

(آپؐ خُلقِ عظیم پر ہیں)

اس آیت کی تفسیر میں حضرتِ شبیر احمد عثمانی رحمہ لکھتے ہیں:

"آپ کی زبان قرآن ہے اور آپ کے اعمال و اخلاق قرآن کی خاموش تفسیر۔ قرآن جس نیکی، جس خوبی اور بھلائی کی طرف دعوت دیتا ہے وہ آپؐ میں فطرۃً موجود، اور جس بدی و زشتی سے روکتا ہے آپؐ طبعاً اس سے نفور و بیزار ہیں۔ پیدائشی طور پر آپ کی ساخت اور تربیت ایسی واقع ہوئی ہے کہ آپؐ کی کوئی حرکت اور کوئی چیز حدِ تناسب و اعتدال سے ایک انچ اِدھر اُدھر ہٹنے نہیں پاتی" (تفسیر عثمانی)

ایک دفعہ حضرتِ عائشہ رضؓ سے پوچھا گیا کہ جناب رسالت مآب

---

[1] احادیث ریاض الصالحین باب حسن الخلق سے لی گئی ہیں۔

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خلق کیسا تھا۔ آپ نے سائل سے پوچھا، کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟ انھوں نے جواب دیا، پڑھتا ہوں۔ حضرت عائشہ رضؓ نے فرمایا: كَانَ خُلُقُهُ قُرآنَ
اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خُلق قرآن تھا۔

نیکی جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے حسن خُلق اور بِرّ کو ایک چیز قرار دیا ہے[1]۔ بِرّ کو اُردو میں نیکی کہتے ہیں۔

اسلام کی نگاہ میں یہ نیکی ہی ہے جو ایک مومن اور غیر مومن یا منافق میں امتیاز قائم کرتی ہے اور بالفاظ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہی چیز ہے جو جنت کی راہ دکھاتی ہے[2]۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تین چیزیں قبر تک ہمراہ جاتی ہیں۔ دو واپس آجاتی ہیں اور ایک ساتھ ہی رہتی ہے۔ اہل اور مال لوٹ آتے ہیں اور عمل ساتھ جاتے ہیں[3]۔

نیکی چھوٹی ہو یا بڑی اس کے اکتساب کے لئے ہر وقت آمادہ رہنا چاہیئے۔ نہ معلوم اس دُنیا سے کس وقت کوچ کرنا پڑے۔ ہادیِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ نیکی کی کسی بات کو حقیر نہ جانو، چاہے یہ کشادہ پیشانی سے ملنا ہی کیوں نہ ہو[4]۔ آپؐ نے ایک دفعہ بتایا کہ ایک شخص نے رستہ سے شاخ ہٹادی تو اللہ تعالیٰ نے اس کو بخش دیا[5]۔ آپؐ کا قول ہے کہ آگ سے جان بچاؤ چاہے

---

[1] ترمذی باب الرضاع۔ [2] صحیح مسلم
[3] ترمذی ابواب الزہد، [4] مسلم [5] مسلم

کھجور کے ایک ٹکڑے کی مدد ہی سے ہو[1]۔ فرمان نبوی ہے کہ اگر خود نیکی نہ کر سکو تو کسی اور ہی کو سفارش کر دو۔ یہ بھی نیکی ہے[2]۔

انسان کو چاہیے کہ ہر لمحہ نیکی کا ذخیرہ بڑھانے میں کوشاں رہے۔ حدیث ہے کہ بہترین انسان وہ ہے جس کی عمر طویل ہوئی اور اس کا عمل نیک ہوا[3]۔

برائی سے حتی الوسع بچنا چاہیے اور اگر کوئی گناہ ہو جائے تو اس کا مداوا یہ ہے کہ آدمی سچے دل سے توبہ کرے اور نیک کام کرے۔

..... قرآن حکیم کا ارشاد ہے:

اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ

(نیکیاں یقیناً برائیوں کو مٹا دیتی ہیں) (سورۂ ہود آیت ۱۱۴)

ہادیِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بھی یہی فرمان ہے کہ برائی ہو جائے تو نیکی کرو، یہ برائی کو مٹا ڈالے گی[4]۔ صدقہ برائی کو ایسے مٹاتا ہے جیسے آگ، پانی کو[5]۔ متعدد احادیث سے ثابت ہے کہ جو عبادات خلوص نیت سے ادا کی جائیں وہ سابقہ برائیوں کو دھو ڈالتی ہیں۔

نیکی اللہ تعالےٰ کو کیسی محبوب ہے، اس کا اندازہ اس حدیث سے ہوگا کہ آدمی جب نیکی کا ارادہ کرتا ہے اور (کسی مجبوری کی وجہ سے) اسے انجام نہیں دے سکتا تو اللہ میاں کے ہاں فقط اس نیک ارادے کے عوض

---

[1] متفق علیہ [2] مسلم - ترمذی ابواب الزہد، بخاری کتاب الادب۔
[3] ترمذی ابواب الزہد [4] ترمذی
[5] اربعین نودی بحوالہ ترمذی۔

ہی ایک نیکی لکھ لی جاتی ہے اور اگر نیکی عملی طور پر انجام دے لے تو اس کا دس گنا سے سینکڑوں گنا تک اجر لکھا جاتا ہے حالانکہ ایک گناہ کے بدلے ایک ہی گناہ کی سزا ملتی ہے[1] آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس نے جہاد کی نیت کی اس نے جہاد کا ثواب پایا[2]
آپؐ نے فرمایا ہے کہ جو آدمی نماز کی نیت سے چلے اس کے ہر قدم کے عوض ایک درجہ بڑھتا ہے اور جب تک مسجد میں نماز کا انتظار کرے نمازی محسوب ہوتا ہے[3]

نیکی ضروری نہیں کہ فقط مسلمان کے ساتھ ہو بلکہ ہر انسان اور ہر شے کے ساتھ لازمی ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شے کے ساتھ بھلائی کا حکم دیا ہے۔ جب تم جانور ذبح کرو تو اچھے طریقے سے یعنی تیز چھری کے ساتھ تاکہ ذبیحہ کو دکھ نہ ہو[4] ایک دفعہ سفر کے دوران ایک انصاری عورت نے اونٹنی کو ہنکاتے میں لعنت کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ اب اسے کھلا چھوڑ دو[5]۔ اسلام سے قبل اہل عرب جانوروں پر بہت ظلم کرتے تھے۔ زندہ اونٹ کا کوہان کاٹ لیتے۔ بھیڑ کی چکتی قطع کر لیتے اور زندہ پرندوں کو باندھ کر تیروں کا نشانہ بناتے آپؐ نے ان مظالم کا قلع قمع کیا۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غیر مسلموں کی بھلائی کا بھی بہت خیال رہتا تھا۔ یہ قرآن حکیم کی ان آیات سے واضح ہوتا ہے جن میں آپؐ کو بتایا

---

[1] اربعین نووی بحوالہ بخاری و مسلم۔ [2] ترمذی ابواب السیر [3] اربعین نووی بحوالہ مسلم ترمذی ابواب الدیات۔ [4] مسلم [5] مثلاً سورہ مائدہ آیت ام۔

گیا ہے کہ آپؐ کافروں کے کفر کا غم نہ کریں۔ آپ کا کام فقط تبلیغ ہے۔[1] آپؐ کا لقب رحمۃً للعالمین ہے یعنی سب عالموں کے لئے رحمت (صرف مسلمانوں کے لئے نہیں)۔ ایک دن آپ بیٹھے تھے کہ سامنے سے ایک جنازہ نکلا۔ آپؐ کھڑے ہو گئے۔ صحابہؓ نے کہا کہ جنابؐ یہ تو ایک یہودیہ کا جنازہ ہے۔ فرمایا، موت ایک دکھ ہے۔ جب دیکھو تو کھڑے ہو جاؤ۔[2] بڑے بڑے جانی دشمن آپؐ کے قبضہ میں آئے لیکن آپؐ نے معاف کر دیا۔

نیکی کا تقاضا ہے کہ دیگروں کو بھی نیک بنانے کی کوشش کی جائے۔

سورۃ العصر میں ارشاد ہے:

زمانہ پر غور کرو۔ انسان یقیناً گھاٹے میں ہے، سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے اور ایک دوسرے کو حق اور ثابت قدمی کی تلقین کی۔

یہ سورۃ اسلام کے اس بنیادی اور زرّیں اُصول کو دل پر نقش کرتی ہے کہ محض اپنی ذاتی شرافت میں محدود رہ جانا کوئی نیکی نہیں بلکہ ہر مسلمان کا یہ لازمی فریضہ ہے کہ حتی الامکان دنیا میں بھی نیکی کا چراغ روشن کرے، جس سے خویش و بیگانہ اور دوست و دشمن سب فیض یاب ہوں۔ ہادیِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ نیکی کی طرف رہنمائی کرنا بھی نیکی کرنے کے مانند ہے۔

---

[1] مثلاً سورۂ مائدہ آیت ۶۸

[2] مسلم باب القیام للجنازۃ

۴۔ آداب

آداب زندگی کے حسن و قبح کی حدود متعین کرتے ہیں۔ ان کے کئی فوائد ہیں۔ مثلاً

۱۔ آداب انسان کو یہ تربیت دیتے ہیں کہ اپنے مرتبہ اور دوسرے کے مرتبہ کو بخوبی پہچانے اور کسی معاملہ میں حد سے تجاوز نہ کرے۔

۲۔ آداب کا اخلاق سے نہایت گہرا تعلق ہے۔ آداب، اخلاق کے محافظ اور نگراں ہوتے ہیں۔ وہ آداب کے لئے فصیل اور حصار کا کام دیتے ہیں۔

۳۔ آداب زندگی کی ایک خوش نما اور خوش ترتیب ہیئت قائم کرتے ہیں۔ اسے عرفِ عام میں وضع یا سلیقہ کہا جاتا ہے۔

آداب کے بغیر قوم سلیقہ سے عاری ہو جاتی ہے۔ اس سے امتیازی خصائص رخصت ہو جاتے ہیں۔ ہمواری اور ہم آہنگی نہیں رہتی۔ یک جہتی اور اتحادِ خیال کا جذبہ مٹ جاتا ہے۔ انتشار راہ پا لیتا ہے اور قوم بجائے ایک انسانی گروہ کے جنگل کے بھانت بھانت کے جانوروں کا ریوڑ نظر آتی ہے۔ آداب قوم کی ظاہری ہیئت کو قائم کرتے ہیں اور ظاہری ہیئت جماعت میں اتحاد اور یک جہتی قائم کرتی ہے۔ اس کا اندازہ آں حضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی اس حدیث سے ہوتا ہے۔

▪ صفیں سیدھی رکھو ورنہ تمہارے دلوں میں اختلاف پیدا ہو جائے گا"[1]
آداب کے لحاظ سے ملتِ اسلامیہ ایک منفرد اور ممتاز شان رکھتی ہے۔
اگر وہ اپنے آداب و اطوار سے غافل ہو جائے تو اس شان سے محروم
ہو جائے گی۔ جو قوم اپنی شان اور وقار کو خوشی سے کھو دے اس سے
قومیت ہی فنا ہو جاتی ہے۔ اس نقطہ کے پیشِ نظر آں حضرت صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم نے کفار سے تشبہ کرنے کی ممانعت فرمائی ہے۔

---

[1] صحیحین۔

تہذیب

کلچر کا مفہوم

تہذیب کے سلسلہ میں آج کل ایک لفظ کا بہت زور شور سنا جاتا ہے۔ یہ کلچر ہے۔ آئیے اس لفظ کے مضمرات کا بھی ایک جائزہ لیتے چلیں۔

کلچر انگریزی لفظ ہے۔ اس کے لغوی معنی مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ زراعت۔

۲۔ کسی چیز کو تعلیم و تربیت یا نظم وضبط وغیرہ کے ذریعے احسن یا عمدہ تر بنانا۔

۳۔ اخلاقی یا ذہنی قوتوں کی ترتیب یا نظم وضبط۔

۴۔ تہذیب۔

۵۔ تہذیب کا ذہنی پہلو۔

۶۔ آداب، اطوار یا مذاق کو سنوارنا۔

۷۔ تہذیب کی تاریخ میں ایک خاص حالت یا مرحلہ۔

۸۔ کسی قوم یا معاشرتی تنظیم کے امتیازی پہلو۔

مندرجہ بالا معانی کی رو سے کلچر زندگی کی صفائی اور نفاست کا نام ہے۔ قومی سطح پر صفائی اور نفاست کے علاوہ اس میں قوم کے نمایاں خدوخال بھی شامل ہوتے ہیں۔

یہ معنی لغت کی رو سے ہیں۔ لیکن جب سے اس لفظ کا دائرۂ استعمال

پھیلا ہے۔ اس کے معانی میں بہت وسعت آگئی ہے۔

ابتداء میں کلچر محدود معنی میں مستعمل تھا اس کے بجائے سولائزیشن کے لفظ کا رواج زیادہ تھا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں سولائزیشن پر تو مقالہ موجود ہے لیکن کلچر کا ذکر نہیں۔ یہ اس لئے کہ کلچر پہلے سولائزیشن کا محض ایک پہلو سمجھا جاتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ سولائزیشن کا ہم معنی ہوگیا۔ اب اس سے بھی وسیع تر ہے۔ بلکہ اس سے اس کا اصل مقام چھین کر اسے اپنے ایک جزو کی حیثیت دے رہا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز کا مقالہ نگار لکھتا ہے:۔

"کلچر متوارث دستکاریوں، مصنوعات، فنی عمل، خیالات، عادات اور اقدار پر مشتمل ہے۔ معاشرتی تنظیم کا حقیقی فہم اسے کلچر کا ایک جزو قرار دے کر ہی ہو سکتا ہے...... کلچر کے مادی سامان بذاتِ خود کوئی مکمل قوت نہیں۔ صنعتوں، آلات، اسلحہ اور دیگر مصنوعات کی تخلیق اور استعمال کی خاطر علم کی ضرورت ہے جو بنیادی طور پر ذہنی اور اخلاقی انضباط سے وابستہ ہے جن کا اصل سرچشمہ مذہب، قوانین اور اخلاقی قواعد ہیں۔"

یہی مقالہ نگار اپنے مضمون میں بتاتا ہے کہ زندگی کے سامان بنانے اور برتنے کے لئے معاشرہ میں تعاون کی ضرورت ہے۔ اس تعاون کے بدولت عملی نظامات وجود میں آتے ہیں جنھیں ادارے کہا جاتا ہے۔ لہذا ادارے ہی کلچر کے حقیقی اجزاء ہیں۔ ان میں بہت استقلال اور ہمہ گیری پائی جاتی ہے۔ ان اداروں میں گھر کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ کیونکہ اسی سے نسلِ انسانی کو دوام حاصل ہوتا ہے۔ کلچر سے

رسوم و عادات اور پابندیوں کا بھی بہت تعلق ہے۔ کیونکہ ان کی وجہ سے کلچر کی ہیئت متشکل ہوتی ہے۔

انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز کے مقالہ نگار نے کلچر کے مفہوم میں بہت اضافہ کیا ہے۔ اقتصادی تنظیم، قانون، علم، کھیل، مشاغل، آرائش وغیرہ ہی پر ختم نہیں کرتا بلکہ مذہب کو بھی کلچر میں شامل کرتا ہے۔ حالانکہ اب تک مغرب میں مذہب کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں سمجھا جاتا تھا۔ مقالہ نگار کو جو چیز فرد یا معاشرہ کی تنظیم اور اصلاح و ترقی کے لئے مفید نظر آتی ہے اُسے کلچر میں شامل سمجھتا ہے۔ حتیٰ کہ جادو اور شعبدہ بازی کی تعریف میں کئی صفحے سیاہ کر دیتا ہے۔

یورپ والوں کے ہاں کلچر کا تصوّر پہلے محدود تھا۔ اب وہ اس میں مذہب اور قانون تک کو شامل کر رہے ہیں۔

الفاظ بارہا معانی بدلتے ہیں یا ان کے معانی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ یہی حال کلچر کا بھی ہے۔ ایک تو یہ محدود لغوی معنی رکھتا ہے جو صدر مضمون میں درج ہو چکے ہیں اور ایک اسے اب جدید اور ہمہ گیر معنی ملے ہیں جو ساری زندگی کو محیط ہیں۔

کلچر کے لئے عربی اور اُردو میں کوئی لفظ نہ تھا۔ عربی والوں نے ثقافت کے لفظ کو کلچر کے محدود معنی دیئے۔ وہاں سے ثقافت کا لفظ اُردو میں بھی درآمد ہوا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے پاس کلچر کا ہم معنی لفظ کیوں نہ تھا؟ کیا ہم کلچر سے محروم تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کلچر کے محدود لغوی معنی کے لحاظ سے تو ہمارے ہاں تہذیب کا لفظ موجود تھا لیکن جب یورپ

کی اقوام کے ہاں اس میں ایسی چیزیں بھی شامل تھیں۔ جن کی اسلام میں اجازت نہیں تو لامحالہ ہمارے پاس اس کا ہم معنی لفظ موجود نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اب جب کہ کلچر میں اتنی وسعت مل گئی ہے۔ تو ہم نے بھی اسے اسلامی نقطۂ نگاہ سے نئے اور وسیع تر معنی پہنا دیئے ہیں۔

کلچر کی تعریف میں ہم دیکھ آئے ہیں کہ ہر قوم کا ایک الگ امتیازی کلچر ہوتا ہے۔ ملتِ اسلامیہ کا بھی ایک جداگانہ امتیازی کلچر ہے۔ ہمارے ہاں اس کے معنی کچھ مختلف ہیں اور فرد سے لے کر جماعت، ریاست اور اُمت تک کو حاوی ہیں۔ اس چیز کے لئے ہمارے پاس ایک جامع لفظ نظامِ حیات موجود ہے۔ اس کو ہم دین بھی کہتے ہیں۔ کیوں کہ دین زندگی کے رستہ کا نام ہے۔

یہ خوشی کی بات ہے کہ یورپ کے لوگ آج مذہب کو کلچر کا سرچشمہ قرار دے رہے ہیں۔ ہم نے چودہ سو برس پہلے دین کو زندگی کا سرچشمہ قرار دیا تھا۔ بہرحال ہمارے ہاں اب بھی دین کا جو تصوّر ہے وہ کسی اور ملت میں نہیں۔

دیگر زبانوں کے الفاظ قبول کرنے میں کوئی خرابی نہیں۔ ہم کلچر کا لفظ اپنی زبان میں داخل کر کے گھاٹے میں نہیں رہیں گے۔ اس لفظ کو علمائے اسلام کی توجہ کی ضرورت تھی۔ اس کی رُوح تڑپ تڑپ کر تقاضا کر رہی تھی کہ اسے آلائشوں سے پاک کر کے اسلام سے مُشرف کیا جائے۔

حکومت پاکستان کی وزارتِ تعلیم کی طرف سے گیارھویں اور بارھویں جماعت کے لئے اسلامیات کا جو سلیبس بنا ہے اس میں کلچر کا لفظ جتنے پاکیزہ اور وسیع مفہوم میں استعمال ہوا ہے وہ مفہوم کلچر کے لفظ کو اسلامی

دنیا ہی میں مل سکتا تھا۔

اس تالیف میں ثقافت کا لفظ کئی جگہ آئے گا۔ یہ کلچر کے محدود معنی میں مستعمل ہے۔ ہم اس کے لئے تہذیب کا لفظ بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

تہذیب کا مفہوم

تہذیب کے لغوی معنی ہیں:

چھانٹنا

سنوارنا

خالص کرنا

تہذیب کے لفظ نے آہستہ آہستہ معنی کے کنارے پھیلائے ہیں اور وسیع تر مفہوم پیدا کر لیا ہے۔ اب یہ لفظ زندگی کے اطوار، رہن سہن، معاشرت اور سامان تمدن کو حاوی ہے۔

ہر قوم یا ملت کی زندگی کا ایک ظاہری نقشہ، ہیئت یا خط و خال ہوتے ہیں جو اسے دیگر اقوام سے ممتاز کرتے ہیں۔ اس ظاہری نقشہ یا خط و خال کو ہم تہذیب کا نام دیتے ہیں۔

بنیادی لحاظ سے تہذیب کا لفظ کلچر کے زیادہ قریب ہے لیکن اب اسے سولائزیشن سے قرب حاصل ہے۔ تاہم اب جس طرح کلچر کو سولائزیشن کا جزو اور سولائزیشن کو کلچر کا جزو بتایا جاتا ہے اسی طرح تہذیب کے معنی میں بھی لچک پیدا ہو سکتی ہے۔ تہذیب کو کلچر کی طرح ساری زندگی پر پھیلایا جا سکتا ہے۔ کلچر کے لفظ میں تہذیب کی سی وسعت نہیں۔

اچھی اور بری تہذیبیں

تہذیب کا لفظ اپنے لغوی معنی کے اعتبار سے تو صرف اچھی تہذیب

کے لئے استعمال ہونا چاہیے لیکن اس کا وسیع تر مفہوم چونکہ ساری زندگی پر چھا چکا ہے اس لئے اس کی اچھی اور بری دو قسمیں ہو سکتی ہیں۔

اچھی اور بری تہذیبوں میں نمایاں فرق ہے۔ ذیل میں ہم اچھی تہذیب کے چند اوصاف درج کرتے ہیں۔ ان سے بری تہذیب کا اندازہ خود بخود ہو جائے گا۔

اچھی تہذیب

اللہ تعالیٰ سے غافل نہیں کرتی
مادیت کا اسیر نہیں ہونے دیتی
پاکیزہ رکھتی ہے
صحت کی ضمانت دیتی ہے
فضول خرچی سے بچاتی ہے
رحم دلی سکھاتی ہے
غیور بناتی ہے۔
عزت بخشتی ہے

دین اور تہذیب

تہذیب کا سرچشمہ مذہب ہے۔

ہر مذہب ایک خاص مقصدِ حیات اور انداز فکر پیش کرتا ہے جو اس کے پیروؤں کی زندگی کو ایک مختص سانچے میں ڈھال دیتا ہے اور اسے ایک خصوصی ماہیت عطا کرتا ہے۔ یہ ماہیت سادہ ہو یا پر تصنع بہر حال اس کے کچھ نقش و نگار ہوتے ہیں جنھیں ہم تہذیب کہتے ہیں۔

ہندو مت میں کئی دیوتاؤں کو معبود مانا جاتا ہے جن میں اکثر کے بارے

میں یہ خیال ہے کہ وہ شہزادگی کی زندگی گزار رہے ہیں اور انھیں سامان طرب سے بہت شوق ہے۔ چونکہ ہر ہندو کا مقصدِ حیات اپنے دیوتاؤں کو خوش کرنا ہے اس لیے ان کے ہاں رقص و موسیقی کو نہ صرف رواج ہوا بلکہ اسے تقدس بھی حاصل ہوگیا۔ اسی طرح ان کی تہذیب کے دیگر پہلوؤں پہ بھی مذہب کا گہرا نقش ہے۔

عیسائیوں نے دین کو دُنیا سے الگ رکھا ہوا ہے۔ وہ دنیوی زندگی میں مذہب سے بالکل آزاد ہیں اس لیے دنیوی مسّرت ان کی زندگی کا مقصد ثانی بن گئی ہے۔ ان کے ہاں زندگی کا یہی کمال ہے کہ دنیوی سامانوں سے جی بھر کر نفع اٹھایا جائے۔ جس چیز سے انھیں لذت یا خوشی حاصل ہو اُسے بے کھٹکے تہذیب کا جزو بنا لیتے ہیں۔ رہ گئی آخرت تو اس کی انھیں زیادہ فکر نہیں کیونکہ ان کے خیال میں حضرت عیسیٰؑ صلیب پر چڑھ کر ان کے سب گناہوں کا کفّارہ ادا کر چکے ہیں۔

یورپ میں سارا زور تکلّف اور نمائش و آرائش پر ہے۔ روحانیت کو مادیت کے بوجھ کے نیچے پامال کر دیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ تہذیب بہت دلفریب ہے لیکن رُوح کو گرفتار کر کے اسے پرواز سے محروم کر دیتی ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں ؎

گرچہ ہے دل کشا بہت حسنِ فرنگ کی بہار
مُرغک بلند بام دانہ و دام سے گزر

جس تہذیب میں مادیت کو نصب العین بنا لیا جائے وہ بالآخر تباہی کے گڑھے میں گرتی ہے۔ مادیت کی محافظت اگر رُوح کے سپرد نہ کی جائے تو یہ خود اپنے کو تباہ کر دیتی ہے۔ یورپی تہذیب کا بھی یہی

حقیقی اور مصنوعی راحت کا فرق ایک مثال سے سمجھئے۔ فرض کیجئے کہ دو آدمی ایک ہی دفتر میں کام کرتے ہیں۔ دونوں کام کاج سے چور گھر واپس آتے ہیں۔ دونوں کو راحت کی تلاش ہے لیکن ایک مصنوعی راحت کا خواہاں ہے اور دوسرا حقیقی راحت کا۔ جسے حقیقت راحت کی طلب ہے وہ مسجد میں جائے گا۔ وضوء کر کے نماز پڑھے گا اور ایک عجیب تسکین محسوس کریگا۔ دوسرا کسی تماشا گاہ میں جا بیٹھے گا۔ وہاں سے واپس آئے گا تو پہلے سے بھی زیادہ تھکا ماندہ ہوگا۔ صبح اس کی آنکھ آسانی سے نہیں کھل سکے گی۔ دفتر جائے گا تو سستی اور کسلمندی بدستور طاری ہوگی لیکن اس کا جو رفیق اللہ تعالیٰ کی عبادت میں راحت تلاش کرتا رہا ہے اس میں تکان اور خستگی کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ وہ بدنی اور ذہنی ہر دو لحاظ سے چاق و چوبند ہوگا۔

یہ تمثیل نری تمثیل نہیں بلکہ اسلام کے زریں دور کی صدیوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ جب تک اہل اسلام نے اللہ کے ذکر اور عبادت میں راحت کی تلاش کی وہ قلبی، ذہنی اور بدنی ہر لحاظ سے توانا رہے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں ہے جب حضرت بلال رضؓ کو اذان کے لئے کہنا ہوتا تو آپ فرماتے کہ اے بلال! ہمیں نماز کی راحت دلواؤ۔

موجودہ دور میں قلبی کمزوری کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ لوگوں کو حقیقی سکون حاصل نہیں۔ وہ راحت حاصل کرنے کے لئے مادی سامانوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں لیکن ان سامانوں میں راحت کہاں! البتہ راحت کا سراب ضرور ہے۔

غم کو کوئی آدمی نہیں مٹا سکتا اور نہ اس کو جڑ سے مٹانے کی مجنونانہ کوشش

کرنی چاہیے۔ غم نہ ہو تو آدمی بے پرواہ، غافل اور غیر ذمہ دار ہو جائے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں ؎

غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے
ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے

اور

جس طرح رفعتِ شبنم ہے مذاقِ رم سے
میری فطرت کی بلندی ہے نوائے غم سے

لیکن غم کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی اپنی زندگی کو سراپا ماتم بنا لے اور اس کے ہاتھوں مغلوب اور ناکارہ ہو کر رہ جائے۔

حقیقی راحت کی پہچان یہ ہے کہ اس کا قلبی اور بدنی صحت پر اچھا اثر پڑے۔ جن مشاغل سے خراب اثر پڑے اور تکان اور سستی پیدا ہو انھیں ہم راحت کے نہیں بلکہ کلفت اور زحمت کے مشاغل کہیں گے۔ زندگی کے جو سامان کاہلی اور تن آسانی پیدا کر دیتے ہیں اسلام ان سے پرہیز کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اسی لیے مردوں کے لیے ریشم کا استعمال ممنوع ہے۔ علامہ اقبال نے اس سامانِ تعیش کے بارے میں کیا خوب کہا ہے ؎

ترے صوفے ہیں افرنگی، ترے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

اسلامی تہذیب وہی ہو سکتی ہے جو زندگی کے نصب العین یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت اور آخرت کی تیاری میں مدد دے۔ وہ مشاغل جو عمل اور اُولوالعزمی کی طرف دعوت نہ دیں اور جن میں وقت ضائع ہو وہ اسلامی تہذیب کا جزو نہیں ہو سکتے۔ احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ بے کار مشاغل

میں حصہ لینا ضعفِ ایمان کی دلیل ہے۔

اسلامی تہذیب

ہر ملت کی تہذیب اس کے مذہب سے پھوٹتی ہے۔ بعد میں جغرافیائی عوامل وغیرہ اس پر کچھ حد تک اثر انداز ہوتے ہیں لیکن اس کی بنیادی اصل بہر حال دین ہی رہتا ہے۔ ہر وہ قوم جس کا مذہب سے کچھ تعلق ہو۔ زندگی کے اسلوب، آداب اور رسم و رواج میں اپنے مذہب سے ضرور متاثر ہوتی ہے۔ لباس، سوسائٹی کے آداب، گھریلو نظام، تعمیرات، نظامِ تعلیم اور نظامِ حکومت وغیرہ لامحالہ مذہب سے متاثر ہوتے ہیں۔ اسلام اس حقیقت سے آنکھ بند نہیں کرتا اور اپنے پیروؤں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ تہذیب و تمدن کو اسلامی سانچہ میں ڈھال کر رکھیں۔

جو مذہب تہذیب و تمدن کی نگرانی سے دست بردار ہو جائے وہ جز وقتی یا زائد المیعاد مذہب ہوتا ہے۔ اسلام حقیقی مذہب ہے وہ زندگی کے سب شعبوں کا نگران ہے۔ جو شخص اس نگرانی سے آزاد ہونا چاہے۔ اگر زبان سے دین کی اطاعت کا دم بھرتا بھی ہے تو سمجھ لو کہ منافق ہے۔

تہذیب کا سرچشمہ چونکہ دین ہے اس لئے دین کی طرح اس کا بھی خالص ہونا ضروری ہے۔ اگر اس میں کسی اور مذہب کی تہذیب کے اجزاء شامل کر دیئے جائیں تو یہ تہذیب خالص نہیں رہے گی۔ جن لوگوں کو اس غیر خالص تہذیب سے محبت پیدا ہو جائے گی دین سے ان کا تعلق کم پڑ جائے گا۔

اسلامی تہذیب سے غیر اسلامی تہذیب کا پیوند کبھی نہیں لگ سکتا۔ اس سے مذہبی حس کمزور ہوتی ہے۔ لہٰذا جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کفار سے مشابہت کرنا ممنوع قرار دیا ہے۔

عُرف - اسلام کسی ملک کے رسم و رواج کو یکسر تباہ نہیں کرنا چاہتا لیکن اس کے صرف اسی حصہ کو قبول کرتا ہے جو اس کے مزاج کے موافق ہو۔ جیسے رسوم و رواج جو مسلمانوں کے اختلافِ وطن کے لحاظ سے چاہے کچھ مختلف ہوں لیکن اگر وہ بنیادی لحاظ سے اسلام کے منافی نہ ہوں تو مباح ہوتے ہیں - انھیں عُرف کا نام دیا جاتا ہے۔

بدعت : علمائے اسلام نے بدعت پر سخت پابندیاں لگائی ہیں - بدعت اس رواج کو کہتے ہیں جو اصول دین کے منافی ہو۔ بدعت اگرچہ کفر نہیں لیکن کفر کی پڑوسن ضرور ہے۔ بدعتیں اعتقادی بھی ہوسکتی ہیں اور تہذیبی بھی، بہرحال دونوں میں دین کا نقصان ہے۔

اسلامی تہذیب کی رُوح

اسلامی تہذیب کی روح مندرجۂ ذیل عناصر سے مُرکب ہے :

۱- اللہ تعالیٰ کی یاد :

تہذیب کے ہر پہلو سے اللہ تعالیٰ کی یاد وابستہ رہنی چاہیے۔ اسلامی تہذیب میں بنیادی تہوار دو ہیں یعنی عِیدَین۔ ان کے منانے کا بھی عین اسلامی طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد اور عبادت کی جائے۔

نشست و برخاست، کھانے پینے اور لباس وغیرہ کے آداب کا یہ تقاضا ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ سے غافل نہ ہو جائے۔ کوئی بزم بھی جمی ہو اس میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کم از کم

ایک بار ضرور یاد کیا جائے۔ جھوٹ نہ بولا جائے۔ عبث گفتگو نہ کی جائے اور نہ بے تحاشا بلند بانگ قہقہے سر کیے جائیں۔

۲۔ سادگی

اسلام سامان تعیش پر فخر نہیں کرتا بلکہ سادگی پر فخر کرتا ہے۔ جس تہذیب میں بناوٹ، تکلف، فضول خرچی اور عیاشی کو دخل ہو اُسے ہم اسلامی تہذیب نہیں کہہ سکتے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے:

اَلْفَقْرُ فَخْرِی

(فقر کا مجھے فخر ہے)

اسلام ایسی چیزوں کو جزوِ تہذیب بنانے سے منع کرتا ہے جن میں وقت یا دولت کا زیان ہو۔ مثلاً دیواروں پہ آرائشی کپڑے لگانے سے آں حضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ محض نمائش کے لیے کتا بلکہ گھوڑا تک پالنا ممنوع ہے۔ بغیر ضرورت کے بلند مکانات بنانے کی اجازت نہیں۔ سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال حرام ہے۔

سادگی سے ہمدردی کی روح پیدا ہوتی ہے۔ جو لوگ عیش و عشرت کی سیج سے ہم کنار رہتے ہیں انھیں غریبوں کی زندگی اور دکھ سکھ کا کیونکر اندازہ ہو سکتا ہے اور ان میں عوام کی ہمدردی کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اس بات کا اندیشہ کیا کرتے تھے کہ اُمت مال دار ہو کر دنیا کی زیب و زینت اور رنگینی میں گم نہ ہو جائے اور نتیجتاً اس دولت کے ہاتھوں تباہ نہ ہو

جائے[1]

عیش وعشرت کا ایک دفعہ چسکا پڑ جائے تو یہ چسکا مشکل سے پیچھا چھوڑتا ہے اور تباہ کرکے رہتا ہے اس لئے ایسی تہذیب اور تمدن سے پناہ مانگنی چاہیے جو سادگی سے دُور لے جائے۔

عیاش تہذیب دولت کی محبت کے ساتھ ساتھ زندگی سے بھی محبت پیدا کرتی ہے۔ آخرت کی طلب نہیں رہتی۔ اور موت کا سامنا کرنے کو ہمت نہیں مانتی۔ جس قوم میں یہ خرابیاں پیدا ہو جائیں وہ بزدل ہو جاتی ہے اور میدانِ کارزار کے قابل نہیں رہتی۔

تہذیب وہی بہترین ہوتی ہے جو زیادہ اخراجات کی طالب نہ ہو۔ تہذیب جس قدر مہنگی پڑے اتنی ہی معیوب ہوتی ہے۔

موجودہ دَور میں ہمارے ہاں ایک نہایت اچھا رجحان چلا ہے کہ بعض رسموں پر دولت کی جو بربادی ہوتی ہے اسے بند کیا جائے۔ یہ عین اسلامی جذبہ ہے لیکن اس سے بڑھ کر ایک اور چیز کی طرف بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے اور وہ یہ ہے کہ یورپ سے جو تہذیب آرہی ہے وہ اس قدر مہنگی ہے کہ ایشیائی ممالک اس کے مالی مطالبات سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ اس تہذیب کے پیٹ میں جس قدر دولت ڈالتے جائیے کبھی سیر نہیں ہوتی۔ اس نے اقتصادی پریشانی کا ایک عجیب گورکھ دھندا چلا دیا ہے۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ اس کی جگہ اسلامی تہذیب کو مستحکم کیا جائے۔

---

[1] دیکھو مشکوٰۃ کتاب الرقاق۔

۴۔ صفائی:

اسلام میں صفائی کی بہت تاکید ہے اور اسے ایمان کا ایک شعبہ بتایا گیا ہے۔ اسلام میں پانچ وقت کی نماز فرض ہے جس کے لئے وضوء شرط ہے۔ پنج وقتہ وضوء بدن کو صاف رکھتا ہے۔ حتی الوسع مسواک کا حکم ہے۔ لہٰذا نمازیوں کے دانت صاف رہتے ہیں۔ انھیں بہت کم دانتوں کے ہسپتال جانے کی حاجت ہوتی ہے۔ نماز کے لئے لباس صاف ستھرا اور پاکیزہ ہونا چاہیے۔ لہسن، پیاز یا اور بدبودار چیز کھا کر مسجد میں جانے کی اجازت نہیں۔

اسلام اس بات سے منع کرتا ہے کہ مقدور ہوتے ہوئے بھی آدمی پھٹے حالوں رہے بلکہ زینت کا حکم دیتا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ

(الاعراف ۳۲)

(کہہ دیجئے کہ کس نے حرام قرار دیا ہے اس زینت کو جسے اللہ تعالےٰ نے پیدا کیا ہے)

زینت سے مراد ناواجب آرائش اور نمائش نہیں۔

ارشادِ خداوندی ہے:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝

(الاعراف۔ ۳۱)

(اے بنی آدم ہر نماز کے وقت خوش پوش ہو اور کھاؤ پیو اور فضول خرچ نہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ فضول خرچ کرنے والوں کو نہیں چاہتا۔)

۴۔ ہمہ گیری۔

اسلام صرف ایسی تہذیب کی اجازت دیتا ہے جس میں سب حصّہ لے سکیں اور جس سے گروہ بندی کا ظہور نہ ہو۔ اسلامی تہذیب امیر و غریب کے درمیان بیگانگی کی دیوار کھڑی نہیں کرتی۔ اسلام نے جس تہذیب کو پیش کیا ہے اس میں خلیفہ سے لے کر غلام تک سب ایک سطح پر رہتے تھے۔ حضرتِ معاویہ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ بہت شان و شوکت کے مالک تھے لیکن اس شان و شوکت میں بھی اُن کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ سائلوں کو کھانے کے وقت اپنے پاس بلاتے اور دسترخوان میں شریک کرکے اس سے گفتگو کرتے تھے۔

اسلامی تہذیب کی بقاء اور ارتقاء

تہذیب چونکہ زندگی کے ظاہری خط و خال کا نام ہے اسی لئے زمان و مکان کے عوامل اس پر ضرور ایک حد تک اثر انداز ہوتے ہیں لیکن یہ عوامل ان خط و خال کو کلیتہً اکھاڑ کر ان کی جگہ نئے نقش و نگار نہیں لا سکتے کیونکہ تہذیب کا سرچشمہ دین ہے جو غیر متبدل ہے۔ مثلاً اسلامی تہذیب کا تقاضا ہے کہ لباس ایسا پہنا جائے جو ع‍ریانی کی ہر جھلک کو بند

کر دے اور عبادات میں حارج نہ ہو۔ اس تقاضا میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی لیکن اس تقاضا کی مقرر کردہ حدود کے اندر لباس کی وضع و قطع پر کوئی پابندی نہیں۔ کوئی چاہے تو ٹوپی پہنے اور چاہے تو عمامہ باندھ لے، عورتیں چاہیں تو بڑی چادر اوڑھ لیں اور چاہیں تو برقع پہن لیں۔

ہر ملت کی تہذیب اسی صورت میں زندہ رہ سکتی ہے کہ ایک تو اس کا بنیادی مزاج فنا نہ ہونے پائے اور دوسرے اس مزاج کے موافق ضروری تبدیلی ناممکن نہ ہو یعنی **بقا** اور **ارتقاء** پہلو بہ پہلو موجود ہوں۔ اس کا انحصار مندرجۂ ذیل عوامل پر ہے:

(۱) ملّی غیرت

(۲) وطنی اثرات

ملّی غیرت: تہذیب ملّت کا چہرہ ہے۔ اسی سے ملت کی شناخت ہوتی ہے بلکہ یہی ملّی امتیاز کی علامت ہے۔ کوئی غیرت مند شخص اس چہرہ کو بگاڑنے کی اجازت نہیں دے گا۔

جس ملت کی کوئی امتیازی شان نہ ہو اس کا دنیا میں کوئی وقار نہیں ہوتا اور نہ خود اس کے اندر اتحاد قائم رہ سکتا ہے۔ تہذیب ان بنیادی امتیازات میں سے ہے جو قوم کے اندر اشتراک اور یک جہتی کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ یہ احساس قوم میں خود اعتمادی پیدا کرتا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ دنیا میں ہمیشہ طاقت ور اور فاتح اقوام کی تہذیب غالب رہی ہے۔ جن اقوام میں برتری اور وقار حاصل کرنے کی تڑپ ختم ہو جائے ان کو اپنی تہذیب کا بھی احساس نہیں رہتا یعنی قومیت اور

تہذیب لازم و ملزوم ہیں۔ ان دونوں کا ایک دوسرے پر انحصار ہے۔ جو قوم اپنی خوشی سے اپنی تہذیب کو ہلاک کر دے وہ اپنی ملی روح کو بھی قربان کرنے سے نہیں شرماتی۔

ملت کی شان حال ہی سے نہیں بلکہ اس کے ماضی سے بھی وابستہ ہوتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے کسی قوم کو شاندار ماضی دیا ہو تو اس سے بڑھ کر خوش قسمت قوم کون ہو سکتی ہے۔ امتِ مسلمہ وہ خوش قسمت امت ہے جس کا ماضی درخشاں روایات سے بھرپور ہے۔ ان روایات سے اگر ربط توڑ دیا جائے تو ہمارے لئے قومی استحکام کی اور کوئی بنیاد نہیں رہتی۔ گزشتہ دور آئندہ عہد کے لئے ترقی کا زینہ مہیا کرتا ہے۔ بقول اقبال ؎

یادِ عہدِ رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے
میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے

ماضی کے بیش قدر ورثہ کو محفوظ رکھنا از بس لازمی ہے البتہ اس ورثہ تک ہی محدود ہو کر نہیں رہنا چاہیے۔ اگر اس میں کوئی ادھر غیر اسلامی عنصر کہیں سے آ جائے تو اسے دور کر دینا چاہیے اور اس میں جدید تقاضاؤں کے موافق مزید اضافہ کرنا چاہیے۔ یہ شرف اسلام ہی کو حاصل ہے جس نے زندگی کا ایک ایسا نظام عطا کیا ہے جو ماضی سے بھی مضبوط تعلق قائم رکھتا ہے اور ارتقاء کا بھی حامی ہے۔

وطنی اثرات: ہر وطن کی اپنی چند خاص جغرافیائی خصوصیات ہوتی ہیں۔ زندگی کو ایک حد تک ان خصوصیات کے بموجب ڈھالنا پڑتا ہے۔ دینِ اسلام میں اتنی وسعت ہے کہ وہ کسی ملک کی جغرافیائی ضرورتوں کو

را انداز نہیں کرتا اس لئے ایک ملت ہونے کے باوجود مختلف ملکوں میں آباد
ہنے کی وجہ سے مسلمانوں کی تہذیب میں ادنیٰ سا فرق ضرور رونما ہوگا عرب
صحرا نشینوں، افریقہ کے حبشیوں، کراچی کے شہریوں اور لندن کے مسلمان
ریزوں کی تہذیب بعینہ ایک سی نہیں ہو سکتی تاہم ان سب کی تہذیبیں بین
سلامی رہ سکتی ہیں۔

وطنی تہذیب سے محبت کا یہ مطلب نہیں کہ غیر وطنی تہذیب سے نفرت
ی جائے۔ غیر وطنی تہذیب اور غیر اسلامی تہذیب میں فرق ملحوظ رکھنا چاہیے۔
وطنی تہذیب ضرور نہیں کہ غیر اسلامی تہذیب ہو۔

زندگی کے دوائر

انسان کی زندگی انفرادیت سے شروع ہو کر لہر در لہر پھیلتی چلی جاتی ہے
ایک دائرے سے دوسرا دائرہ پیدا ہوتا چلا جاتا ہے اور بالآخر عالم اسلام
کا دائرہ سب دائروں کو محیط ہو جاتا ہے۔ انسانی زندگی کے مندرجہ ذیل
اہم ترین دائرے ہیں:

۱۔ فرد
گھر
۳۔ مسجد مکتب
۴۔ معاشرہ
۵۔ عالم اسلام

انسان کی اولین حیثیت فردی ہے۔ فرد کی اہمیت اسی چیز سے بخوبی
ثابت ہو جاتی ہے کہ ایمان ایک انفرادی چیز ہے۔ فرد کا واسطہ سب سے
پہلے اپنے گھر سے پڑتا ہے یہاں وہ زندگی کا اولین درس لیتا ہے۔ پھر مسجد
مکتب سے آشنا ہوتا ہے۔ یہاں دینی دنیوی دونوں لحاظ سے عملی زندگی
کی تربیت حاصل کرتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے سامنے معاشرہ کی وسیع
دنیا کھلتی ہے۔ گھر میں جب تک تھا تو لطف و رحم کی ہی شیریں شمعیں
تھیں۔ یہاں خشمگیں نگاہوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے اور ملکی ریاست

پابندیاں قبول کرنی ہوتی ہیں۔ ان پابندیوں کے اندر اسے اتنی تربیت مل
اتی ہے کہ دنیائے اسلام کے فرد کی حیثیت میں عظیم تر فرائض بجا لانے کے
ے آمادہ ہو جاتا ہے۔

آئندہ اوراق میں انسانی زندگی کے ان دوائر کا ہم فرداً فرداً تفصیلی
طالعہ کریں گے۔

فرد

ذکر

مفہوم

ذکر کے لغوی معنی ہیں:
بھولی ہوئی چیز کو یاد کرنا۔ اسے بار بار یاد رکھنا۔
اصطلاح میں ذکر سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کو یاد رکھنا۔
ذکر کے مقابل غفلت کا لفظ ہے

ذکر کے مراتب

ذکر کا ابتدائی درجہ یہ ہے کہ آدمی ایک فریضہ کے طور سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرے۔ اس میں بھی بہت فضیلت ہے لیکن آدمی اس پر پختہ رہے تو آہستہ آہستہ ایک ایسا درجہ آجاتا ہے جس میں انسان کی زبان چاہے خاموش رہے لیکن اس کا دل ذکر الٰہی سے معمور رہتا ہے۔

امام غزالیؒ نے ذکر کے چار مرتبے بیان کئے ہیں:

(اوّل) صرف زبان سے ذکر کرنا۔

(دوم) دل کو جبراً اور تکلّف سے ذکر کا خوگر کرنا

(سوم) قلب میں ذکر الٰہی کا پختہ ہو جانا اور بغیر کسی تکلّف کے ذکر کا جاری رہنا۔

(چہارم) قلب کا ذکر میں اس حد تک ڈوب جانا کہ رسمی ذکر کی حاجت نہ رہے اور کوئی دیگر چیز اس پر کبھی اثر انداز نہ ہو سکے۔ اس حالت کو استغراق یا فنا کہتے ہیں۔ یہی آخری مقصود ہے اور پہلے تین درجے اس کے کام دیتے ہیں۔

اہمیت

۱- ذکرِ الٰہی سب سے بڑی عبادت ہے:

اللہ تعالیٰ نے ذکرِ الٰہی کو سب سے بڑی عبادت قرار دیا ہے۔ ارشاد ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ

(العنکبوت - ۵)

(نماز یقیناً برائی اور بے حیائی سے روکتی ہے اور اللہ کی یاد سب سے بڑی ہے)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز کی اصل روح اللہ تعالیٰ کی یاد ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں حضرت شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں:-

اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے۔ یہ وہ چیز ہے جسے نماز اور جہاد وغیرہ سب عبادات کی روح کہہ سکتے ہیں۔ یہ نہ ہو تو عبادت ایک جسدِ بے روح اور لفظِ بے معنی ہے۔ ذکر اللہ سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں۔ اصلی فضیلت اسی کو ہے۔ یوں عارضی اور وقتی طور پر کوئی عمل ذکر اللہ پر سبقت لے جائے تو وہ دوسری بات ہے لیکن غور کیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ اس عمل میں بھی فضیلت اسی ذکر اللہ کے بدولت آئی ہے۔

احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ذکرِ الٰہی راہِ خدا میں سر کٹوانے سے بھی افضل ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی چیز عذابِ الٰہی سے بچانے والی نہیں۔ ایک صحابی نے حضورؐ سے پوچھا کہ کون سا عمل افضل ترین ہے۔ آپؐ نے فرمایا، تو جب اس دنیا سے سفر کرے تو تیری زبان ذکرِ الٰہی سے تر ہو۔ (مشکوٰۃ)

۴- ذکر الٰہی ہر حال، ہر عمر اور ہر وقت کے لئے ہے۔

ذکر الٰہی جس قدر بڑی چیز ہے اسی قدر اس کے لئے آسانیاں بھی ہیں۔ مثلاً نماز ہی کو لو۔ اس کے لئے طہارت، وضو، جماعت، وقت مقررہ وغیرہ از بس لازم ہیں۔ لیکن ذکر الٰہی کے لئے ایسی پابندیوں اور شرطوں کی ضرورت نہیں۔ روح کے تار کو ذرا جنبش ہوئی اور سارا بدن نغمۂ توحید سے جھنجھنا اٹھا۔ بچہ ہو یا بوڑھا، مریض ہو یا تندرست، امیر ہو یا غریب ہر شخص کی روح اس نغمہ کو الاپ سکتی ہے۔

انسان کسی حالت اور کسی عمل میں مصروف ہو وہ اپنے دل میں اللہ کی یاد کو بیدار رکھ سکتا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا وَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا۔

(اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کو بہت یاد کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرو)

ایک اور آیت میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کھڑے، بیٹھے اور پہلو کے بل (ہر حال میں) یاد رکھو۔ یہاں تک کہ جنگ کے وقت موت کے بازار میں بھی اللہ تعالیٰ کو یاد رکھنے کا حکم ہے۔ سورۂ انفال میں حکم ہے کہ اے ایمان والو جب تمہاری مڈبھیڑ کسی فوج سے ہو جائے تو جم جاؤ اور اللہ تعالیٰ کو خوب یاد کرو۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنگ کے دوران فرمایا کرتے تھے: اے اللہ تو میرا دست و بازو ہے تو میرا مددگار ہے اور میں تیرے ہی سہارے لڑتا ہوں۔[۱]

---

[۱] ترمذی ابواب الدعوات۔

۳۔ ذکر صدقہ کا قائم مقام ہے:

ایک دفعہ نادار مہاجرین ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ اہل ثروت بلند درجات اور دائمی آسائش میں ہم سے بازی لے گئے۔ جیسے ہم نماز پڑھتے ہیں ویسے وہ بھی نماز پڑھتے ہیں، جیسے ہم روزے رکھتے ہیں وہ بھی رکھتے ہیں لیکن ان کے پاس ضرورت سے فالتو اموال ہیں جن سے وہ حج و عمرہ کرتے ہیں، جہاد کرتے ہیں اور صدقہ دیتے ہیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کیا تمھیں ایسی چیز نہ بتاؤں جس کے بدولت تم ان کے برابر ہو جاؤ، بعد میں آنے والوں سے سبقت لے جاؤ اور تم سے کوئی شخص افضل نہ رہے سوائے اس کے جو تمھاری طرح اس پر عمل کرے۔ صحابہؓ نے عرض کی، ہاں۔ آپؐ نے فرمایا ہر نماز کے بعد ۳۳ بار سُبْحَانَ اللّٰہِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اور اَللّٰہُ اَکْبَر کہا کرو۔ کچھ روز بعد یہ اصحاب پھر حاضر ہوئے اور عرض کی کہ دولتمندوں نے ہمارا ذکر سن پایا اور اب وہ بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ حضورؐ نے جواب دیا، یہ اللہ کا فضل ہے جسے عطا کر دے۔[1]

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ صبح ہوتی ہے تو انسان کے ہر جوڑ پر صدقہ واجب ہو جاتا ہے ہر بار سبحان اللہ کہنا صدقہ ہے۔ ہر بار الحمد للہ کہنا صدقہ ہے، ہر بار لا الٰہ الا اللہ کہنا صدقہ ہے، ہر بار اللہ اکبر کہنا صدقہ ہے۔[2]

۴۔ ذکر خدمتِ خلق کا قائم مقام ہے۔

---

[1] ریاض الصالحین بحوالہ صحیحین [2] ریاض الصالحین بحوالہ مسلم۔

اگر کوئی آدمی خدمتِ خلق کے لئے بے تابی رکھتا ہو لیکن کسی معذوری یا مجبوری کی بنا پر یہ فریضہ انجام نہ دے سکے تو حسنِ نیت سے اللہ تعالیٰ کو یاد کر لیا کرے۔ اس تذکرہ کا اسے خدمتِ خلق کے برابر ثواب ملے گا۔

۵۔ ذکر زندگی کے اواخر میں:

زندگی کے اواخر میں انسان کو ذکرِ الٰہی کی طرف اور بھی زیادہ متوجہ ہونا چاہیے۔ زندگی کی مصروفیات بے شک بدستور قائم رہیں لیکن ان مصروفیات کے دوران اللہ کی طرف پہلے سے بڑھ کر دھیان رہنا چاہیے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے آخیر میں جب آپؐ کو سورۂ نصر میں قربِ وفات کی خبر دی گئی تو ساتھ ہی حکم ہوا کہ آپؐ اللہ کی تسبیح اور اس سے استغفار جاری رکھیں۔ آپؐ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اللہ تعالےٰ کی بندگی اور یاد میں گزرا تھا تاہم سورہ نصر میں اس بات کی طرف واضح اشارہ تھا کہ زندگی میں جو فرصت باقی ہے اس کو ذکرِ الٰہی کے لئے غنیمت جانیں اور تسبیح و استغفار میں کمی نہ کریں۔

اعتکاف بھی ذکرِ الٰہی ہی کی ایک صورت ہے۔ اس کی بہت فضیلت ہے۔ جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر سال رمضان کے آخری دس روز میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔ زندگی کے آخری برس آپ نے بیس روز اعتکاف فرمایا۔

ذکر کی شروط

(شرط اسے کہتے ہیں جو کسی چیز کے قیام کے لئے ضروری ہو یعنی اس کا لازمہ ہو۔ شرط خارجی چیز ہے جو شے کی حقیقت میں شامل ہو اسے جزو یا رکن کہتے ہیں)

ذکر کے لئے دو شرطیں از بس لازم ہیں۔ یعنی خلوص اور فکر۔

۱۔ خلوص:

سبزہ بدوش اور گل بدامن کوہسار ہے۔ نظر کا قدم جہاں پڑتا ہے وہاں جنت کا حسین تختہ نثار ہوتا ہے۔ اُجلی اُفق مسکراہٹوں کے جادو بکھیر رہی ہے۔ چشمہ ساروں کا بے باک بہاؤ بدمستی کی چال دکھا رہا ہے۔ ٹھنڈی ہوا کیف و سرور کا پیغام لا رہی ہے۔ پہاڑی کے دامن میں شباب کی تصویر ایک چرواہا کھڑا ہے۔ اچانک اس کے دل کے تار لرزتے ہیں۔ بے ساختہ گیت اس کے سینہ سے پھوٹ نکلتا ہے۔ یہ گیت اس کے جذبات کو فطرت کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ کر دیتا ہے۔ وہ اپنے وجود کو فراموش کر کے فطرت کی آغوش میں جذب ہو جاتا ہے۔

یہ جنگل، یہ صحرا، یہ پہاڑ، یہ بیابان، یہ دریا، یہ سمندر، یہ چاند، یہ تارے یہ درخت، یہ پتھر، یہ نیلگوں آسمان، یہ پُربہار اُفق، قدرت الٰہی کی جلوہ گاہیں اور دل مومن کی سیرگاہیں ہیں۔ ان کے اثر سے اللہ مستوں کے سینوں سے توحید کے نغمے پیدا ہوا کرتے ہیں۔ عشق صادق ہو تو ان نغموں کا ذرا ایک شعلہ جو سینہ سے پھوٹتا ہے کبھی ہلکی ہلکی لہریں بن کر اور کبھی آواز کے روپ میں اُٹھ اُٹھ کر فضائے کائنات میں رواں ہوتے ہیں اور ذرے ذرے میں عشق الٰہی کی تھرتھری پیدا کر دیتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ کا ارشاد ہے کہ سبحان اللہ، الحمد للہ کا ورد زمین و آسمان کی پہنائیوں کو لبریز کر دیتا ہے۔[۱]

ذکر وہی ہے جس میں خلوص ہو یعنی خالصتہً اللہ تعالیٰ کی خاطر ہو۔ اس میں ریا یا نمائش کو دخل نہ ہو۔ ایسے ہی ذکر کے بارے میں جناب ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ

---

[۱] ریاض الصالحین بحوالہ مسلم

محبوب سُبحَانَ اللّٰہ اور اَلحَمدُ لِلّٰہ کا کلام ہے[1]

خلوص کی پہچان:

اللہ تعالیٰ کی یاد کے وقت انسان کے دل کی کیفیت خوف اور اُمید کے درمیان ہوتی ہے۔ کبھی تو جیسا کہ سورۂ انفال میں ارشاد ہے اللہ کے نام کی یاد اس کے دل کو لرزا دیتی ہے۔ یہ اللہ کی عظمت و جلال کی تاثیر ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کے جمال اور رحم سے اُمید بھی وابستہ ہوتی ہے۔ دل میں تسکین اور خوش گمانی کی لہر اٹھے بغیر نہیں رہتی۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ سے حسنِ ظن رکھنا عبادت کا حسن ہے[2]

بچّہ کو ماں سے بہت محبت ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ کوئی شرارت کر بیٹھتا ہے تو ماں کی سخت گیری کے خیال سے لرزجاتا ہے۔ تاہم اس خوف میں ایک گونہ اُمید بھی ہوتی ہے۔ اس خوف کے ہوتے ہوئے بھی بچّہ کے دل میں ماں کی جو محبت تھی وہ محبت ہی رہتی ہے نفرت میں نہیں بدلتی محبت کے کچھ ایسے ہی جذبات اللہ تعالیٰ کے بارہ میں بندے کے دل کے اندر موجزن رہتے ہیں۔ گویا جس کے جلوہ پر دم نکلتا ہے اسی کو دیکھ کر جیتا ہے۔

۲۔ فکر:

مصنوعات کو دیکھ کر ان کے صانع کے بارے میں ایک عمدہ اندازہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کو پہچاننے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اس کی

---

[1] ریاض الصالحین بحوالہ مسلم [2] ترمذی ابواب الدعوات

مخلوقات پر گہری نگاہ ڈالی جائے۔ کائنات کا جس قدر وسیع و عمیق مطالعہ کیا جائے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا احساس اسی قدر قوی سے قوی تر ہوتا جاتا ہے۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (آل عمران ۱۹۰-۱۹۱)

(یقیناً آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور روز و شب کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ کو کھڑے اور بیٹھے اور پہلو پر لیٹے یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں تفکر کرتے ہیں)

اللہ تعالیٰ کی کائنات کا آج تک اندازہ نہیں ہو سکا۔ اتنا معلوم ہے کہ یہ کائنات بے شمار جہانوں کا مجموعہ ہے۔ ہر جہاں کی بے کراں وسعت ہے اور یہ وسعت دم بدم محیر العقول تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ان سب جہانوں میں ایک نظم و ربط ہے جس میں ذرہ بھر خلل نہیں آتا۔ یہ دیکھ کر انسان یہ ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس لامحدود نظام کو چلانے والی کوئی صاحب ارادہ ہستی ہے جسے ہم اللہ کہتے ہیں۔ اس فکر کے ساتھ ہمارے دل میں ذکر کی جو لہر اٹھتی ہے کائنات کی طرح وہ بھی غیر محدود ہونا چاہتی ہے۔ الغرض فکر کے ساتھ ساتھ ذکر بھی پروان چڑھتا ہے۔

ہر انسان اپنی اپنی عقل و خرد اور ذہنی استعداد کے موافق موجودات میں غور و فکر کرتا ہے۔ ایک ان پڑھ دیہاتی کے لئے اونٹ کا قد کاٹھ ہی اللہ کی

قدرت کا عجیب نمونہ ہے لیکن سائنس دان کی نگاہ اس سے بھی آگے بڑھتی ہے اور اگر اس کے دل میں ایمان کی روشنی ہو تو اس کے دل میں جذبۂ توحید اور قوی تر ہو جاتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ شہد کی مکھی کی پانچ آنکھیں ہوتی ہیں اور ہر آنکھ ۲۵۰۰ آنکھوں کا مجموعہ ہوتی ہے، مکڑی کے بدن میں چار ہزار نالیاں ہوتی ہیں جن سے چار ہزار تار نکلتے ہیں جو چار نالیوں پر تقسیم ہو کر صرف چار رہ جاتے ہیں۔ ہر تار ریشم کے تاگے سے ۹۰ گنا باریک تر ہوتا ہے۔ جب وہ سمجھ پاتا ہے کہ کائنات کے سینہ کا ہر راز شہد کی مکھی اور مکڑی کے بدن سے بڑھ کر دقیق اور پیچ در پیچ ہے تو حیرت و استعجاب کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے اور اس کا دل بے اختیار اللہ تعالیٰ کے ذکر سے چھلک اٹھتا ہے۔

ذکر و فکر لازم و ملزوم ہیں۔ اگر ذکر کے پودے کے لئے خلوص کی کشت کے بغیر چارہ نہیں تو فکر کی آب و ہوا کے بغیر بھی اس کی شاخیں کبھی ہری نہیں رہ سکتیں۔ صرف انسان ہی نہیں بلکہ جمادات بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ ہر وقت ایسی زبان کے ساتھ جسے عام انسان سن نہیں سکتے تسبیح و تقدیس میں مصروف رہتے ہیں۔ لیکن جو درجہ انسان کے ذکر کا ہے وہ جمادات کے ذکر کا نہیں کیونکہ ان کے ہاں فکر ناموجود ہے۔

قرآن حکیم نے ذکر الٰہی کے لئے تفکر لازم قرار دیا ہے۔ اس مقصد کے لئے قرآن حکیم مطالعۂ کائنات کی بار بار تلقین کرتا ہے۔ مطالعۂ کائنات کے شوق نے فرزندان اسلام کو تجرباتی سائنس کی راہ دکھائی۔ انھوں نے سینۂ کائنات کے کئی سربستہ اسرار کھولے۔ مسلمانوں کی سائنس نے ترقی کی انتہائی منزلوں کو چھو لیا یہاں تک کہ البیرونی ایسے سائنس دان راکٹوں کا

نظریہ بھی چھوڑ گئے جس سے آج غیر مسلم استفادہ کر رہے ہیں اہلِ اسلام خود فکر کی طرف سے آہستہ آہستہ غافل ہو گئے۔

ذکر کا طریقہ

۱۔ قلبی اور قولی ذکر:

ذکر الٰہی کی دو بڑی صورتیں ہیں یعنی قلبی و قولی جیسا کہ قرآنِ حکیم کی اس آیت سے ظاہر ہے: وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيفَةً وَّدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلَا تَكُن مِّنَ الْغَافِلِينَ:۔

(الاعراف۔ آخری رکوع) (اور اپنے رب کو اپنے جی میں گڑگڑاتے اور ڈرتے ہوئے یاد کرتا رہ (اسے) دھیمی آواز سے صبح و شام یاد رکھ) اور غافلوں سے نہ ہو۔ اس آیت میں قلبی ذکر کے بارے میں یہ بتایا ہے کہ عجز و الحاح اور خوف کے ساتھ ہو۔ قولی ذکر کے بارے میں فرمایا ہے کہ آواز بہت اونچی نہ ہو۔

ذکر کا اصل مقصود اللہ تعالیٰ سے روحانی تعلق استوار اور مضبوط کرنا ہے اس لئے اگر آدمی فقط زبان سے کچھ کلمات ادا کرتا رہے اور دل میں دھیان نہ ہو تو ذکر کا پورا حق ادا نہیں ہوتا۔ یہ ذکر بھی ثواب سے خالی نہیں لیکن دل میں نشاط پیدا نہیں ہوتی۔

۲۔ کلماتِ ذکر:

ذکر اپنے گہرے مفہوم کے لحاظ سے تو دل کے احساس کا نام ہے لیکن دل کے احساس کو ہم اپنے ذہن کی دنیا میں الفاظ کا جامہ ضرور پہناتے ہیں۔ دل کا اثر زبان پر اور زبان کا دل پہ ہوتا ہے۔ اس لیے ذکر کے لئے الفاظ یا عبارات کا ہونا ضروری ہے۔

کلماتِ ذکر میں سب سے پہلے اسماءِ حسنیٰ کا درجہ ہے :

وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا (الاعراف)

(اور اللہ تعالیٰ کے اچھے نام ہیں اور اس کو انہی سے پکارو)

جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کے ننانوے ۹۹ اسمائے حسنیٰ منقول ہیں۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ جس نے ان کو حفظ کیا وہ جنت میں داخل ہوگا۔ یہاں حفظ کرنے سے مراد ہے دل و دماغ میں یاد رکھنا۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات کے بارے میں کج روی اختیار نہیں کرنی چاہیے یعنی وہی نام لئے جائیں جن کی شریعت نے اجازت دی ہے۔ ان کو کسی اور کام کیلئے نہ برتا جائے۔ ان کی غلط تاویل نہ کی جائے اور نہ انھیں جادو وغیرہ کے لئے استعمال کیا جائے۔

ان اسماء کو بہترین عبارتوں میں پیش کیا جائے۔ یہ عبارتیں نہایت جامع اور پُر تاثیر ہونی چاہییں۔

ذکر کی عبارات اتنی ہی وسیع ہو سکتی ہیں جس قدر انسانی جذبات اور خیالات کی دنیا وسیع ہے۔ تاہم یہ مسلمہ امر ہے کہ بعض الفاظ میں معانی کی گہرائی اور شدت زیادہ ہوتی ہے بعض میں کم۔ ادیب یا شاعر الفاظ کے انتخاب اور حسنِ استعمال میں جس قدر ماہر ہوتا ہے اس کے کلام میں اتنی ہی زیادہ تاثیر ہوتی ہے اور ادب و شعر کی دنیا میں اس کا پایہ اسی قدر بلند ہوتا ہے۔ قادر الکلام ادباء اور شعراء کے فقرات اور اشعار کو لوگ ذہنوں میں محفوظ کر لیتے ہیں اور موقع بہ موقع انھیں دہرا کر تاثیر کے نشتر چلاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر زبان و کلام کا نکتہ داں اور اثر شناس کون ہو سکتا ہے اسے چونکہ اپنا ذکر بہت مرغوب ہے اس لیے اس نے ذکر کے بعض الفاظ

قرآن حکیم میں اور بعض اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وساطت سے بتا دیئے ہیں۔ اگرچہ ذکر الٰہی کو انہی میں محدود کرنے کا حکم نہیں لیکن ان الفاظ میں تاثیر زیادہ ہے، اللہ تعالیٰ کو مرغوب ہیں اور اس کے محب و محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک پر جاری رہتے تھے ان میں سے بعض کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

تہلیل : لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہنا

یہ افضل ترین ذکر ہے۔

تسبیح : سُبْحَانَ اللّٰہِ کہنا

تحمید : اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہنا

تکبیر : اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہنا

ان الفاظ میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے اور نئی ترکیبیں بھی ہو سکتی ہیں لیکن بہترین اذکار وہی ہیں جو ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہیں مثلاً ایک دفعہ ایک بدو نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے ایسا کلام بتائیے جسے میں دہرایا کروں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ تم یہ الفاظ کہا کرو۔

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ اَللّٰہُ اَکْبَرُ کَبِیْرًا وَّالْحَمْدُ لِلّٰہِ کَثِیْرًا وَّ سُبْحَانَ اللّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ ۝

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور بھی کئی الفاظ سے ذکر فرمایا کرتے تھے۔

۳۔ قرآن حکیم کی تلاوت :

قرآن حکیم کی تلاوت بھی ایک نہایت اعلیٰ وارفع اور شیریں ذکر ہے۔

قرآن مجید میں ذکر سے مراد بعض جگہ اللہ تعالیٰ کی یاد اور بعض جگہ قرآن حکیم ہے۔

قرآن حکیم کو اگر سمجھ کر اور غور و فکر کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کا ثواب بہت بڑھ جاتا ہے لیکن اس کی تلاوت کرنے اور سننے پر بھی بے اندازہ اجر اور فضیلت ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قرآن حکیم کو خوش الحانی سے تلاوت کیا جائے۔ آپؐ بار بار کسی خوش الحان صحابی کی زبان سے فرمائش کر کے قرآن حکیم کی تلاوت سنا کرتے تھے۔ آپ کا ارشاد ہے:

مَنْ لَّمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ فَلَيْسَ مِنَّا

(جو خوش الحانی سے قرآن نہیں پڑھتا وہ ہم میں سے نہیں)

قرآن حکیم کے الفاظ اللہ تعالیٰ کے الفاظ ہیں۔ جسے اللہ سے محبت ہے اسے ان الفاظ سے بھی محبت ہوگی اور جس طرح کسی عزیز دوست یا رشتہ دار کا خط پڑھ کر خوشی ہوتی ہے اسی طرح اسے قرآن حکیم کی تلاوت کر کے روحانی نشاط ہوگی۔

۴۔ دعا

اللہ تعالیٰ کے حضور میں عجز و انکسار سے دعا کرنا بھی ذکر کی ایک پُرخلوص نوع ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ دعا بہت بڑی عبادت ہے۔ اللہ تعالیٰ صاحبِ ایمان بندے کی دعا سن کر بہت خوش ہوتا ہے۔

۵۔ اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یاد:

اللہ تعالیٰ کے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یاد رکھنے کی تاکید خود اللہ نے فرمائی ہے اور حکم دیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود

اور سلام بھیجا کرو۔ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ قیامت کے روز مجھ سے قریب ترین وہ شخص ہوگا جس نے مجھ پر سب سے زیادہ درود پڑھا ہو ۔

۶۔ ذکر و عمل :

اللہ تعالیٰ کو جس قدر یاد کیا جائے کم ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی دنیا کے کام کاج چھوڑ کر دن رات وظیفے پڑھا کرے یہ رہبانیت ہے جس کی اسلام میں ممانعت ہے۔ ذکر الٰہی اصل کے لحاظ سے دل کی یاد کا نام ہے۔ یہ یاد دنیاوی کاروبار کے دوران بھی رہ سکتی ہے، اذکار اور دنیا کے دھندوں کے درمیان ایک جائز تناسب ہونا چاہیئے۔ نہ کاروبار کو برطرف کرنے کی ضرورت ہے اور نہ اذکار کو۔ دل کی یاد ہر وقت ہوا کر سکتی ہے، اور جہاں تک زبانی یاد کا تعلق ہے جناب باری برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو احادیث منقول ہیں ان میں زیادہ طویل اذکار کا حکم نہیں ملتا۔ البتہ جن حضرات کو کاروبار سے فرصت ہو وہ طویل اذکار بھی کر سکتے ہیں۔

دنیا کے اشغال انسان کو ذکرِ خدا سے منع نہیں کرتے۔ ان دونوں کا باہمی پلڑا رہ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قرآن حکیم میں ارشاد ہے کہ "اے ایمان والو! تمہاری اولاد اور تمہارے اموال تمہیں ذکر الٰہی سے غافل نہ کر دیں" (المنافقون)۔ یہاں یہ مراد نہیں کہ تم مال و اولاد سے کٹ جاؤ بلکہ یہ ہے کہ دونوں فرائض ساتھ ساتھ نباہو۔ انسان کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ کاروبار کے دوران اپنے دل میں اللہ کی یاد اور قیامت کے محاسبہ کا خوف رکھے۔ اس کا یہ فائدہ ہوگا کہ وہ دغا، فریب اور بے ایمانی سے بچے گا اور حلال کی کمائی کھائے گا۔ حضرت احمد بن حنبلؒ کا قول ہے کہ گداز قلب حلال

کمائی سے پیدا ہوتا ہے۔ یادِ الٰہی سے غافل ہونا، دل کا سخت ہونا اور حرام خوری کرنا لازم و ملزوم ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری بھی ذکر ہی ہے۔ اسے ہم عملی ذکر کہہ سکتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اس نے اللہ کو یاد رکھا، چاہے زبان سے ذکر نہ کیا اور جس نے اس کی نافرمانی کی اس نے اللہ کو بھلا دیا چاہے زبانی ذکر کرتا رہا۔[1]

بعض علماء نے قرآنِ حکیم کے الفاظ: فَاذْكُرُونِي کے معنی یہ کیے ہیں کہ اطاعت کے ذریعے میری یاد رکھو۔[2]

۷۔ جماعتی ذکر:

انسانی جذبات ایک دوسرے پر نہایت تیزی سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ مغموم چہرہ کو دیکھ کر دل پژمردہ ہوتا ہے۔ بشاش چہرے کو دیکھ کر انبساط ہوتی ہے جو عملی نفسیات کا یہ ایک بنیادی مسئلہ ہے کہ جب لوگ ایک جماعت میں اکٹھے ہوتے ہیں ان میں وحدتِ جذبات پیدا ہو جاتی ہے اور بسا اوقات ان مجمعوں میں اس طرح ایک دوسرے میں گم ہو جاتے ہیں گویا ہر آدمی دوسرے کے جذبات کا مظہر ہے۔ نیکی کے کام جہاں تک ہو سکے جماعت سے ادا کرنے چاہییں تاکہ لوگوں میں نیکی کا میلان بڑھے۔

ذکرِ الٰہی جماعت سے کیا جائے تو اس میں بہت تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔ ہادیِ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مبارک میں صحابہ کرامؓ کے حلقے

---

[1] دلیل الفالحین باب الحمد ، ۲۰۳ [2] ایضاً۔

بلکہ عہد نبوی میں نظر آتے تھے۔ وہ باہم تسبیح و تحمید وغیرہ کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں اجتماعی ذکر بالخصوص جو صبح میں ہو بہت مقبول ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قرآن حکیم میں ارشاد ہے کہ تو ان لوگوں کے ساتھ بیٹھا رہا کر جو صبح و شام اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں، خالصتاً اللہ کی خاطر اور تیری آنکھیں ان کو چھوڑ کر دنیوی زندگی کی رونق کے پیچھے نہ دوڑیں۔ اس کے پیچھے نہ چل جس کا دل ہم نے اپنے ذکر سے خالی کر دیا ہے، جو غرض کا بندہ ہے اور اس کا معاملہ حد سے گزرا ہوا ہے[۱]

آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب کوئی گروہ اللہ کا ذکر کرنے کو ہم نشین ہوتا ہے تو ملائکہ اُن کو ڈھانپ لیتے ہیں ان پر رحمت چھا جاتی ہے۔ ان پر تسکین نازل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ انھیں اپنی بزم میں یاد کرتا ہے[۲]

اللہ کے بعض نیک بندے وقتاً فوقتاً ذکر کی مجالس منعقد کرتے ہیں۔ ان سے بہت روحانی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

ذکر کے ثمرات

۱۔ اللہ کے ہاں مقبولیت:

اللہ تعالیٰ کو وہ بندے بہت مقبول ہیں جن کے دل میں یا زبان پر اس کا ذکر رہتا ہے۔ اللہ کو جو مومن یاد کرتا ہے وہ بھی اسے یاد کرتا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

---

[۱] الکھف ۲۸ [۲] ریاض الصالحین بحوالہ مسلم

فَاذْكُرُونِىٓ اَذْكُرْكُمْ

(مجھے یاد کرتے رہو میں بھی تمہیں یاد رکھوں گا)

اللہ تعالیٰ کا یاد رکھنا محض یاد رکھنا ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ انسان کو اپنی رحمت کے سایہ میں لے لیتا ہے۔ وہ ہر مشکل میں اس کا رفیق اور مدد رساں ہوتا ہے۔ وہ نہایت سرعت سے دعا سنتا ہے اور مدد کو پہنچتا ہے۔ اپنے یاد کرنے والے کو کسی وقت تنہا نہیں چھوڑتا۔ وہ اس کا ہم نشین بن جاتا ہے اور ہم نشین بھی ایسا کہ شاہ رگ سے بھی قریب تر ہوتا ہے۔ حدیثِ قدسی ہے کہ میرا بندہ میرے بارے میں جو گمان کرتا ہے میں اس گمان کے پاس ہوتا ہوں۔ جب وہ مجھے یاد کرتا ہے تو اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔ جب مجھے جی میں یاد کرے تو میں اسے جی میں یاد کرتا ہوں۔ وہ مجھے برسرِ عام یاد کرے تو میں اُسے برسرِ عام یاد کرتا ہوں[1] (یعنی وہ خلقِ خدا میں مقبول ہو جاتا ہے)

۲- اطمینان:

اللہ تعالیٰ کا ذکر روح کا نغمہ اور زندگی کی قوت ہے۔ یہ وہ نغمہ ہے جو دل سے اُٹھتا ہے اور ساز و بہار کا محتاج نہیں ؎

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ

ذکرِ الٰہی کی موسیقی دل کی گہرائیوں سے اُٹھتی ہے۔ اعصابی قوت کو ایک ایک مرکز پر مجتمع رکھتی ہے۔ اس کا ثمر اطمینان اور دل جمعی ہے —

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (جان لو کہ ذکرِ الٰہی سے دلوں کو

---

[1] ریاض الصالحین بحوالہ مسلم و بخاری۔

اطمینان ہوتا ہے)۔
نماز کا ذکرِ الٰہی سے گہرا تعلق ہے۔ جناب پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرمایا کرتے تھے:

قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلٰوةِ
(میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں ہے)

نماز کا وقت ہوتا تو آپؐ حضرت بلالؓ کو حکم دیتے کہ اذان دو اور نماز سے (یعنی نماز کی طرف بلا کر) ہمیں راحت پہنچاؤ۔
اللہ تعالیٰ کی یاد یہ احساس زندہ رکھتی ہے کہ ہمارا ربط ایک ایسی ذات سے ہے جو ربّ ہے، رحیم ہے، کریم ہے اور دکھ سکھ میں زندگی کا سہارا ہے۔ اس احساس سے ہمارے دل میں تسلی پیدا ہوتی ہے۔ پریشانی دور ہوتی ہے اور عزم و حوصلہ کے جذبات ابھرتے ہیں۔
راحت کے سامان تو فیکٹریوں اور کارخانوں میں بنتے ہیں لیکن اصل راحت اللہ تعالیٰ کے ہاں سے آتی ہے۔ اگر وہ اس راحت کو روک لے تو زندگی کے سارے ساز و سامان کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں۔ اس وقت جرمنی اور امریکہ میں بعض ایسے سرمایہ دار موجود ہیں جن کی ثروت کا صحیح اندازہ خود ان کو بھی نہیں۔ ان میں سے بعض کی گھریلو زندگی کے حالات دنیا کے سامنے آئے تو معلوم ہوا کہ وہ راحت اور اطمینان کو ترس رہے ہیں۔ بے چینی اور ناآسودگی کی آگ نے ان کی ہڈیوں کو جلا رکھا ہے۔ موجودہ دور میں تو خیر قلب و روح کا عالمگیر فساد رونا ہے ہی، اگلے وقتوں کے حالات دیکھیں تو ان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ دولت اور ثروت راحت کے ضامن نہیں ہو سکتے جب تک اللہ تعالیٰ یہ نعمت

بخشے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے :

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى

(اور جو میری یاد سے منہ موڑے تو یقیناً اس کے لیے تنگ زندگی ہے اور قیامت کے روز ہم اسے اندھا اٹھائیں گے)

اموی خلیفہ عبدالملک بہت جبار اور پرشکوہ فرماں روا تھا۔ اس نے ایک بار ایک دھوبی کو دیکھا تو بے اختیار کہہ اٹھا کہ کاش مجھ کو بھی اس کی سی زندگی حاصل ہوتی۔

جو شخص اللہ تعالیٰ کو یاد رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے بے چینی دور کر کے اس کے دل میں تسکین بھر دیتا ہے۔ [illegible]

[illegible]

بندہ جب مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں[1]

۲۔ اعصابی قوت :

موجودہ دور میں اعصابی امراض بہت کثرت سے بڑھ گئے ہیں۔ یورپ کے ڈاکٹر ان امراض کا جس قدر علاج ڈھونڈتے ہیں یہ اور زور پکڑتے ہیں۔ اس مرض کی جڑ کاٹنا اطباء کے بس ہی نہیں۔ اعصابی کمزوری ایک حد تک طبی علاج بھی بے شک ہو سکتے ہیں لیکن اس کی بیخ کنی کا

---

[1] ترمذی ابواب الدعوات۔

ایک تیر بہدف نسخہ ذکرِ الٰہی ہی ہے۔ ذکرِ الٰہی سے دل کو قوت حاصل ہوتی ہے۔ یہ قوت سب اعصابی قوتوں کا سرچشمہ ہے۔ بلکہ حقیقی زندگی ذکر ہی کے دم سے ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو آدمی اللہ تعالیٰ کو یاد رکھتا ہے وہ زندہ ہے اور جو اسے یاد نہیں رکھتا وہ گویا مُردہ ہے (مشکوٰۃ)

۴۔ روحانی پاکیزگی:

انسان سچے دل سے اللہ تعالےٰ کا ذکر کرے تو وہ بُرائی سے گریزاں رہتا ہے۔ نماز میں چونکہ اللہ تعالیٰ کا ذکر ہوتا ہے اس لئے قرآن حکیم میں ارشاد ہے کہ نماز بے حیائی اور برائی سے بچاتی ہے۔ احادیث سے ثابت ہے کہ ذکر روح کی صیقل ہے۔

۵۔ توشۂ جنت:

روحانی پاکیزگی جنت کا پروانہ ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو جنت عطا کرتا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کو جو مرد اور جو عورتیں بہت یاد کرتی ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے مغفرت اور اجرِ عظیم تیار کیا ہے۔

آں حضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اثنائے معراج میں حضرت ابراہیمؑ سے ملاقات کی۔ حضرت ابراہیمؑ نے آپ سے کہا کہ میری طرف سے امت کو سلام کہیں اور یہ پیغام دیں کہ جنت کی مٹی پاکیزہ اور پانی شیریں ہے اور یہ بے سبزہ ہے۔ اس میں سُبْحَانَ اللّٰہِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اور اللّٰہُ اَکْبَرُ سے اگاؤ ہوتا ہے[1] مراد یہ ہے کہ جنت کی آبادی ذکرِ الٰہی کرنے والوں ہی سے ہوگی۔

---

[1] ریاض الصالحین بحوالہ ترمذی۔

صَبر

مفہوم عوام کے ہاں صبر کے بارے میں کچھ غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ ناطاقتی اور ناچاری سے خوگر ہو جانے کا نام ان کے ہاں صبر ہے۔ لیکن قرآن و حدیث کی رو سے یہ نظریہ غلط ہے۔
صبر کے لغوی معنی ہیں: اپنے کو روکنا، سہارنا یا کسی بات پر قائم رکھنا۔ قرآنی اصطلاح میں اس کا مفہوم لغوی معنی پر ہی مبنی ہے لیکن وہاں اس کے معنی میں وسعت زیادہ ہے۔
صبر کا تار و پود استقامت اور استقلال سے بنتا ہے۔ ہر شخص میں تحمل اور مداومت کا ملکہ طبعاً موجود ہوتا ہے۔ اس ملکہ کو زندہ رکھنا اور اس کا صحیح اور حسب موقع استعمال ہی صبر ہے۔ یہ نہایت مردانہ خوبی ہے جس کی ہر حالت میں ضرورت ہوتی ہے یعنی دشواری میں بھی اور آسانی میں بھی، تموّل میں بھی اور افلاس میں بھی، بے سامانی میں بھی اور حشمت و شوکت میں بھی، صبر کے یہ سب مواقع ایک دوسرے سے کم و بیش مختلف ہیں۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر قرآن حکیم نے موقع موقع کے لحاظ سے کچھ فرق دکھایا ہے لیکن بنیادی عنصر استقامت ہر کہیں موجود ہے۔
قرآن حکیم کے مطالعے سے صبر کے مختصراً مندرجۂ ذیل مفہوم حاصل ہوتے ہیں:

(۱) ہر حال میں اپنے جذبات پر قابو رکھنا۔
(۲) مشکلات اور بے سامانی میں تحمل کرتے ہوئے کشائش کا انتظار کرنا۔
(۳) حالات تقاضا کریں تو دشمن کے مقابلہ پر جان کی بازی لگا دینا۔
(۴) نیک عمل کا دوام۔
(۵) عمل اور دعا کے نتائج کا قرار و اطمینان سے انتظار کرنا۔

صبر کے مراتب صبر کے کئی مدارج ہیں جن کا تعلق انسان کے نصب العین سے ہوتا ہے۔ اگر کسی کام کا نصب العین صرف اللہ تعالیٰ کی رضا ہو تو یہ صبر کا بلند ترین درجہ ہوگا۔
صبر کا کمال یہ ہے کہ آدمی پر کوئی مشکل یا آزمائش کتنی ہی اچانک کیوں نہ آئے اس کے حواس بجا رہیں اور اس کے اعتقاد میں کوئی فرق نہ آئے۔ آہستہ آہستہ وقت گزرنے پر تقریباً سب کو قرار آ جاتا ہے لیکن صحیح معنی میں صابر شخص وہ ہے کہ بڑے سے بڑے صدمہ پر بھی نہ گھبرائے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ صبر صرف وہ ہے جو پہلے صدمہ کے وقت ہو۔[۱]

اہمیت دنیا صبر کی امتحان گاہ ہے:
قرآن حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی تخلیق ہی آزمائش کے لئے ہوئی ہے اور دکھ اس کا امتحان ہیں[۲]۔ سورۂ آلِ عمران میں ارشاد ہے:

لَتُبْلَوُنَّ فِیْ اَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ (پ ۴، ۹۶)

(تمھاری جانوں اور مالوں میں ضرور آزمائش ہوگی)

اسی سورت میں اہلِ اسلام سے خطاب ہے کہ کیا تمھارا یہ خیال ہے

---

[۱] ریاض الصالحین باب الصبر۔ [۲] دہر ۲۰، ابراہیم ۴۰، محمد ۴۰۔

تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ تعالیٰ نے تم میں سے جہاد کرنے والوں اور صابرین کو نہیں دیکھ لیا ؟[1] اس کی تفسیر میں شبیر احمد عثمانی رح لکھتے ہیں:

"جنت کے جن اعلیٰ مقامات اور بلند درجات پر اللہ تعالیٰ تم کو پہنچانا چاہتا ہے کیا تم سمجھتے ہو کہ بس یونہی آرام سے وہاں جا پہنچیں گے اور اللہ تعالیٰ تمہارا امتحان لے کر نہ دیکھے گا کہ تم میں کتنے اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑنے والے اور کتنے لڑائی کے وقت ثابت قدم رہنے والے ہیں۔"

چونکہ زندگی کا مقصد ہی صبر و ہمت کا امتحان ہے اس لئے قرآن حکیم میں اخلاق کی کسی فضیلت کے بارے میں اتنی تاکید نہیں آئی جتنی صبر کے بارے میں ہے۔ ستر سے زائد مقامات پر صبر کا حکم آیا ہے۔

صبر ہر حال میں اُمید کا چراغ ہے۔

صبر کی ضرورت زندگی کے ہر شعبے میں ہوتی ہے۔ استقامت کے بغیر زندگی کی کوئی مہم پروان نہیں چڑھ سکتی اور زندگی کے کسی میدان میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ زندگی جہدِ مسلسل ہے۔ اس میں وہی شخص سرخرو اور کامران رہ سکتا ہے جس کی ہمت ہمیشہ تازہ رہے اور ارادوں پر مایوسی طاری نہ ہو۔ صبر کا جذبہ گویا دل کی روشنی ہے جو ناامیدی کی تاریکی کو چاک کر کے زندگی کے سفر کو تابناک کر دیتی ہے۔ لہٰذا حدیث شریف میں آیا ہے:

اَلصَّبْرُ ضِيَاءٌ [2]

(صبر روشنی ہے)

---

[1] پارہ ۴ ع ۲ [2] ترمذی ابواب الدعوات

حضرت حسین احمد مدنیؒ اس موضوع پر رقمطراز ہیں کہ :

"پس ماندگی ظلمت و تاریکی ہے اور جدوجہد نور اور روشنی۔ جب بھی کوشش اور سعی پیہم کی روشنی دھیمی پڑتی ہے پس ماندگی کی تاریکی اُبھر آتی ہے۔ آپ اگر پس ماندگی کی تاریکی ختم کرنا چاہتے ہیں تو صراطِ مستقیم پر جدوجہد کی روشنی تیز کیجئے دنیا کا کام ہو یا دین کا، جماعتی ہو یا انفرادی، ہر ایک کے لئے قانونِ قدرت یہی ہے۔"[1]

علامہ اقبال فرماتے ہیں ع

زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے

(یعنی مسلسل کوشش ہی میں زندگی کا راز ہے)

علمی کاوشیں اور سائنسی تحقیقات کے لئے بہت جانکاہی اور صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک ایک مسئلہ کو حل کرنے کے لئے برسوں محنت کرنا پڑتی ہے۔ دنیا میں وہی اقوام علم و حکمت میں ترقی کر سکتی ہیں جن میں استقلال کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہو ورنہ وہ دوسروں کی نقالی پر مجبور ہوتی ہیں۔

صبر نہ ہو تو مایوسی دل کو گھیر لیتی ہے اور ایمان کی قوت چھین لیتی ہے مثلاً فقر فضیلت کا وسیلہ ہے لیکن صبر نہ ہو تو الٹا کفر کی طرف لے جاتا ہے چنانچہ ارشادِ نبوی ہے کہ فقر بعض دفعہ کفر میں ڈھلنے کے قریب ہو جاتا ہے۔[2]

صبر اور ایمان لازم و ملزوم ہیں :

حضرت علیؓ کا ارشاد ہے کہ صبر ایمان کا سرچشمہ ہے۔ جب صبر گیا تو ایمان بھی رخصت ہوا۔[3]

---

[1] خطبۂ سورت ۱۹۵۲ء [2] مشکاۃ باب الحذر [3] تاریخ الخلفاء ص ۱۸۵

ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے جناب رسالت مآب صلی اللہ اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی کہ مجھے کوئی ایسی نصیحت فرمایئے کہ اس کے بعد اور کسی سے پوچھنے کی حاجت نہ رہے۔ حضورؐ نے فرمایا،

قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ[1]

(کہہ میں اللہ پر ایمان لایا اور پھر ثابت قدم رہ)

جماعتی صبر:

صبر کی جتنی ضرورت انفرادی زندگی میں ہے اس سے زیادہ جماعتی زندگی میں ہے۔ صبر کے بغیر قوم میں اتحاد قائم نہیں رہ سکتا۔

ہر شخص کو قوم کی خاطر جانی اور مالی قربانی کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ اسے بارہا ملت کے لئے بڑے بڑے دُکھ اٹھانے پڑیں گے۔ عین ممکن ہے قوم کے بعض افراد اس کی مساعی کو اشتباہ کی نگاہ سے دیکھیں اور اس کی قدر نہ کریں لیکن اسے بد دل نہیں ہونا چاہیے۔

قرآن حکیم میں جماعتی صبر کی کئی جگہ تلقین آئی ہے، یہی وہ چیز ہے جس سے مسلمان ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہو جاتے ہیں۔ جو لوگ اپنے نفع یا آرام کی خاطر قوم کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں وہ اللہ کی نگاہ میں بہت بڑے مجرم ٹھہرتے ہیں۔ جب تک قوم میں بھلائی کی کچھ بھی صلاحیت باقی ہو اس سے کنارہ کشی درست نہیں۔ نبی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ وہ مسلمان جو لوگوں سے میل جول رکھتا ہے اور ان کی ایذائیں اٹھاتا ہے اس شخص سے بہتر ہے جو لوگوں سے میل جول نہیں رکھتا اور ان کی ایذائیں نہیں اٹھاتا[2]

---

[1] ریاض الصالحین [2] ترمذی باب صفتہ القیامتہ

صبر کی شروط

قرآن حکیم میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کو دنیا و آخرت میں کلمۂ پختہ سے ثابت قدم رکھتا ہے۔ کلمۂ پختہ سے مراد کلمۂ توحید ہے۔ عقیدۂ توحید جس قدر پختہ ہوگا صبر کا جذبہ بھی اسی قدر مضبوط ہوگا۔ توحید کے ضمن میں بالخصوص مندرجۂ ذیل عقائد صبر کو بہت قوت دیتے ہیں:

۱۔ یقین و توکّل۔

اللہ تعالیٰ کی ذات پر پورے یقین سے بھروسا کر کے میدانِ عمل میں قدم رکھنا چاہیے۔ انجام اللہ تعالیٰ ہی کو سونپ دینا چاہیے۔ توکّل کا یہی تقاضا ہے۔ یقین کی قوت کسی مشکل کو غالب اور گراں بار نہیں ہونے دیتی۔ اس سے مصائب سہل ہو جاتے ہیں۔ جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کی بارگاہ میں ایسے یقین کے لئے دعا فرمایا کرتے تھے جس سے مصائب آسان ہو جائیں[1]

۲۔ عقیدۂ تقدیر:

عقیدۂ تقدیر انسان کو مایوسی سے بچاتا ہے۔ کسی کام میں ناکامی ہو جائے تو پھر بھی اس خیال سے انسان کی ہمت مضبوط رہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا۔

۳۔ ثوابِ آخرت

اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں کامیابی کا اصل معیار نیّت ہے جس کا پھل آخرت میں ضرور ملے گا۔ نیّت نیک ہو اور دنیوی زندگی میں کوشش ناکام بھی ہو جائے تو آخرت میں اس کے عوض کامیابی نصیب ہوگی۔ جس شخص کے دل میں یہ عقیدہ بیٹھ

---

[1] مشکوٰۃ باب جامع الدعاء

جائے وہ لاکھ ناکامیاں بھی ہوں ہمت نہیں ہارتا۔

صبر کی تربیت

صبر کی تربیت کے لئے اسلام میں بہت اہتمام کیا گیا ہے مثلاً ہر سال رمضان کے روزے فرض ہیں۔ اگر کوئی شخص روزہ رکھ کر توڑ ڈالے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ دو ماہ روزے رکھے۔ صبر کی مزید تربیت کے لئے رمضان کے علاوہ بھی وقتاً فوقتاً نفل روزے رکھنے چاہییں۔ روزہ سے بھوک پیاس اور دنیا کی مرغوبات کے مقابلہ میں صبر کا ملکہ پیدا ہوتا ہے۔

صبر کی تربیت کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنی طاقت اور بساط کے موافق زندگی کی ذمہ داریاں اٹھائے اور ان پر پختگی سے کاربند رہے۔ اس سے اس کے اندر یہ ملکہ پیدا ہوگا کہ وہ عظیم تر ذمہ داریاں اٹھانے کے قابل ہو جائے گا۔ صبر کے معاملہ میں آدمی اپنی قوت اور طاقت کے موافق درجہ بدرجہ ترقی کرتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ وہ بڑی سے بڑی ذمہ داری کو بھی نہایت اولوالعزمی سے نباہتا ہے۔

اس کے دل پر پہاڑ جتنا غم بھی آپڑے تو اس میں شکستگی نہیں آتی ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

بہرحال دل میں صبر کی سچی طلب ہو اور اس طلب میں بھی صبر کا ثبوت دیا جائے تو ضرور کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص عفیف ہونا چاہے اللہ تعالیٰ اسے عفیف کر دیتا ہے۔ جو استغناء کرے اللہ تعالیٰ اسے غنی کر دیتا ہے۔ جو صبر کرے اللہ تعالیٰ اسے صبر کی توفیق دے دیتا ہے[1]

---

[1] مسلم کتاب الزکاۃ فضل التعفف والصبر

صبر کے تقاضے

گزشتہ صفحات میں ہم دیکھ آئے ہیں کہ صبر کے پانچ بنیادی مفہوم ہیں۔ یہی صبر کے تقاضے بھی ہیں۔ ان پر ہم ذیل میں فرداً فرداً نگاہ ڈالیں گے۔

(اول) ہر حال میں اپنے جذبات پر قابو رکھنا:

زندگی کے ادوار بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی دکھ ہے کبھی سکھ، کبھی تنگی ہے کبھی فراخی، کبھی غلبہ ہے کبھی ضُعف۔ ہر دور اور ہر حال میں ثابت قدم رہنا چاہیے۔ انسان کو لازم ہے کہ دکھ میں بے قرار اور بے تاب نہ ہو، سکھ میں پھول کر آپے سے باہر نہ ہو، تنگی میں بے حوصلہ، خوشامدی اور ناخوددار نہ ہو، غلبہ میں ظلم اور فساد پر آمادہ نہ ہو جائے۔

ناداری اور افلاس ہی میں صبر و استقامت کا امتحان نہیں بلکہ تموّل اور آسائش میں بھی انسان کے جذبۂ استقامت کے لئے بہت بڑا چیلنج ہوتا ہے۔ دولت کی کثرت بارہا انسان کو متکبر اور بر خود غلط کر دیتی ہے اس لئے امیری کی حالت میں صبر کا دامن تھامے رکھنا اور نیکو کار رہنا بہت بڑے اجر کا پیش خیمہ ہوتا ہے[۱]۔ جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مومن کا معاملہ بھی خوب ہے۔ اس کی ہر بات میں بہتری ہوتی ہے اور یہ بات سوائے مومن کے کسی اور کو حاصل نہیں اگر اس پر اچھا وقت آئے تو وہ شکر ادا کرتا ہے اور اس میں اس کا بھلا ہوتا ہے۔ اگر اس پر سخت وقت آئے تو صبر کرتا ہے اور اس میں اس کا بھلا ہوتا ہے[۲]۔

دولت اور امارت کے ہوتے ہوئے عیاش نہ ہونا اور دنیا کے پھندے میں گرفتار نہ ہونا صرف اصحابِ صبر کا کام ہے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ

---

[۱] دیکھو سورۂ ہود آیت ۹-۱۱ [۲] ریاض الصالحین باب الصبر

علیہ وآلہ وسلم زندگی کے آخری سالوں میں سارے عرب کے فرماں روا تھے تاہم مزاج کے صبر و استقامت کا یہ عالم تھا کہ لوگوں کی حاجتوں کو ہمیشہ اپنی ضرورتوں پر مقدم رکھا۔ کبھی مسلسل دو وقت پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ مہینہ مہینہ بھر گھر میں چولھا نہیں دہکتا تھا[1]

جذبات کے استقلال کے سلسلہ میں عفو کا ذکر بھی ضروری ہے۔ دشمن کو مغلوب کر لینے کے بعد اُس سے عدل کرنا یا اُسے معاف کر دینا صبر کا عین تقاضا ہے۔ قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے کہ بدلہ ہی لینا ہو تو برابر کا بدلہ لو اور اگر معاف کر دو تو صابرین کے لئے یہی بہترین چیز ہے[2] مزید ارشاد ہے کہ جس شخص نے ثابت قدمی دکھائی اور معاف کر دیا تو یہ ایک بڑے عزم کی بات ہے[3] نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ پہلوان وہ نہیں جو دوسروں کو پچھاڑ دے بلکہ وہ ہے جو غصہ کے وقت خود پر قابو پائے[4]

فتح مکہ کے بعد آپؐ نے اپنے خون کے پیاسوں کو بھی معاف کر دیا۔ آپؐ کے چچا حضرت حمزہ رضؓ کا قاتل جب آپؐ کے سامنے آیا تو آپؐ نے اسے امان دے دی۔ جنگ کے بارے میں اسلام کی ہدایات یہ ہیں کہ عورتوں بچوں اور بوڑھوں پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے اور نہ کسی پر نارواظلم کیا جائے۔

اس ضمن میں وضعداری کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اسلام نے ہمیں نہایت شائستہ تہذیب اور آدابِ زندگی عطا کیے ہیں۔ ان سے ملتِ اسلامیہ کا امتیاز قائم رہتا ہے۔ اس لئے ان پر پختہ رہنا چاہیے۔ یہی وضع داری ہے۔ بے صبر اور بے حوصلہ لوگ ہر نئے فیشن کے پیچھے بھاگتے ہیں اور بدنعل

---

[1] صحیح مسلم [2] النحل۔ ۱۲۶ [3] شوریٰ ۴۳ [4] متفق علیہ

کی طرح بے سوچے سمجھے اغیار کی نقالی کرتے ہیں

(دوم) مشکلات اور بے سروسامانی میں تحمل کرتے ہوئے کشائش کا انتظار کرنا:

آدمی مصائب میں گھر جائے اور مقابلہ کی طاقت اور سامان نہ ہو تو بے تاب یا شکستہ دل نہ ہو جائے بلکہ رحمتِ خداوندی سے لو لگائے موافق وقت اور کشائش کا منتظر رہے۔ کلام ربانی میں صبر اکثر انہی معنی میں آیا ہے[1] قرآن حکیم میں یہ بتایا ہے کہ مشرکین کی ایذاؤں پر صبر کرنا انبیاء کا شیوہ رہا ہے[2] یہاں بھی صبر سے یہی مراد ہے۔

دنیاوی مصائب پر آدمی صبر کا اظہار کرے تو ثواب کا موجب ہوتی ہیں اور اگر بے چینی تھڑ دلی اور بے یقینی کا ثبوت دے تو عذاب بن جاتی ہیں۔ اگر کسی بستی میں طاعون پھیل جائے تو اسلام کا حکم ہے کہ وہاں داخل نہیں ہونا چاہیے لیکن جو لوگ اس بستی میں موجود ہوں انھیں وہاں سے بھاگنے کی اجازت نہیں۔ طاعون جنگل کی آگ کی طرح پھیلتا ہے اور اگر لوگ ادھر ادھر بھاگنا شروع کر دیں تو سارے ملک میں جراثیم پھیلا دیں گے۔ اس لئے اسلام طاعون زدہ بستی کے مکینوں کو صبر کر کے وہیں مقیم رہنے کا حکم دیتا ہے۔ اگر کسی کو اس حال میں موت آ جائے تو وہ شہید ہو گا۔

مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ کی رحمت پر یقین رکھتے ہوئے نہایت عزم و ہمت سے ان کا تحمل کرنا چاہیے اللہ تعالیٰ کامیابی کی صورت دکھائے گا۔ ہادیِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ آپؐ فیصلۂ خداوندی کا استقلال سے انتظار کریں کیوں ہماری نگاہیں آپؐ کی پاسبان ہیں[3] ایک اور مقام پر آپؐ سے خطاب

---

[1] ص۔ ۴۴ [2] ابراہیم [3] الطور۔ ۴۸

ہے کہ حضرت یونس (علیہ السلام) کی طرح بے تاب نہ ہو جائیے بلکہ صبر سے کام لیجیے[1]
دشمن آپؐ کے خلاف دل آزار باتیں بناتے تھے لیکن آپؐ کو حکم ملا کہ آپؐ ان کی دروغ
بافی کے مقابلہ پر صبر کا ثبوت دیں[2] مطلب یہ نہ تھا کہ آپؐ تبلیغ سے خاموش ہو جائیں
بلکہ مقصود یہ تھا کہ آپ ان کی ایذا دہی کے سامنے ہمت نہ ہاریں۔

(نبوت کے ساتویں برس آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دشمنانِ دین کے ہاتھوں
تمام خاندان سمیت ایک گھاٹی میں محصور ہونا پڑا۔ تین برس اسی حال پر گذر گئے۔ سب
قریش نے مقاطعہ کر رکھا تھا۔ آپ کے خاندان سے خرید و فروخت اور لین دین
کی ممانعت تھی۔ کلام کا بھی کوئی روادار نہ تھا۔ فاقوں پر فاقے گذر گئے مگر جبین
نبوت پر بل نہ آیا۔ تین برس کی مسلسل صعوبتیں بھی آپ کے قدم نہ ڈگمگا سکیں۔
بالآخر دشمنوں کے ولولے سرد پڑ گئے اور قدغن خود بخود ٹوٹ گیا)

صحابہ کرام رضؓ پر کفارِ مکہ نے لرزہ خیز ستم ڈھائے مگر انھوں نے انتہائی
بے بسی کے عالم میں بھی دل نہ چھوڑا اور نہ ان مصائب سے گلو خلاصی کے لئے عجلت
پسندانہ بے چینی دکھائی۔ ایک دفعہ ایک صحابیؓ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
سے عرض کر بیٹھے کہ آپ خدا سے مدد کیوں نہیں طلب کرتے۔ آپؐ ناراض ہوئے
اور فرمایا، تم سے پہلوں پر یہاں تک گذری کہ انھیں گڑھا کھود کر اس میں کھڑا
کیا گیا اور آرہ سے دو نیم کر دئیے گئے۔ مگر یہ بات انھیں دین سے نہ روک سکی۔
آہنی کنگھیوں سے ان کے گوشت اور پٹھے ادھیڑ دئیے گئے لیکن ▬ دین پر قائم
رہے[3]

---

[1] القلم۔ ۴۸ [2] طٰہٰ۔ ۳ مص۔ ۱۷۔ ق۔ ۳۹۔

[3] ترمذی ابواب الفتن، بخاری۔

راہِ حق میں آبلہ پائی کی جو لذت ہے اس کی کیفیت آشنا ہی ہو سکتے ہیں جنھوں نے اس کی دولت سمیٹی ہے۔ وہ کانٹوں میں اُلجھ کر زندگی کرنے کے کس قدر متوالے ہو جاتے ہیں اس کا کچھ اندازہ حبیبِ خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ان الفاظ سے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے فرمایا کہ تم چاہو تو مکہ کا پہاڑ تمھارے لئے سونا کر دوں۔ میں نے کہا، اے رب! نہیں میں چاہتا ہوں کہ ایک دن کھانا ملے اور ایک دن بھوکا رہوں[1] ارشادِ نبوی ہے کہ سب سے زیادہ آزمائش انبیاء کے لئے ہے۔ پھر درجہ بدرجہ ہر شخص اپنی قوت کے موافق امتحان میں ڈالا جاتا ہے[2] سب سے زیادہ شدائد حبیبِ خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اٹھائے ہیں۔

دنیا کی ہر تکلیف گناہ کو دھوتی ہے۔ ہر دشواری اور ہر بلا مردانِ کار کے لئے دعوتِ عمل اور وسیلۂ قربِ الٰہی ہے۔ یہیں ان کے صبر کے جوہر کھلتے ہیں اور وہ دنیا و آخرت میں سُرخرو ہوتے ہیں۔ ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جنت مشکلات کے پردہ میں لپٹی ہوئی ہے[3]

اسلام مصائب کے دوران تحمل کا حکم دیتا ہے۔ فرار کی اجازت نہیں دیتا۔ دکھوں سے چھٹکارا پانے کے لئے موت کی آرزو ممنوع ہے اور خودکشی حرام ــــ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی معیت میں جہاد کیا اور زخم کھایا۔ وہ زخم کا درد نہ سہہ سکا اور رات کو خودکشی کر لی۔ حضورؐ نے فرمایا، یہ جہنم میں جائے گا[4]

عزیزوں کی موت سے دل کو زبردست صدمہ پہنچتا ہے لیکن ایسے میں بھی

---

[1] ترمذی ابواب الزہد [2] ایضاً [3] مسلم کتاب الجنۃ۔ بخاری کتاب الرقاق۔
[4] مسلم کتاب الایمان۔

صبر و رضا کے اظہار کا حکم ہے۔ میت پر چیخنا پکارنا اور اپنے کو زدو کوب کرنا حرام ہے۔ دل کے جذبات کو کون مٹا سکتا ہے، لیکن بے صبری سے گریز کرنا چاہیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے صاحب زادے جان کندن کی حالت میں تھے۔ آپؐ نے انھیں اٹھایا تو آپؐ کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے تاہم زبان سے صرف یہی فرمایا کہ آنکھیں اشک ریز ہیں اور دل غمگین ہے لیکن ہم زبان سے وہی کہیں گے جو اللہ کو منظور ہے[1] آپؐ عورتوں سے بیعت میں یہ عہد لیا کرتے تھے کہ نوحہ نہیں کریں گی[2]

مفلسی انسان کا پیمانۂ صبر لبریز کر دیتی ہے اور اخلاقی بندشوں کو توڑنے پر اکساتی ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو جو چیز آمادۂ گناہ کرتی ہے وہ دراصل مفلسی نہیں طمع ہے جسے اللہ تعالیٰ کے صاحب عزم بندے عین فقر و فاقہ میں بھی دبائے رکھتے ہیں اور قناعت اور خود داری پر قائم رہتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا قول ہے کہ مفلس وہ نہیں جس کے پاس مال نہ ہو بلکہ وہ ہے جس کے پاس قیامت کے روز کوئی نیکی نہ ہوگی[3] آپؐ کا فرمان ہے کہ اس شخص نے فلاح پائی جو صاحب ایمان ہوا، اس نے ضرورت بھر رزق پایا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو قناعت دی[4]

حضرتِ اسماعیلؑ کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہوئی کہ مجھے شکستہ دل بندوں کے پاس تلاش کرو۔ حضرتِ اسماعیلؑ نے پوچھا، یا اللہ! وہ کون لوگ ہیں؟ جواب ملا، صابر فقراء۔

---

[1] مسلم ۲: ۲۰۶۔ [2] مسلم کتاب الجنائز [3] مسلم
[4] ترمذی ابواب الزہد۔

(سوم) حالات تقاضا کریں تو دشمن کے مقابلہ پہ جان کی بازی لگا دینا:

سر و سامان میسر ہو تو دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے۔ بزدلی دکھانا مشرکانہ فعل ہے[1] قرآن حکیم ان لوگوں کو جو میدانِ جنگ سے فرار کرتے ہیں، عذابِ جہنم کی خبر دیتا ہے[2] حکم ہے کہ تم اپنے سے دس گنا فوج پر غالب نہیں آتے تو کم از کم دو گنا کے مقابل تو ضرور ڈٹ جاؤ[3]

قرآن حکیم نے متقی بندوں کی ایک صفت یہ بتائی ہے کہ وہ میدانِ جنگ میں ثابت قدمی دکھاتے ہیں[4] جلوۂ حق کے خواستگاروں کا ذکر قرآنِ حکیم میں یوں آتا ہے کہ یہ صبر کے خزینہ دار حق کی خاطر جہاد کرتے ہیں اور راہِ حق میں سستی اور کمزوری نہیں دکھاتے[5]

جہاد میں ثابت قدم رہنے کا انعام جنت ہے[6] جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جنگ کی تمنا نہ کرو اور امن کے خواہاں رہو لیکن جنگ آ پڑے تو ثابت قدم رہو اور جان لو کہ جنت تلواروں کے سایہ تلے ہے[7] ایک صحابیؓ نے آپ سے پوچھا کہ اگر میں جہاد میں مارا جاؤں تو کیا میرے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ آپؐ نے فرمایا، ہاں! بشرطیکہ تم صابر، طالبِ ثواب اور پیش قدم رہے[8]

سالارِ انبیاء صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک ایک معرکہ میں دشمن کے طوفانی زور و شور کے آگے جس شجاعت اور ثابت قدمی کا ثبوت دیا ہے دنیا کی تاریخ میں

---

[1] سورۃ النحل ۔ ۱۱ [2] سورۃ الانفال ۔ ۱۶ [3] سورۃ الانفال ۶۵، ۶۶ [4] سورۃ بقرہ ۱۷۷ [5] آل عمران ۔ ۱۴۶ [6] آل عمران ۱۴۲ [7] ریاض الصالحین باب الصبر [8] ریاض الصالحین باب تحریم الظلم۔

اس کا جواب نہیں ۔ خندق کی جنگ میں تقریباً چوبیس ہزار مشرکین نے مدینہ کو پندرہ روز تک محاصرے میں لئے رکھا ۔ مسلمان مجاہدین کی تعداد تین ہزار کے لگ بھگ تھی ۔ موسم سخت خراب تھا اور رسد کی کمی کا یہ حال تھا کہ کئی کئی روز فاقے سے گذر گئے لیکن آپ نے ہمت نہ ہاری ۔ دشمن آخر موسم کی سختی اور غلہ کی کمی سے بد دل ہو کر واپس چلا گیا اور اس طرح اہل اسلام کے صبر اور استقامت کے بدولت مشرک حملہ آوروں کو رسوا کن ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ۔ آئندہ انھیں مدینہ پر حملہ کی جرأت نہ ہوئی ۔

حُنین کے معرکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فوج پہلے ریلہ میں تتر بتر ہو گئی اور آپ کچھ دیر تک تنہا رہ گئے لیکن ایسے میں بھی اپنے خچر کو عین تیروں کی بوچھاڑ میں دشمن کی سمت بڑھاتے رہے ۔ آپ کے اس لرزہ فگن استقلال نے دشمن کو شکست کی راہ دکھائی ۔

(چہارم) نیک عمل کا دوام :

حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو انسان کا وہ عمل سب سے زیادہ محبوب ہوتا ہے جس پر وہ دوام رکھے چاہے وہ عمل قلیل ہی کیوں نہ ہو[1] ۔

قرآن حکیم میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد ہے کہ اپنے اہل خانہ کو نماز کی ہدایت کیجئے اور اس بات پر پختہ رہیے[2] ۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کیجئے اور اس پر جمے رہیے[3] ۔

(پنجم) عمل کے ثمرہ اور دعا کے قبول کا اقرار و اطمینان سے انتظار کرنا :

---

[1] مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۸۹ [2] طٰہٰ ۱۳۲ [3] مریم ۶۵

کم ظرفی، تھڑدلی اور بے تابی زندگی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹیں ثابت ہوتی ہیں۔ بے صبر اور عجلت پسند آدمی نہ صرف اپنے دنیاوی کام بگاڑ دیتا ہے بلکہ بارہا آخرت کا زیان بھی کر جاتا ہے۔ اس لئے اسلام اپنے پیرودں کو تلقین کرتا ہے کہ اعمال کے نتائج اور دعا کے اثر کے لئے بے تاب و بے قرار نہ ہوں بلکہ کشادہ دلی اور فراخ حوصلگی سے انتظار کریں۔ سورۃ الاحقاف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب ہے کہ آپؐ اولوالعزم پیغمبروں کی طرح صبر دکھائیں اور (انجام کفار) کے لئے عجلت کا تقاضا نہ کریں۔ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ مسلمان کی ہر دعا قبول ہوتی ہے بشرطیکہ وہ قبول کے لئے بے قراری نہ دکھائے۔[1]

بارہا ہم کسی فاجر اور بے اصول شخص کو دیکھتے ہیں کہ وہ زندگی میں پھل پھول رہا ہے اور تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے اور پھر ادھر اپنے حال پر نظر کرتے ہیں کہ دیانت اور اصول پرستی کے باوصف بعض مرادوں سے محروم ہیں تو صبر کے آبگینہ کو ٹھیس لگتی ہے لیکن ہمیں یہ بات ہمیشہ ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ جو مراتب دیانت داری سے حاصل کئے جاتے ہیں وہ دیرپا ہوتے ہیں۔ بدعمل لوگوں کے مرتبے جلد یا بدیر چھن جاتے ہیں اور ان کا عبرت ناک انجام ہوتا ہے۔ خدا پرست آدمی بے شک آئے دن زمانے کے حادثات سے دوچار رہتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ اسے رسوائی اور زوال سے بچائے رکھتا ہے۔ جنابِ ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مومن کی مثال کچی فصل کی ہے۔ ہوا جدھر سے آئے اسے جھکا دیتی ہے۔ جب ہوا رکتی ہے تو فصل سیدھی ہو

---

[1] ترمذی۔ بخاری کتاب الدعوات

جاتی ہے۔ فاجر شخص کی مثال شمشاد کی ہے جو سخت اور سیدھا کھڑا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جب چاہے اسے اکھاڑ دیتا ہے[1]۔ حضور کا ارشاد ہے کہ مسلم کی ہر دعا قبول ہوتی ہے ورنہ اس کے برابر اس کے سر پر آنے والی مصیبت ٹل جاتی ہے[2]۔

۱۔ صبر کی برکات بہت وسیع ہیں:

ثمرات صبر کے بے اندازہ ثمرات ہیں۔ سورۃ الزمر میں ارشاد ہے:

اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ۝

(صرف صبر والوں ہی کو ان کا اجر بغیر شمار کے ملتا ہے)

اس آیت کا ایک یہ مفہوم بھی ہے کہ اخلاق کی کوئی فضیلت صبر کے برابر نہیں۔ صبر کی برکتوں کا کوئی کنارا نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ صبر سے واسع تر کوئی شے نہیں[3]۔ آپ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی چاہتا ہے اسے مصیبت میں ڈال دیتا ہے[4]۔

۲۔ صبر عبادت ہے:

صبر بندگی کا خوبصورت ترین زیور ہے اور رضا و تسلیم کی ایک درخشاں علامت ہے۔ مشکلات گھیر لیں اور آدمی اللہ تعالیٰ پر متوکل رہ کر ان کا پامردی سے مقابلہ کرے اور اللہ کی نصرت کا منتظر رہے تو اس سے بڑھ کر بندگی اور خود سپردگی کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ ارشاد نبوی ہے کہ:

---

[1] بخاری کتاب المرضیٰ [2] ترمذی ابواب الدعوات [3] ترمذی کتاب المرضیٰ

کشادگی کا انتظار سب سے افضل عبادت ہے[1]

۳۔ صبر کامیابی کی ضمانت ہے:

بڑی سے بڑی مشکل یا مہم آپڑے لیکن آدمی صبر و استقامت سے اس کا مقابلہ کرتا رہے تو بالآخر کامیاب ہو جاتا ہے۔ جہاد کا میدان ہو یا صنعت و حرفت کی دنیا یا علم و حکمت کی جولاں گاہ، جس جگہ بھی صبر کا دامن پختگی سے تھام رکھا جائے وہاں کامیابی قدم چومتی ہے لہٰذا قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

اَنَّ النَّصْرَ مَعَ الصَّبْرِ

(یعنی اللہ کی مدد صبر والوں کے ساتھ ہوتی ہے)

ایک اور مقام پر قرآن حکیم میں ارشاد ہے کہ صبر اور دعا کے ساتھ اللہ کی مدد طلب کرو۔ وہ یقیناً صابرین کا ساتھ دیتا ہے۔

جن لوگوں کو صبر و حوصلہ کی دولت نصیب ہوتی ہے وہ مشکل کو مشکل نہیں سمجھتے انھیں زندگی کا نقصان پریشان نہیں کر سکتا اور وہ کسی دکھ کے ہاتھوں نحیف و نزار نہیں ہوتے۔ وہ مشکلات میں بھی مسکراتے ہیں اور زندگی کی ہر آزمائش میں انکا دل کشادہ رہتا ہے۔ ایسی ہی حالت کے بارے میں ارشادِ ربانی ہے:

وَاَنَّ الْفَرَجَ مَعَ الْکَرْبِ وَاَنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا

(اور یقیناً دکھ کے ساتھ کشائش ہے اور تنگی کے ساتھ آسانی ہے)

۴۔ صبر سے گناہ دھلتے ہیں:

صبر کی کامیابیاں صرف اسی زندگی کے لیے نہیں بلکہ آخرت کے لیے بھی ہیں۔

---

[1] ترمذی ابواب الدعوات

زندگی کے آلام اور مصائب سے کون بھاگ سکتا ہے؟ لیکن ایمان دار لوگوں کے لئے یہی آلام اللہ تعالیٰ کی رحمت بن جاتے ہیں۔ ہر دکھ کے عوض ان کا کوئی نہ کوئی گناہ مٹتا ہے۔ جو لوگ بے صبر ہوں اور مصائب پہ بے چینی کا اظہار کریں اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہو جائیں ان کے لئے دنیا کا ہر دکھ آخرت کے لئے بھی ایک دکھ کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔ حضرت عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کا قول ہے کہ صبر نہ ہو تو افلاس اور بیماری عذاب ہیں اور صبر ہو تو انعام و اکرام۔

حدیثِ قدسی ہے کہ جب میں اپنے مومن بندے کی کسی محبوب شے کو اس سے لے لیتا ہوں اور وہ اس پر صبر کرتا ہے تو میں اسے جنت سے نوازتا ہوں[1]۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مومن پر جب بھی کوئی سختی یا بیماری یا پریشانی یا رنج یا ایذا یا غم آئے بلکہ اسے کانٹا بھی چبھے تو اللہ تعالیٰ اس کے عوض اس کی کچھ خطائیں معاف کر دیتا ہے۔ اس سلسلہ میں آپؐ کا مزید ارشاد یہ ہے کہ مومن پر مال و اولاد کی آزمائشوں کا تانتا بندھا رہتا ہے حتیٰ کہ جب وہ اللہ تعالیٰ کے پاس جاتا ہے تو اس کی کوئی خطا باقی نہیں رہتی[3]۔

۵۔ صبر والوں کو جلد جنت نصیب ہوگی!

انتظار کے لمحے طویل ہوتے ہیں لیکن جو شخص اس دنیا میں نیکی پر ثابت قدم رہے اور فراخ دلی سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب کا منتظر رہے آخرت میں اس کو اجر کا انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ فقر والے مہاجرین دولت مند مہاجرین سے پانچ سو برس قبل

---

[1] ریاض الصالحین باب الصبر۔ [2] بخاری کتاب المرضیٰ

[3] ریاض الصالحین باب الصبر۔

جنت میں داخل ہوں گے[1]

---

[1] ترمذی۔

تحمّل

مفہوم تحمل کا مادہ حمل ہے جس کے معنی ہیں: اٹھانا۔ تحمّل کے لغوی معنی ہیں: اٹھانا، برداشت، بردباری۔ یہ اس کے خاص معنی ہیں۔ اس کے عام معنی میں نرمی اور تواضع بھی شامل ہیں۔

تفصیلی نگاہ سے دیکھا جائے تو تحمل کے مندرجہ ذیل مفہوم متعین ہوتے ہیں:—

(۱) زندگی کے فرائض خوشی سے سنبھالنا۔

(۲) مشکلات کو عزم و ہمت سے برداشت کرنا۔

(۳) جلد بازی نہ کرنا۔

(۴) معاشرہ سے اگر کوئی ایذا پہنچے تو تنگ دل یا نالاں نہ ہونا۔

(۵) نرمی اور تواضع سے پیش آنا۔

صبر اور تحمّل میں فرق

تحمل صبر کا ایک جزو ہے۔ صبر میں معنوی وسعت بہت زیادہ ہے۔ یہ ساری زندگی کو حاوی ہے اور ہر حال میں اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ تحمل کی اس قدر وسعت نہیں۔

تحمل ہمیشہ سہارے اور برداشت کا تقاضا کرتا ہے۔ صبر ضرورت پڑنے پر مقابلہ اور غلبہ کی دعوت دیتا ہے۔

تحمل کے لئے بھی اگرچہ ثابت قدمی ضروری ہے لیکن اس کے لئے ثابت قدمی صرف شرط کا حکم رکھتی ہے۔ صبر میں ثابت قدمی رُکن ہے۔

تحمل کے مراتب

تحمل کا ادنیٰ مرتبہ یہ ہے کہ آدمی اپنی طبیعت پر جبر کرنا سیکھے۔ اس کا بلند ترین درجہ یہ ہے کہ طبیعت میں برداشت کا ملکہ اس حد تک رچ جائے کہ بڑی سے بڑی مصیبت یا ناگوار واقعہ کو بغیر کسی تکلف یا جبر کے برداشت کر لیا جائے۔ چہرے پر پریشانی یا تکدر کا کوئی اثر نمودار نہ ہو۔

تحمل کے بغیر فرض ادا نہیں ہو سکتا:

اہمیت

انسان کا مرتبہ دیگر مخلوقات سے فائق ترین ہے۔ اس لئے اس کی ذمہ داریاں بھی بڑھ چڑھ کر ہیں ان ذمہ داریوں کو جبھی نباہا جا سکتا ہے کہ آدمی انھیں دل کی خوشی سے اختیار کرے۔

انسان اس زمین پر اللہ تعالیٰ کا نائب ہے اس نیابت کو قرآن حکیم نے امانت کا نام دیا ہے۔ سورۂ احزاب میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ امانت پہلے زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی لیکن وہ ڈر گئے اور اسے قبول نہ کیا۔ انسان نے اسے اٹھا لیا۔ یہ ذمہ داری ہزار در ہزار ذمہ داریوں کا سرچشمہ ہے۔

اپنے فرائض کو خوشی سے سنبھالنا اور ان کی بجا آوری کے لئے ہمہ تن آمادہ رہنا عین تحمل ہے۔ تحمل نہ ہو تو انسان اپنی ذمہ داریوں سے پہلو تہی کرنے لگتا ہے اور اسے آہستہ آہستہ ہر حقیقت سے فرار کرنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ وہ اپنے لئے بے وقوفوں کی جنت بسا لیتا ہے۔ دشمن اسے مٹانے کے لئے

سر پر آکھڑا ہو تو ایسے میں بھی اپنے دل کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ مصیبت خود بخود ٹل جائے گی۔ اس کی ایک نمایاں مثال عباسی عہد کا خلیفہ امین ہے جو آخر دم تک خوش فہمیوں میں مبتلا رہا اور پھر اچانک ہلاکت کے منہ میں جا پہنچا۔

تحمل نشیب و فراز میں سنبھالتا ہے

کون ہے جسے ساری زندگی میں عروج یا چین نصیب ہوا ہے۔ زندگی کروٹ بدلتی ہی رہتی ہے۔ آج عروج ہے تو کل زوال اور آج خوشی ہے تو کل ماتم۔ تحمل انسان کو اس قابل بنائے رکھتا ہے کہ اس پر زوال کے دن آجائیں تو مایوس اور نیم مردہ نہ ہو جائے اور نہ اس کے دل کی حرکت بند ہو بلکہ وہ حوادث کو مردانہ وار سہہ سکے۔

نرم مزاجی معاشرتی زندگی کے لئے لازم ہے:

تحمل کی مذکورہ بالا اہمیت اس کے لغوی معنی کے اعتبار سے ہے۔ عام معنی یعنی بردباری، نرم مزاجی اور تواضع کے اعتبار سے بھی یہ نہایت اہم ملکہ ہے۔ اگر انسان میں تحمل نہ ہو تو وہ معاشرہ میں گزر نہیں کر سکتا۔ نازک مزاجی انسان کو اس قابل نہیں رہنے دیتی کہ دیگر لوگوں کی کوتاہیوں یا لغزشوں پر صبر کر سکے۔ بات بات پر الجھ کر تعلقات توڑنے والے کے لئے معاشرہ میں کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ وہ قوم و ملت کی خدمت نہیں کر سکتا۔ اس لئے اسلام میں یہ وضاحت ہے کہ وہ مومن جو دیگر لوگوں کی ایذاؤں پر صبر کر کے ان میں مقیم رہتا ہے وہ اس شخص سے اچھا ہے جو ایذاؤں سے بھاگ کر کنج تنہائی میں جا بیٹھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی ایک صفت یہ بتائی ہے کہ وہ اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْن ہوتے ہیں۔ اَذِلَّۃٌ جمع ہے ذلیل کی۔ ناظرین کو یہ پڑھ کر حیرت ہو گی کہ ذلیل

کا لفظ عربی میں اچھے معنی بھی دیتا ہے یعنی متحمل و بردبار۔ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ کے الفاظ بتلاتے ہیں کہ مسلمان مسلمان کے ساتھ بُردبار ہو کر رہتا ہے۔ ایک اور آیت میں آیا ہے کہ مسلمان رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ ہیں یعنی ایک دوسرے کے لئے سراپا رحمت ہیں۔

تحمل اور ارباب اقتدار:

تحمل کی ضرورت ویسے تو ہر شخص کو ہوتی ہے لیکن اس کی سب سے زیادہ اہمیت ارباب اقتدار کے لئے ہے۔ اقتدار کو کھلی ڈھیل دے دی جائے تو اس میں تکبر کا غلبہ ہو جاتا ہے اس لئے ارباب اقتدار کو تحمل سے متصف رہنا چاہیے تاکہ وہ عوام سے قریبی تعلق رکھ سکیں، عوامی مسائل سے آگاہ رہیں اور لوگوں کی شکایات اُن تک بے روک ٹوک پہنچیں۔

تحمل اور عوام:

عوام کو بھی ارباب اقتدار کے معاملہ میں تحمل سے کام لینا چاہیے اگر کسی حاکم سے غلطی ہو جائے تو اسے اصلاح کا موقع دینا چاہیے۔ بغاوت سے پرہیز کرنی چاہیے ورنہ ملک کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچتا ہے۔

تحمل کی تربیت

تحمل کی تربیت زندگی کے کارزار ہی میں ہو سکتی ہے۔ عیش و عشرت کے شبستانوں میں رہ کر فلسفۂ اخلاق کی ہزار کتابیں پڑھ لی جائیں اس وقت تک تحمل کی تربیت نہیں ہو سکتی جب تک زندگی کے تھپیڑوں سے واسطہ نہ پڑے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد ہے:

حلیم وہ ہے جس نے ٹھوکر کھائی ہے اور صاحب حکمت وہ ہے جسے تجربہ حاصل ہے[۱]

---

[۱] مشکاۃ باب الحذر

علامہ اقبالؔ فرماتے ہیں:

تو سلامت محمل شاہی کی ہمراہی میں ہے
عشق کی لذت مگر خطروں کی ہمراہی میں ہے

اسلام تن آسانی اور سہل کوشی کا روادار نہیں۔ اسی لئے مرد کے لئے ریشمی لباس ممنوع ہے۔ حضرت عمر فاروق رضؓ نے فوجی تربیت کے سلسلہ میں پیدل چلنا اور دھوپ میں پھرنا لازم قرار دیا تھا۔ جس گورنر کے خلاف شکایت آتی کہ وہ نرم لباس پہنتا ہے یا باریک آٹے کی روٹی کھاتا ہے اسے معزول کرکے سزا دیتے تھے۔

تحمل کی شروط

(۱) دل کی قوت:

تحمل جبھی پیدا ہو سکتا ہے کہ دل قوی ہو۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ:

قوی مومن ضعیف مومن کے مقابلہ میں بہتر ہے اور اللہ تعالیٰ کو عزیز تر ہے۔

بعض علماء نے یہاں قوی کے معنی یہ بتائے ہیں کہ وہ لوگوں کی ایذاؤں کا تحمل کرکے ان سے میل جول رکھتا ہے اور ان کو نیکی کی طرف رہنمائی کرتا ہے لہٰذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تحمل کے لئے دل کی قوت لابدی ہے۔

(۲) دل کی رضا:

تحمل کے لئے دل کی رضامندی ضروری ہے ورنہ اسے تحمل کے بجائے جبر کہیں گے جس میں کوئی فضیلت نہیں۔ اگر کوئی کام دباؤ یا ناخوشی سے انجام

---

۵ دلیل الفالحین باب فی البجا ہدہ

دیا جائے تو اس کا پورا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کو طاعت بھی کہتے ہیں۔ طاعت کے لغوی معنی ہیں وہ کام جو دل کی خوشی سے انجام دیا جائے۔

(۳) اعترافِ حقیقت:

تحمل کے لئے ضروری ہے کہ انسان زندگی کے حقائق کا اعتراف کرے مثلاً بڑھاپے کا کوئی علاج نہیں، نازل ہو کر رہتا ہے لیکن بعض لوگ اس سے فرار کرنا چاہتے ہیں اور سفید بال اکھاڑ کر یا خضاب سے کالے کر کے جوان بنے پھرتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ زندگی کے ٹھوس تقاضوں کو ہمیشہ ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو دم گزر جائے غنیمت ہے۔ یہ معرکہ کے تصور ہی سے کانپ اٹھتے ہیں اور [illegible] کے آگے فوراً ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔

تحمل کے تقاضے

گزشتہ اوراق میں ہم دیکھ آئے ہیں کہ تحمل کے پانچ بنیادی مفہوم ہیں۔ یہی پانچ مفہوم اس کے تقاضے بھی ہیں جن پر ہم ذیل میں الگ الگ بحث کریں گے:۔

(۱) زندگی کے فرائض کو دل کی خوشی سے سنبھالنا:

انسان پر خاندان، معاشرہ، ملک اور دین کی طرف سے بے شمار فرائض عائد ہوتے ہیں۔ ان فرائض کے لئے اپنے اندر اہلیت پیدا کرنی چاہیے۔ اور ان کا بوجھ اٹھانے کے لئے دل کی خوشی سے تیار رہنا چاہیے۔ جہاد کا وقت ہو تو کوئی آدمی کوتاہی نہ کرے۔ خدمتِ خلق میں جہاں تک ہو سکے حصہ لیا جائے۔ نیکی کی اشاعت اور بدی کے قلع قمع میں پوری کوشش کرنی چاہیے۔ قومی بہبود کو اپنی بہبود کی طرح عزیز جاننا چاہیے اور بغیر کسی صلہ و ستائش کی تمنا کے قومی خدمات میں حصہ لینا چاہیے۔ جس قوم میں یہ وصف نہ ہو وہ کبھی کامیابی کی منزل

سے ہم کنار نہیں ہو سکتی۔

بعض لوگوں کے دل میں یہ خیال بیٹھ جاتا ہے کہ قومی امور کے لئے صرف حکومت ہی ذمہ دار ہے۔ ہمیں فکر نہیں کرنی چاہیے۔ یہ رجحان نہایت تباہ کن ہے۔ ہر آدمی کو جب بھی موقع ملے قومی فلاح کے کام میں شریک ہونا چاہیے۔

اسلام کے آغاز میں لوگ ہر قومی خدمت کو دینی خدمت سمجھتے تھے اور سرکاری کام بھی بغیر کسی تنخواہ کے محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے انجام دیتے تھے۔ حضرت عمرؓ کا زمانہ آیا تو انھوں نے سب سرکاری ملازموں کو تنخواہیں لینے پر مجبور کیا۔ یہ جذبہ ہر مسلمان کے دل میں موجود رہنا چاہیے۔

ذمہ داریوں کے تحمل کے سلسلہ میں دو باتیں مدِ نظر رہیں۔

(اوّل) عہدوں اور اعزاز کی لالچ دل میں نہ ہو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس شخص کو جو خود کسی عہدہ کا طلبگار یا حریص ہوتا تھا عہدہ نہیں دیتے تھے۔

(دوم) کوئی ایسا بوجھ نہیں اٹھانا چاہیے جو اپنی طاقت سے زیادہ ہو ورنہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے اور اس سے بارہا ہمت سرد پڑ جاتی ہے یا قوم کو نقصان پہنچتا ہے۔ ایک دفعہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مومن کو زیبا نہیں کہ وہ اپنے کو ذلیل کرے۔ صحابہؓ نے پوچھا، حضور! وہ کیوں کر اپنے کو ذلیل کرتا ہے؟ فرمایا، وہ ایسی آزمائش کو چیلنج کرتا ہے جس کی اس میں طاقت نہیں ہوتی۔[1] ایک صحابیؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کسی عہدہ کی درخواست کی۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ امانت ہے اور یہ قیامت کے روز رسوائی اور

---

[1] مشکوٰۃ باب جامع الدعاء

ندامت بن کر سامنے آئے گی سوائے اس شخص کے جو اس کا اہل ہے اور اسے پوری طرح نباہتا ہے۔[1]

قوم کی طرف سے جو عہدہ یا خدمت سونپی جائے اس کا پوری طرح احساس رکھنا چاہیے۔ غفلت یا تن آسانی تحمل کے بالکل متضاد ہیں۔ عہدہ کی ذمہ داری کو پوری طرح قبول کرنا اور پھر اس کی بجا آوری کے لئے پوری توجہ اور کوشش صرف کرنا ہی عین تحمل ہے۔

انفرادی یا قومی ذمہ داریوں سے فرار کرنا مسلمانوں کا شیوہ نہیں۔ مثلاً بالغ ہونے کے بعد ہر مسلمان کو گھر بسانے کی طرف توجہ کرنی چاہیے جو آدمی استقامت کے باوجود نکاح سے گریز کرتا ہے وہ ایک دینی ذمہ داری سے گریز کرتا ہے۔

(۲) مشکلات اور مصائب کی برداشت :

زندگی میں جو مشکلات یا مصائب پیش آئیں انھیں ہمت و حوصلہ سے برداشت کرنا چاہیے۔ جو آدمی مصیبت کی سہار نہ رکھتا ہو اس سے کسی ایمانداری، وفاداری یا بڑے کارنامہ کی توقع نہیں ہو سکتی۔

اسلام کے آغاز کی داستان پڑھی جائے تو معلوم ہو گا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اسلام کی راہ میں کس قدر دل دوز مصائب اٹھائے لیکن اسلام سے منہ نہ موڑا۔ ان کی قربانیاں آخر رنگ لائیں اور اسلام سارے عرب پر چھا گیا۔

ہجرت کے چوتھے برس کا قصہ ہے کہ ایک صحابی حضرت زید نامی کفارِ مکہ کے ہاتھ میں گرفتار ہو گئے۔ وہ انھیں شہید کرنے کے لئے قتل گاہ میں لے کر چلے

---

[1] ریاض الصالحین باب النہی عن سوال الامارۃ

تو ابو سفیان نے جو اس وقت کافر تھے حضرت زید رضؓ سے پوچھا، تمھیں خدا کی قسم! سچ سچ بتاؤ کیا تم نہیں چاہتے کہ اس وقت تمھاری جگہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) ہوں، ہم حضورؐ کا سر قلم کریں اور تم اہل وعیال میں بیٹھے رہو۔ زید رضؓ نے جواب دیا کہ مجھے تو یہ بھی قبول نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاؤں میں کانٹا چبھے اور میں آرام سے گھر میں بیٹھا رہوں۔

تحمل کی اسلام میں بڑی بڑی ایمان پرور مثالیں ملتی ہیں۔ حضرت حسین رضؓ نے کربلا کے میدان میں تحمل کی جو مثال قائم کی ہے وہ صرف مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ سب انسانیت کے لئے سرچشمۂ درس ہے۔

امیر عبدالرحمٰن مرحوم والی کابل کو ہر وقت اپنے ملک کی فکر رہتی تھی۔ ایک دفعہ ان کی ٹانگ کے اپریشن کی ضرورت ہوئی۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ آپ کو دو گھنٹے تک بے ہوش رکھنا پڑے گا۔ امیر نے کہا کہ میں اتنی دیر تک اپنے ملک کی فکر سے آزاد نہیں رہ سکتا۔ تم ہوش کی حالت ہی میں آپریشن کرو۔ ڈاکٹروں نے آپ کی ٹانگ کو چیرا پھاڑا اور امیر نے اُف تک نہ کی۔

(۲) جلد بازی نہ کرنا:

تحمل کا تقاضا ہے کہ آدمی کسی چیز کی خاطر جلد بازی یا عجلت نہ کرے۔ وقار و سکینت اور ضبط و قرار مومن کا خاصہ ہے جس سے کسی حالت میں دستبردار نہیں ہونا چاہیے۔

اگر کوئی کام سونپا جائے تو اسے جلد جلد اوندھے پوندھے ختم کر کے سر سے ٹالنا نہیں چاہیے۔ اس سے کام کاج میں دلچسپی نہیں رہتی اور آدمی فرائض سے پیچھا چھڑانے کا عادی ہو جاتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ تحمل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور عجلت بازی شیطان کی طرف سے ہے[1]

---

[1] مشکاۃ

اسلام میں ضبط و تحمل کی اس قدر تلقین ہے کہ اگر نماز با جماعت کا وقت بھی نکل رہا ہو تو بھاگ کر مسجد میں جانے کی اجازت نہیں۔

ایک دفعہ عربوں کا ایک وفد جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ لوگ جب مدینہ آئے تو نہایت عجلت سے حضورؐ کی خدمت میں پہنچے۔ ان میں ایک صاحب اُشج نام تھے۔ انھوں نے تحمل سے کام لیا۔ سواریوں کے پاس کچھ دیر رک گئے۔ ان کا سامان سنبھالا، اپنی اونٹنی کے گھٹنے باندھے، عمدہ لباس پہنا اور پھر بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوا۔ حضورؐ نے اسے اپنے پاس بٹھایا اور اثنائے کلام میں فرمایا، تم میں دو خصلتیں ایسی ہیں جو اللہ کو بہت محبوب ہیں یعنی حلم اور تحمل[۱]

اللہ تعالیٰ کی راہ میں مشکلات کا ہجوم ہو جائے تو اس بات کے لئے بیتاب نہیں ہونا چاہیے کہ ہمارے حق میں جلد فیصلہ کیوں نہیں ہو رہا۔

(۴) معاشرہ — اگر کوئی ایذاء پہنچے تو تنگ دل یا نالاں نہ ہونا:

بارہا معاشرہ کے بعض افراد کی طرف سے ناحق تکلیف پہنچتی ہے۔ انسان کو چاہیے کہ اس تکلیف یا ایذاء پر بے حوصلہ نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اس کو خوشی سے برداشت کرے۔

سورۂ فرقان میں اللہ تعالیٰ کے مخلص بندوں کی ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے۔

اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا۔

---

[۱] ریاض الصالحین باب الحلم۔

(جب اکھڑ لوگ انھیں مخاطب کریں تو یہ سلام کہہ دیں)
مراد یہ ہے کہ اہلِ ایمان جاہلانہ حرکت کا جواب ویسی ہی حرکت سے نہیں دیتے۔ کوئی اکھڑ شخص ان سے تیز کلامی کرے تو نرمی اور ملائمت سے جواب دیتے ہیں۔ ان سے الجھتے نہیں بلکہ ان کے اکھڑپن کو فراخ دلی سے برداشت کرتے ہیں اور سلام کہہ کر اپنی راہ لیتے ہیں۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب تبلیغ پر روانہ ہوتے تو ابولہب آپؐ کے پیچھے پیچھے چلتا، آپؐ پر مٹی پھینکتا اور لوگوں سے کہتا کہ دیکھو اس کے ہاتھوں اپنے باپ دادا کا دین نہ چھوڑنا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دعوتِ توحید میں مگن رہتے اور ابولہب کی طرف توجہ تک نہ کرتے۔

کفارِ مکہ کی بدتمیزی کا یہ عالم تھا کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر جاکر ہنڈیا میں گندگی ڈال دیتے یا دروازہ پر غلاظت بکھیر دیتے۔ آپ فقط اتنا کہہ کر چپ رہ جاتے: اے بنو عبد مناف! یہ کیسا پڑوس ہے!

امام ابوحنیفہ ایک دفعہ مکہ کی ایک مجلس میں بیٹھے تھے کہ ایک شخص منہ ڈھانپے آیا اور امام کو فحش گالی دے کر کہا کہ تم سے فلاں مسئلہ کے بارے میں پوچھا گیا اور تم نے حسن بصری کی رائے کے خلاف فتویٰ دیا۔ آپ نے جواب دیا کہ حسن بصری نے غلطی کی تھی۔ وہ شخص مزید بدزبانی کرنے لگا۔ آپ کے اصحاب اسے مارنے اٹھے۔ آپ نے منع کیا اور گالیاں دینے والے سے فقط اتنا کہا کہ ہاں اس مسئلہ میں عبداللہ بن مسعودؓ کا فتویٰ درست اور حسن بصری کا فتویٰ غلط ہے۔

(۵) نرمی اور تواضع سے پیش آنا:
تحمل کا تقاضا ہے کہ ہر آدمی سے نرمی اور تواضع کا سلوک رکھا جائے۔

تحمل کا کمال یہ ہے کہ اکھڑ اور ایذا رساں شخص سے بھی نرمی کی جائے۔ قرآن شریف میں حکم یہ ہے کہ برائی کا جواب بھلائی سے دو۔

طبیعت کو تحمل کا اس قدر خوگر ہو جانا چاہیے کہ ناگوار باتوں کو بے تکلف فراخ دلی سے برداشت کر جائے۔ بات بات پر لوگوں سے الجھنا اور بدخوئی کرنا درست نہیں۔ اس سے اعصاب اور ذہنی صحت پر برا اثر پڑتا ہے اور رسوائی ہوتی ہے۔

بعض لوگ اپنے نظریات کے خلاف کوئی بات سننا گوارا نہیں کرتے حالانکہ مبادلۂ خیالات کے وقت بہت نرمی اور فراخ دلی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو لوگ علمی معاملات میں تحمل سے عاری ہوتے ہیں وہ نہ صرف علم کو نقصان پہنچاتے ہیں بلکہ قوم میں فرقہ بندی پیدا کرتے ہیں۔ خود بھی خسارے میں رہتے ہیں اور قوم کو بھی نقصان پہنچاتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

جو شخص نرمی سے محروم ہوا وہ سب بھلائی سے محروم ہوا۔[1]

تحمل معاشرہ اور قوم و ملت کی پختگی کی دلیل ہے۔ اس سے انسانی روابط میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ نرمی، تواضع اور انکساری کی صفات انسان کی شخصیت کو جاذب اور پرکشش بناتی ہیں۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

نرم خوئی ہر چیز کی آرائش ہے۔[2]

علامہ اقبال کہتے ہیں ع

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا

---

[1] کنز العمال جلد ۲ [2] ریاض الصالحین باب الحلم

مسلمان کی یہ کشش غیر مسلموں تک پر اثر ڈالتی ہے اور انھیں اسلام کی طرف کھینچتی ہے۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

یَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا، وَبَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا[1]

(آسانی پیدا کرو۔ تنگی نہ کرو۔ راحت کا پیغام دو۔ اجنبیت نہ پھیلاؤ)

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک بدو مسجد النبی میں آیا اور پیشاب کر دیا۔ صحابہ کرام رض اُسے مارنے دوڑے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں موجود تھے۔ آپؐ نے انھیں منع کیا اور فرمایا کہ اسے کچھ نہ کہو۔ پیشاب پر پانی بہا دو۔ تم آسانی پیدا کرنے کے لئے ہو تنگی پیدا کرنے کے لئے نہیں[2]

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب گھر سے باہر تشریف لے جاتے تو اللہ کے حضور میں دعا کرتے کہ مجھے اس بات سے پناہ دے کہ میں کسی سے درشتی کروں یا کوئی اور شخص مجھ سے درشتی کرے[3]

ارباب اقتدار اور تحمل:

ارباب اقتدار میں تحمل نہ ہو تو وہ عوام میں محبوب نہیں ہو سکتے اور حکومت کی بنیادوں کو کمزور کر دیتے ہیں اس لئے انھیں رعایا کی شکایات اور مطالبات کے سلسلہ میں نہایت تحمل سے کام لینا چاہیے۔

حضرت عمر فاروق رض بہت رُعب انگیز شخصیت کے مالک تھے لیکن تحمل کے موقع پر انتہائی فراخ دلی کا ثبوت دیتے تھے۔ ایک دن ایک شخص نے

---

[1] ایضاً [2] ریاض الصالحین باب الحلم [3] ریاض الصالحین باب فی الیقین والتوکل۔

آپؓ کو برسرِ مجلس بار بار ٹوکا۔ دوسرے آدمی نے اس سے کہا، تم نے حد کر دی اب ختم کرو۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، اسے کہنے دو۔ عوام ہمیں نہ ٹوکیں تو ان کا وجود بے سود ہے اور اگر ہم ان کی نہ سنیں تو ہم بے مصرف ہیں۔

حضرت معاویہؓ ملوکیت کے بانی ہیں تاہم لوگوں کو ان سے آزادانہ گفتگو کرنے کی کھلی چھٹی تھی۔ ایک شخص نے آپ سے کہا کہ آپ ہمارے ساتھ سیدھے چلیں ورنہ ہم آپ کو سیدھا کر دیں گے۔ آپ نے کہا، کاہے سے سیدھا کرو گے؟ بولا ڈنڈے سے۔ آپ نے کہا، تو پھر ہم سیدھے ہو جائیں گے۔

غیر مسلموں سے تحمل:

غیر مسلموں سے صرف انتہائی مجبوری کی حالت میں سختی کرنے کی اجازت ہے ورنہ اس کے ساتھ بھی حتی الوسع تحمل سے پیش آنا چاہیے۔

مدینہ میں ایک منافق عبداللہ نام رہتا تھا۔ اس کو اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بہت عداوت تھی۔ ظاہر و باطن جب بھی اس کا بس چلتا یہ اسلام کو زک پہنچانے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ تحمل سے پیش آتے تھے۔ غزوۂ بنو مصطلق سے واپسی کے وقت یہ اسلامی لشکر کے ہمراہ تھا۔ اس نے انصار اور مہاجرین کے درمیان فتنہ بھڑکانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اس کا بیٹا صادق الایمان تھا اس نے جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنے باپ کا سر حاضر کر دوں۔ آپؐ نے جواب دیا، اس کے ساتھ نرمی کرو۔ جب تک ہمارے ساتھ ہے ہم اس کے ساتھ حسنِ سلوک رکھیں گے۔

جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں دشمنانِ اسلام آئے دن اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف رہتے تھے۔ بارہا آپؐ کو

ان کے خلاف لشکر کشی کا حکم دینا پڑا لیکن آپؐ جب بھی لشکر کو روانہ کرتے تو تحمل سے پیش آنے کا حکم دیتے۔ جنگِ خیبر کے آخر میں آپؐ نے حضرت علی رضؓ کو لشکر دے کر بھیجا تو حضرت علی رضؓ نے روانہ ہوتے وقت پوچھا، جناب! کیا اس وقت تک تلوار چلاؤں کہ وہ ہماری راہ پر آجائیں۔ فرمایا،

"علی رضؓ! وقار و سکون کے ساتھ جا، جب تمہاری کے دو بدو ہو تو انہیں اسلام کی دعوت دے اور اللہ تعالیٰ کے حقوق بتا۔ اللہ کی قسم! شخصِ واحد کا تیرے ہاتھ پر اسلام لانا، سُرخ اونٹوں سے زیادہ قابلِ قدر ہے۔"

جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عین جہاد کے موقع پر بھی دشمن کے مقابلہ پر انتہائی تحمل کا ثبوت دیتے تھے۔ آپؐ شب خون نہیں مارتے تھے۔ ضعیف العمر اشخاص، عورتوں اور بچوں پر ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ دشمن گرفتار ہو جاتا تو جاہل عربوں کے قاعدہ کے خلاف اس کو عذاب نہیں دیتے تھے۔

حضرتِ ابوبکر صدیق رضؓ نے حضرتِ اسامہ رضؓ کے لشکر کو روانہ کرتے وقت دشمن کے بارہ میں مندرجۂ ذیل ہدایات دیں:

خیانت سے بچنا۔
وعدہ فریبی نہ کرنا۔
کسی شخص کے اعضاءِ مت کاٹنا۔
بچہ، بڈھے اور عورت پر ہاتھ نہ اٹھانا۔
آبادیوں کو نہ اُجاڑنا۔
کھجور کا درخت نہ کاٹنا اور نہ جلانا

ثمردار درخت نہ گرانا۔

مویشیوں کو کھانے کی غرض کے سوا ذبح نہ کرنا۔

تم خانقاہ نشین راہبوں کے پاس سے بھی گزرو گے انھیں اپنے حال پر رہنے دینا۔

تحمل کی حد

تحمل نہایت ہی نیک وصف ہے لیکن اس کو اس حد تک نہ بڑھنے دیا جائے کہ ضعف اور بے غیرتی میں بدل جائے۔ تحمل کی بنا قوت پر ہے، کمزوری پر نہیں۔ یہ بہادر اور غیور لوگوں کا وصف ہے، بزدل اور بے غیرت لوگ اس جوہر مردانہ سے بے نصیب رہتے ہیں۔

جہاں انسان کی حمیت، عزت اور دین پر حملہ ہو رہا ہو وہاں حتی المقدور بُرائی کا ڈٹ کر سامنا کرنا چاہیے۔ مال و دولت کوئی اتنی بڑی چیز نہیں لیکن ڈاکو کے مقابلہ میں اس کی بھی حفاظت لازم ہے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا گیا وہ شہید ہے۔ پھر دین تو بہت ہی بلند چیز ہے۔ اس کی عزت کے لئے مسلمان کو جان پر کھیل جانا چاہیے۔

حضرتِ معاویہ رض کا تحمل ضرب المثل ہے لیکن جہاں وہ ضروری سمجھتے تھے تلوار سے کام لیتے تھے۔ آپ نے ایک گورنر کو محض اس لئے معزول کر دیا تھا کہ وہ مجرموں سے بہت نرمی کرتا تھا۔

کفر اور باطل کا مقابلہ آپڑے تو مسلمان کو اپنی قوت کا پورا مظاہرہ کرنا چاہیے کیوں کہ کفر اپنی اصل کی رُو سے شریر ہے۔ جب تک اس کا سختی سے مقابلہ کیا جائے یہ فتنہ انگیزی سے باز نہیں آتا۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن!

(۱) تحمل مشکل کو آسان کرتا ہے:

انسان کے شب و روز اس کے لیے نئی نئی آزمائشیں مشکلات ور مصائب لاتے ہیں۔ انسان کے اندر تحمل کا مادہ ہو تو کوئی مشکل مشکل نہیں رہتی بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہر مشکل کے دامن میں ایک نئی راحت ہے۔ قرآنِ حکیم نے اسی حقیقت کے پیشِ نظر فرمایا ہے:

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًاۙ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًاؕ

(یقیناً تنگی کے ہمراہ آسانی ہے اور (خوب جان لو کہ) تنگی کے ہمراہ آسانی ہے۔

یہ تحمل ہی ہے جو زندگی کے بوجھ کو آسان کر دیتا ہے اور زندگی کی تنگ اور بنجر گھاٹی کو بے کنار [illegible] میں بدل دیتا ہے۔ اللہ کی راہ میں کانٹا چبھتا ہے تو اس میں بھی ایک لذت ہے۔ دکھ چھوٹا یا بڑا تحمل اس میں ایک روحان انگیز کیفیت پیدا کرتا ہے۔

تحمل کا فیض لامتناہی ہے۔ یہ چشمہ اگرچہ اس دنیا میں پھوٹتا ہے لیکن آخرت کو بھی سیراب کرتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

جو شخص آسانی، نرمی اور سہولت پیدا کرتا ہے اس پر آگ حرام ہے[1]

جو آدمی چاہتا ہے کہ قیامت کو اس کی منزل بلند ہو اور اس کے درجات رفیع ہوں وہ اس شخص کو جو اس پر ظلم کرتا ہے معاف کر دے، جو اس سے بخل

---

[1] کنز العمال جلد ۲

کرتا ہے اس سے سخاوت کرے، جو اس سے تعلق توڑتا ہے اس سے تعلق جوڑے اور جو اس سے اُلجھتا ہے اس سے حلم کرے[1]

۲- تحمل سے کام درست رہتے ہیں۔

عجلت سے جو کام کئے جائیں وہ اکثر بگڑ جاتے ہیں۔ جو کام سوچ سمجھ کر تحمل سے انجام دئے جائیں وہ مفید ثابت ہوتے ہیں۔ تحمل ہی کے بدولت علمی تحقیقات اور سائنسی ایجادات ظہور پذیر ہو سکتی ہیں۔ بعض دفعہ ایک ایک مسئلہ کے حل کرنے میں کئی کئی برس گزر جاتے ہیں۔

---

[1] کنز العمال جلد ۲

شکر

مفہوم

شکر کے لغوی معنی یہ ہیں کہ تھوڑا سا چارا ملنے پر بھی جانور میں تروتازگی پوری طرح موجود رہے اور وہ زیادہ دودھ دے[1] اس بنیاد پر اب اس کا یہ مفہوم ٹھہرا کہ تھوڑی سی نیکی پر بھی پورا پورا اجر دیا جائے۔ یہ صفت اللہ تعالیٰ میں بدرجۂ اتم موجود ہے وہ قرآن حکیم میں اپنے کو شاکر کہتا ہے۔ اور انسان کی اس کوشش کو جو اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول اور اجر یافتہ ہو سعی مشکور سے تعبیر کرتا ہے[2]

علامہ علی محمد صدیقی لکھتے ہیں کہ شکر کا مفہوم ہے کسی کی نعمت کا اعتراف کرنا اور اس کی خدمت کا حق ادا کرنا[3]

قرآن حکیم میں شکر کے مقابل کفر کا لفظ آیا ہے جس کے لغوی معنی ہیں ڈھانکنا یا چھپانا۔ اللہ تعالیٰ کے منکر کو اس لئے کافر کہتے ہیں کہ وہ حق پر پردہ ڈالتا ہے۔ کفرانِ نعمت کا لفظ اردو میں بھی عام مستعمل ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی کے احسان کو چھپانا اور اس کا اقرار یا اعتراف نہ کرنا۔

شکر کے مراتب

امام غزالیؒ لکھتے ہیں کہ شکر کے تین درجے ہیں جن کا مدار نیت کے تفاوت پر ہے یعنی

---

[1] سیرت النبی جلد ۶ سلیمان ندوی [2] بنی اسرائیل - ۱۹

[3] دلیل الغافلین باب المجاہدہ -

(۱) اللہ تعالیٰ کا صرف اس لیے شکر ادا کرنا کہ اس نے کوئی دنیوی یا روحانی نعمت عطا کی ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کی نعمت کو اس کے التفات کا ثبوت سمجھنا اور اس بات پر شکر ادا کرنا کہ اللہ تعالیٰ کی میرے حال پر توجہ ہے۔ اب مزید فضل بھی کرے گا۔

(۳) اس بات پر شکر گزار ہونا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت نے میرے دل میں اللہ کی یاد بڑھا دی ہے، میرا دل اس کی طرف اور زیادہ جھک گیا ہے۔ اس نعمت کو جائز کام میں لا کر مجھے اللہ تعالیٰ کا مزید قرب حاصل کرنے کا موقع ملے گا۔

یہ شکر کا اعلیٰ ترین درجہ ہے۔ ہمارا یہی نصب العین ہونا چاہیے۔

اہمیت — اللہ تعالیٰ کی بے کراں نعمتوں کا اعتراف۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شمار نہیں ہو سکتا۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہر ضرورت مہیا کر دی ہے[1] انسان کو موزوں، متناسب اور کار پرداز جسم دیا، نکتہ رس فہم، قلب تہگاف نگاہ اور گرہ کشا خرد دی معیشت کے سب سامان زمین پر جمع کر دیئے۔ انسان کے لئے فضا کو مسخر کیا، لیل و نہار کا نظام بنایا، اور سب سے بڑی یہ نعمت ارزاں فرمائی کہ انسان کی ہدایت اور رہنمائی کا سامان بھی مہیا کر دیا۔

اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت اس کی رحیم و کریم ربوبیت کی ایک منور نشانی ہے۔ مگر انہی کے لیے جن کے دل صاحب ایمان ہیں۔ ورنہ جن کے دلوں میں کفر کے اندھیرے راج جما چکے ہیں انھیں اللہ تعالیٰ کی کوئی رحمت دکھائی نہیں دیتی۔ یہ لوگ دنیاوی ترقی پر پھول کر فخر و تکبر اور بغاوت کے علمبردار بن جاتے ہیں۔ ضروری نہیں

---

[1] ابراہیم - ۳۴، النحل

کہ سرکشی کرنے کے نتائج فوراً آشکارا ہوں۔ بعض صورتوں میں کئی برس لگ جاتے ہیں۔ لیکن اس کا انجام بہرحال تباہی اور ہلاکت ہوتا ہے۔ انسان کو امن و سلامتی کی زندگی جبھی نصیب ہو سکتی ہے جب وہ ارادہ و نیت اور قول و فعل سے اپنے رب کے لئے سراپا تشکر بن جائے۔ یہی نہیں بلکہ اللہ تعالےٰ کے اس احسان کو بھی تسلیم کرے کہ اسے شکر گزاری کی توفیق دی۔

قرآن حکیم کی متعدد آیات سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے مقصود یہ ہے کہ انسان شکر کا اظہار کرے یعنی اس کی ربوبیت کا اعتراف کرے، عبادت کرے، ٹھیک راہ پر چلے اور اللہ تعالیٰ کے بخشے ہوئے سامانوں کو اس کی منشا اور رضا کے موافق کام میں لائے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ (البقرہ - ۱۵۲)

(اور میرا شکر ادا کرو اور میری نعمتوں کا انکار نہ کرو)

قرآنِ حکیم میں جس مقام پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنو اسرائیل کی معافی کا ذکر ہے وہاں ارشاد ہے:

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ

(اس کے بعد ہم نے تمھیں معاف کیا تاکہ تم شکر ادا کرو)

کتنے لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے صحیح فائدہ اٹھاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی متاع کو اسلوب سے خرچ کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس سے بہرہ اندوز کرتے ہیں؟ قرآنِ حکیم نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ بہت کم لوگ شکر کا پورا حق ادا کرتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بے کنار رحمت و ربوبیت کے پیش نظر انسان کو ساری زندگی عبادت اور اعمالِ صالح کے لئے وقف کر دینی چاہیے لیکن بہت کم لوگ اس فرض کو پوری طرح انجام دیتے ہیں۔

شکر کی بنیادی حیثیت :

شکر انسانی فطرت کا بنیادی کلمہ ہے۔ آدم کی زبان پر سب سے پہلے الحمدُ للہ کے الفاظ آئے۔ قرآن حکیم کا آغاز بھی الحمد سے ہوتا ہے۔ حمد اس تعریف کو کہتے ہیں جس میں شکر بھی شامل ہو۔ جب تک ہمارے اعمال شکر کے جذبات سے لبریز نہ ہوں اس وقت تک عبادت بھی بے معنی رہ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

وَاشْكُرُوا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ

(اگر تم واقعی اللہ تعالیٰ کے عبادت گزار ہو تو اس کے لئے سراپا شکر ہو جاؤ)

شکر کی دائمی حیثیت :

شکر اخلاق کا بنیادی ہی نہیں دائمی عنصر بھی ہے۔ صبر، تحمل، خوش خلقی وغیرہ بعض فضائل اخلاق کی اہمیت صرف اس دنیا تک محدود ہے لیکن شکر وہ فضیلت ہے جو آخرت میں بھی مقصود رہے گی۔ جنت کے مکین دنیا کی آلودگیوں اور تفکرات سے آزاد ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے۔ اس وقت رہ رہ کر اللہ تعالیٰ کی حمد کریں گے اور ان کی ہر دعا ان الفاظ پر ختم ہو گی :

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (یونس)

شکر کی کوئی انتہا نہیں۔ انسان کو نہ صرف مادی اور روحانی نعمتوں کا شکر ادا کرنا ہے بلکہ اس نعمت کے لئے بھی سراپا سپاس ہونا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے شکر کی توفیق دی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کی اس قدر عبادت کرتے تھے کہ آپ کے پاؤں سوجھ کر پھٹ جاتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے پوچھا کہ آپ اس قدر مجاہدہ کیوں کرتے ہیں جب کہ آپ کی زندگی کے لئے اول سے آخر تک مغفرت ہے۔ حضورؐ نے فرمایا، کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ نہ ہوں؟[1] حضورؐ کی مراد یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کے شکر کی کوئی انتہا نہیں۔

---

[1] ریاض الصالحین باب المجاہدہ۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہر حال میں مطلوب ہے:

اللہ تعالیٰ کی رحمت ہر وقت انسان پر سایہ فگن رہتی ہے لیکن بعض لوگ اس کی صحیح قدر نہیں پہچانتے۔ ذرا ذرا سے دکھ پر بے صبر اور تنگ دل ہو جاتے ہیں۔ ادنیٰ پریشانی آئے تو چلا اٹھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے گلے شکوے شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ اپنے سے ادنیٰ تر لوگوں کے حال پر نظر ڈال کر سوچیں تو انھیں رحمت خداوندی کا فوراً احساس ہو۔ شیخ سعدی لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ مجھے پہننے کو جوتے میسر نہ تھے اور دل میں شاکی تھا کہ مجھے ننگے پاؤں چلنا پڑتا ہے اس دھیان میں چلا جا رہا تھا کہ رستے میں ایک ایسے شخص کو دیکھا جس کے پاؤں کٹے ہوئے تھے۔ اس پر نظر کر کے میں اپنی بے صبری پر نادم ہوا اور اللہ کا شکر بجا لایا کہ اس نے مجھے پاؤں تو عطا کر رکھے ہیں۔ سرکارِ دوجہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ دو خصلتیں ایسی ہیں کہ وہ جس میں موجود ہوں اللہ تعالیٰ اسے شاکر و صابر شمار کرتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ جس شخص کو دین میں اپنے سے فائق تر دیکھے اس کی پیروی کرے اور دوسری یہ کہ جب کسی شخص کو دُنیوی حالت میں اپنے سے کمتر دیکھے تو اپنے حال پر اللہ کا شکر بجا لائے[1]۔

(۲) بندوں کا شکر:

جس طرح اللہ تعالیٰ کا شکر لازم ہے اسی طرح بندوں کا شکر بھی ضروری ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص بندوں کا شکر گزار نہ ہو وہ اللہ کا شاکر بھی نہیں ہوتا[2]۔

شکر کی شروط

(۱) قناعت و اطمینان:

وہی آدمی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا احساس کر سکتا ہے جو خواہشوں کا

---

[1] مشکوٰۃ باب فضل الفقراء [2] دلیل الفالحین ۲: ۸۳ وجوب فی الحث

غلام نہ ہو۔ حریص آدمی کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ اُسے ہمیشہ مزید کی طلب رہتی ہے۔ بجائے شکر کے وہ اپنی بے نصیبی یا کم بختی کا شکوہ سنج رہتا ہے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ یہ دنیا سرسبز و شیریں ہے جو شخص اسے بے طمعی سے حاصل کرے وہ برکت پاتا ہے اور جو شخص اسے طماعی سے حاصل کرے وہ برکت سے بے نصیب رہتا ہے۔ اس (طماع) شخص کی مثال اس جانور کی ہے جو سبزہ کھاتا جائے اور اسی کا جی نہ بھرے۔

سرکارِ دوجہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اصل تونگری کا تعلق دل سے ہے۔ کثرتِ مال سے نہیں۔ حضرتِ عبداللہ بن عمروؓ سے کسی نے پوچھا کیا ہم مہاجرین فقراء نہیں؟ فرمایا کیا تمہارے بیوی ہے؟ جواب دیا، ہاں۔ پوچھا، کیا سکونت کے لیے مکان ہے؟ بولا ہاں۔ جواب دیا، تو پھر تم اغنیاء میں سے ہو۔ اس نے کہا، میرے پاس ایک نوکر بھی ہے۔ فرمایا، پھر تم بادشاہوں میں سے ہو۔

قناعت سب سے بڑی دولت ہے۔ یہ دولت انسان کے اندر شکر کا مادہ پیدا کرتی ہے۔ طمع انسان کو ہمیشہ بے قرار اور ناشکرا رکھتی ہے۔

(۲) تواضع

تکبر اور شکر ایک دل میں یکجا نہیں ہو سکتے۔ متکبر آدمی دوسرے کا احساس ماننے میں کسرِ شان سمجھتا ہے۔ شکر کے لیے یہ ضروری ہے کہ آدمی اپنے محسن کی کچھ نہ کچھ فضیلت تسلیم کرے لیکن تکبر اس کو مانع آتا ہے۔

تکبر انسان کے دل پر پردہ ڈال دیتا ہے اور حق کی شعاعوں کو روک دیتا ہے۔ مغرور شخص اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو اپنا ذاتی کمال سمجھتا ہے۔

جب تک قناعت کی زمین کو تواضع کے پانی سے نہ سینچا جائے شکر کی فصل پیدا نہیں ہو سکتی۔

شکر کا طریقہ

ادائے شکر کے تین طریقے ہیں :۔
قلبی ، قولی اور عملی

(۱) قلبی شکر :

(الف) اعتراف و ایمان : قلبی شکر سے مراد ہے کہ انسان کے دل میں اس کے محسن کا حقیقی اعتراف ہو۔ محض دکھاوے کے لیئے شکر گزاری کا اظہار نہ کرے بلکہ دل سے اس کا شاکر ہو اور اس سے ایک قلبی ربط اور اُنس یا محبت پیدا کرے۔

شکر کا سرچشمہ دل ہے۔ دل میں شکر نہ ہو تو زبانی اقرار محض فریب ہوگا۔

کوئی بھی محسن ہو اس کا شکر ادا کرنا چاہیئے لیکن سب سے زیادہ شکر اللہ تعالیٰ کا ہے جس کی نعمتوں اور رحمتوں کی کوئی انتہا نہیں۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اعتراف حق کا اعتراف ہے جس کے بغیر ایمان قائم نہیں رہ سکتا۔ اس لیئے اس اعتراف کا دل میں ہمیشہ موجود رہنا چاہیئے۔ قرآن شریف میں کئی مقام پر شکر کا لفظ اسی قلبی اعتراف کے معنی میں آیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ ارشاد ہے کہ ہم نے انسان کو نیکی اور بدی کی راہیں دکھادیں۔ اب چاہے تو شکر گزار ہو یعنی حق کا اعتراف کرے اور چاہے تو انکار کردے۔

انسان اللہ تعالیٰ کی کائنات پر نظر ڈال کر غور کرے کہ اللہ تعالیٰ نے میری خاطر کیا کیا سامان پیدا کردیئے ہیں تو یقیناً اس کا دل احساس شکر سے معمور ہوجاتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سراپا نیاز ہوجاتا ہے اور اس پر یہ حقیقت واشگاف ہوجاتی ہے کہ مجھے سب نعمتوں کے لئے صرف اللہ تعالیٰ کا منت کش ہونا چاہیئے۔ اس کی ربوبیت میں کوئی شریک نہیں ہے

قرآنِ حکیم سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو ماننا شکر ہے اور شرک کرنا ناشکری ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں انسان کی توجہ بار بار اپنی قدرت کی نشانیوں کی طرف پھیرتا ہے تاکہ اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اعتراف پیدا ہو۔ یہی قلبی شکر ہے۔ یہ شکر فہم اور سمجھ کے بغیر پیدا نہیں ہوتا۔ انسان جس قدر صاحبِ حکمت ہوگا یہ جذبہ اسی قدر گہرا ہوگا چنانچہ امام غزالیؒ نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور احسان فرمائی کے علم کو شکر کا رکن بتایا ہے۔ قرآنِ حکیم میں ارشاد ہے کہ ہم نے لقمان کو حکمت دی تاکہ اللہ کا شکر ادا کرے [۱] ایک سورت میں انسان سے ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں ماؤں کے پیٹ سے پیدا کیا۔ تم ان جان تھے تمھیں کان اور آنکھیں دیں اور دل عطا کیے تاکہ تم اس کا شکر ادا کرو [۲] مراد یہ ہے کہ کائنات کا مطالعہ کر کے دل میں یہ یقین پیدا کر لو کہ اللہ تعالیٰ کے تم پر بے حد و حساب احسانات ہیں۔

(ب) ذکر و فکر: اعتراف و ایمان کے بعد شکر کا دوسرا درجہ آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ قلب ذکر و فکر سے غافل نہ ہو اور اس میں نیک جذبات پیدا ہوں۔ یہی قلبی شکر کا کمال ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہنا چاہیے۔

(۲) قولی شکر:

احسان یا بھلائی کا زبانی اظہار بھی ضروری ہے۔ بعض خود پرست افراد کی نخوت کے لئے زبانی شکر سنگِ گراں ثابت ہوتا ہے اور وہ اس میں اپنی تذلیل سمجھتے ہیں لیکن شکر کا جذبہ بھی پنپ سکتا ہے کہ نخوت کے بُت کو توڑ دیا جائے۔

---

[۱] لقمان ۱۲ – [۲] پارہ ۱۴ رکوع ۱۷۔

دل سے کسی محسن کا احسان مند ہونا اتنا مشکل نہیں جتنا اس کا برسرِ عام اعتراف مشکل ہے۔ اس حقیقت سے آگاہ رہنا چاہیے کہ اگر جان بوجھ کر قولی شکر سے گریز کیا جائے تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک قلبی شکر بھی بے کار ہوگا۔
قرآنِ حکیم نے زبانی شکر پر بہت تاکید کی ہے۔ ایک مقام پر ارشاد ہے:

أَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ

(اللہ تعالیٰ کی نعمت کا ذکر کر)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

جس نے اللہ تعالیٰ کی ثناء بیان کی اس نے شکر ادا کیا اور جس نے (اس نعمت کو) چھپایا اس نے کفر کیا[1]

اللہ تعالیٰ کے زبانی شکر کی ایک صورت اس کی حمد بیان کرنا ہے۔ حمد کی بے اندازہ فضیلت ہے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے[2]:

اَلْحَمْدُ رَأْسُ الشُّكْرِ

(حمد شکر کا سرچشمہ ہے)

حضورؐ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد سے عمل کا ترازو بھر جاتا ہے اور اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسُبْحَانَ اللّٰہِ زمین و آسمان کے خلا کو بھر دیتے ہیں[3]
اللہ تعالیٰ کے ۹۹ صفاتی نام ہیں۔ انھیں اسمائے حسنیٰ کہتے ہیں۔ اللہ کے ہر نام سے اس کی رحمت کا ایک کرشمہ جھلکتا ہے۔ جب اُسے اس نام سے یاد کیا جاتا ہے تو اس کی رحمت کا ایک پہلو آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

---

[1] ترمذی [2] مشکاۃ [3] اربعین نووی بحوالہ مسلم۔

یہ بھی بیانِ شکر کا ایک طریقہ ہے۔

روزی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ آدمی جب کھانے پر بیٹھے تو بِسْمِ اللّٰہِ سے شروع کرے اور خاتمہ پر اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کے الفاظ کہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں عین نیاز کا وقت ہوتا ہے، سچے دل سے اللہ کا شکر ادا کیا جائے تو اس میں گہرا اثر ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

کھانا کھا کر شکر ادا کرنے والے کے لئے ایسا ہی اجر ہے جیسا ثابت قدم روزہ دار کے لئے۔

زندگی میں جب کوئی شاندار کامیابی حاصل ہو یا دشمن پر فتح نصیب ہو تو مسرت کے جوش میں آدمی بارہا اللہ تعالیٰ کو بھول جاتا ہے اور اس گھمنڈ میں آجاتا ہے کہ یہ کامیابی میری ہی محنت اور لیاقت کا پھل ہے۔ ایسے نازک لمحوں میں اپنے جذبات کو سنبھالنا، متواضع رہنا اور اپنی کامیابی کے لئے احسانِ خداوندی کا معترف ہونا خلوصِ ایمان، مردانگی اور اولوالعزمی کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب فتح مکہ کے موقع پر شہر میں داخل ہوئے تو رکاب میں دس ہزار سے زائد فوج تھی لیکن ساری فوج متانت اور سنجیدگی کی تصویر تھی۔ کوئی بینڈ باجے ہمراہ نہ تھے۔ حضورؐ کا سر مبارک انکسار سے اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکا ہوا تھا اور زبانِ مبارک پر شکر کے کلمات رواں تھے۔

(۳) عملی شکر:

حضرت داؤد اور ان کی اولاد پر اللہ تعالیٰ نے انعامات کی بارش کر دی تھی۔ ان سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوا:

اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُکْرًا (سبا)

(اے آلِ داؤدؑ شکر گزاری کے کام کرو)

ربّ العالمین کی شکر گزاری کی عملی صورت یہ ہے کہ انسان اس کی بخشی ہوئی چیزوں کو اسلامی طریقے پر کام میں لائے۔ ان کو برباد نہ کرے اور نہ شیطانی مشاغل میں صرف کرے مثلاً:

(اوّل) اپنے بدن کا صحیح استعمال کرے۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسا بدن عطا فرمایا ہے جو نہ صرف فوائد کے لحاظ سے کامل ہے بلکہ دیکھنے میں بھی خوشنما ہے۔ ہمیں اس بارے میں مندرجۂ ذیل امور کا خیال رکھنا چاہیے۔

(ا) بدن کی صحت اور زیبائی سے غافل نہ ہوں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس ایک صحابی کافی غیر حاضری کے بعد تشریف لائے۔ ان کا چہرہ بہت لاغر ہو چکا تھا۔ حضورؐ نے پوچھا، تم بہت خوش شکل تھے، اب وہ صورت کیا ہوئی؟ عرض کیا، جناب! روزوں نے یہ حال کیا ہے۔ فرمایا، تم پر اپنی جان کا بھی حق ہے۔ اس کو پوری طرح ادا کرو۔

ایک دفعہ ایک صحابیؓ حضور کے پاس پھٹے لباس میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے پوچھا، کیا تم کچھ مال رکھتے ہو؟ عرض کیا، ہاں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے بھیڑ بکریاں اور اونٹ دئے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا، تو ان کا اظہار کرو[1]۔ مراد یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کا اپنے لباس وغیرہ میں اظہار کرو۔

(ب) جسم کو نیک کاموں اور خدمتِ خلق میں لگانا چاہیے

---

[1] ترمذی۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ سورج نکلتے ہی انسان کے ہر عضو پر صدقہ واجب ہو جاتا ہے[1] مراد یہ ہے کہ ہر روز ہر عضو سے کوئی نہ کوئی نیک کام لینا لازم ہے۔ یہ شکر کی ایک نہایت عمدہ صورت ہے۔ مثلاً آنکھ سے قرآن حکیم کی تلاوت اور مطالعۂ کائنات کرے، زبان سے حمد اور تبلیغ کرے۔ ہاتھ پاؤں سے عبادت، خدمتِ خلق اور جہاد کرے۔ سورۂ بقرہ کے سولھویں رکوع کی ایک آیت میں اللہ تعالیٰ بندوں پر اپنا احسان جتا کر فرماتا ہے کہ اکثر لوگ شکر کا حق ادا نہیں کرتے۔ پھر اس سے پیوست اگلی آیت میں مسلمانوں کو یہ حکم ہے:

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ

(اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو)

اس سے مراد یہ ہے کہ جہاد بھی شکر کی ایک عملی صورت ہے۔

دوم، مال و دولت کا صحیح مصرف:

ہمارا مال و دولت اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے۔ اس سے اللہ کے بندوں کی دستگیری کرنی چاہیے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کہے گا کہ اے انسان میں مریض ہوا اور تُو نے میری عیادت نہ کی۔ وہ جواب دیگا کہ اے رب تیری عیادت کیسے ہو سکتی ہے؟ تو خود سب جہانوں کا پروردگار ہے۔ خدا فرمائے گا کہ کیا تجھے علم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار پڑا اور تو نے اس کی عیادت نہ کی۔ اگر تو اس کے پاس جاتا تو مجھے وہاں پاتا۔ پھر پوچھے گا،

---

[1] اربعین نودی بحوالہ مسلم۔

اے انسان! میں نے تجھ سے کھانا مانگا اور تو نے انکار کیا۔ وہ جواب دے گا کہ اے رب! میں تمھیں کیسے کھلاتا جب کہ تو سب جہانوں کا پروردگار ہے۔ خدا کہے گا کہ کیا تو نہیں جانتا کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا طلب کیا اور تو نے نہ دیا۔ کیا تجھے علم نہیں کہ اگر تو اسے کھانا دیتا تو آج وہ (کھانا) تو میرے پاس دیکھتا۔ (خدا تعالیٰ پھر کہے گا)، اے انسان! میں نے تجھ سے پانی مانگا اور تو نے نہ دیا، بندہ کہے گا، اے رب میں تجھے کیسے پانی پلاتا جب کہ تو خود پروردگار ہے، رب کہے گا، میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی کا سوال کیا اور تو نے نہ دیا۔ اگر تو نے اسے پانی پلایا ہوتا تو آج وہ (پانی) میرے پاس دیکھتا۔[1]

صحیح بخاری میں ایک تمثیلی حکایت ہے کہ تین اسرائیلی تھے۔ ایک کوڑھی دوسرا گنجا اور تیسرا اندھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے پاس ایک فرشتہ بھیجا۔ اس نے ہاتھ پھیر کر تینوں کو چنگا کر دیا اور پہلے کو ایک حاملہ اونٹنی، دوسرے کو حاملہ گائے اور تیسرے کو حاملہ بکری دی۔ کچھ عرصے بعد ان کے ریوڑ بہت بڑھ گئے۔ اب یہ فرشتہ انسانی صورت میں مسکین بن کر ان کے پاس علیحدہ علیحدہ گیا اور یہ یاد دلا کر کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر کتنا کرم کیا ہے۔ پہلے سے ایک اونٹ، دوسرے سے گائے اور تیسرے سے بکری مانگی۔ پہلے دو نے انکار کر دیا اور کہا کہ ہم تو پشتینی امیر تھے۔ مگر تیسرے شخص نے اللہ تعالیٰ کی عنایت کو یاد کیا اور کہا کہ تو جو چاہتا ہے لے لے۔

فرشتہ بولا: مجھے مال کی ضرورت نہیں،

تمھاری آزمائش کے لئے آیا تھا۔ دوسرے دونوں سے اللہ تعالےٰ ناراض ہو گیا اور تم سے راضی ہے۔

---

[1] یونس ۲۱ تا ۲۳۔ بنی اسرائیل ۶۔

بندوں کا عملی شکر یہ ہے کہ جس نے بھلائی کی ہو اُس کی خدمت اور مدد میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کی جائے۔

شکر کے مفہوم میں جو عملی عناصر بہت نمایاں ہیں ان کا تذکرہ آچکا ہے مگر حق یہ ہے کہ اس لفظ کی دنیا بہت وسیع ہے اور انسان کے تمام اعمال پر حاوی ہے۔ حق پرستی، شکر ہے اور باطل پرستی کفرانِ نعمت۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ناشکرے بندوں کی یہ مثال دی ہے کہ وہ سمندر کے طوفان میں پھنسے تو خدا کے حضور میں زاری کُناں ہوئے کہ آج تو ہمیں بچا لے تو تیرے شکر گزار رہیں گے لیکن جب وہ اس مصیبت سے بچ نکلے تو زمین پر باطل پرستانہ حرکتیں کرنے لگے۔

ثمرات

شکر کے بے اندازہ فضائل اور ثمرات ہیں۔ ان کا مختصر تذکرہ درج ذیل ہے:۔

۱۔ دنیوی عذاب سے بچاؤ:

حضرتِ لوط کی قوم پر پتھروں کی بارش ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے حضرتِ لوط اور ان کے گھر والوں کو اس عذاب سے بچا لیا۔ سورۂ القمر میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کرکے ارشاد ہے:

كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ

(جو ہمارا شکر ادا کرے ہم اسے اسی طرح اجر دیتے ہیں)

۲۔ دنیوی ترقی:

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے مومنانہ طور سے فائدہ اٹھانا شکر ہے جس نے شکر کے اس راز کو پا لیا وہ منزل بہ منزل مارتا چلا جائے گا۔ راہ کی ہر مشکل اس کے آگے زبون و پامال ہو جائے گی۔ تاریخ بتا رہی ہے کہ جن افراد

ور اقوام نے دل و دماغ کی قوتوں اور مادی سامانوں سے درست کام لیا انھوں نے ترقی کی حیرت انگیز رفتار دکھائی۔ ان کے قویٰ نئی جلا پا گئے۔ ان کے بدنوں میں ہر لمحہ تازگی آتی گئی اور ان کے ساز و برگ کے انبار بڑھتے ہی گئے۔ اللہ تعالیٰ کا بھی یہی فرمان ہے کہ:

اگر تم نے شکر کا اظہار کیا تو تمھیں ترقی دوں گا اور اگر تم نے کفرانِ نعمت کیا تو (جان لو کہ) میرا عذاب بہت شدید ہے[1]

۳۔ آخرت کے درجات۔

شکر گزار بندوں کے آخرت میں بہت بلند مدارج ہوں گے۔

حدیث میں آیا ہے کہ جب کسی آدمی کا بیٹا مر جائے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے پوچھتا ہے، کیا تم نے میرے بندے کے لختِ جگر کی روح قبض کر لی! فرشتے اثبات میں جواب دیتے ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم نے اس کے دل کا ثمرہ نوچا ہے، اس کے بعد فرشتوں سے پھر سوال کرتا ہے، میرے بندے نے کیا کہا؟ فرشتے کہتے ہیں کہ اس نے تیری حمد بیان کی اور اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن کہا۔ یہ سن کر اللہ تعالےٰ فرمان دیتا ہے کہ میرے بندے کے لئے جنت میں ایک گھر بناؤ اور اس کا نام بَیْتُ الْحَمْد رکھو[2]

---

[1] ابراہیم۔ [2] ریاض الصالحین کتاب حمد اللہ تعالیٰ۔

صدق

مفہوم

صدق کے لغوی معنی ہیں سچ کہنا، سچ کر دکھانا، راست ہونا، کامل ہونا۔ صدیق اس شخص کو کہتے ہیں جو ہمیشہ سچ بولے، صداقت میں کامل ہو، اپنے قول کی تائید عمل سے کرے اور سچے آدمی کو سچا جانے۔[1] ان معانی کی روشنی میں صدق کو تین شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ دل کی سچائی۔ ۲۔ زبان کی سچائی۔ ۳۔ عمل کی سچائی۔

اہمیت

دل کی سچائی:

دل کی سچائی سے مراد خالص، بے لوث اور پختہ میلانِ نیت یا ارادہ ہے۔ دلی صداقت کو عام طور پر خلوص کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دین خلوص کا نام ہے جو خدا سے، اس کی کتاب سے، اس کے رسولؐ سے، مومنین سے، اور ان کے امراء سے ہو۔[2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صدق اور ایمان ایک ہیں اس کی تائید قرآن حکیم کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے کہ جو لوگ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے وہی صدیق ہیں۔[3] ایک دفعہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا، کیا مومن بزدل ہو سکتا ہے؟ فرمایا ہاں سائل نے پھر پوچھا کیا بخیل ہو سکتا ہے؟ فرمایا، ہاں۔ اس نے اب یہ

---

[1] منجد [2] اربعین نووی بحوالہ مسلم [3] سورہ الحدید۔۱۹۔

سوال کیا، کیا وہ جھوٹا ہو سکتا ہے؟ فرمایا، نہیں[1] اس مفہوم کے اعتبار سے صدق کا الٹ نفاق ہے اور صادق کا منافق۔ سورۂ احزاب میں منافق کا لفظ صادق کے مقابل آیا ہے اور سورۃ المنافقون میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں۔

مومن کا صدقِ دل یہ ہے کہ وہ کسی ذاتی غرض سے نہیں بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اللہ سے، اس کے رسول سے اور مومنین سے محبت رکھتا ہے۔ وہ نیکی اور حسنِ سلوک کے معاملہ میں کوئی ریا نہیں کرتا۔ اس کے ہر عمل کا مقصود رضائے الٰہی ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں اس خیرات کا نام جو نمائش کے لئے نہیں بلکہ محض ثواب کے لئے دی جاتی ہے صدقہ ہے۔ لفظ صدقہ کا مادہ صدق ہے۔

ایمان کے خلوص کا تقاضا یہ ہے کہ انسان پختہ نیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جدوجہد کا ارادہ رکھے ایسے شخص کو قرآن حکیم صادق العزم کہتا ہے۔ اگر ماحول کی مخالفت اسے نیک ارادوں پر عمل پیرا نہ ہونے دے تو جب بھی اللہ تعالیٰ اس کے حساب میں پوری نیکی لکھ دیتا ہے۔ ہادیٔ برحق کا ارشاد ہے کہ جس نے صدقِ نیت سے شہادت طلب کی اللہ تعالیٰ اسے شہداء کی منزل بخشتا ہے، چاہے وہ فرشِ پر کیوں نہ مرے[2] لیکن نیت کھوٹی ہو اور عمل بظاہر کتنا ہی سانا ہو تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں بلکہ ایسے ریاکار کی ریاکاری کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن لوگوں کے سامنے آشکارا کر دے گا۔ شہادت کا درجہ کس قدر بلند ہے۔ لیکن محض نام آوری کی خاطر جان دی جائے اور

---

[1] موطا امام مالک، ماجاء فی الصدق والکذب [2] ریاض الصالحین بحوالہ مسلم

اللہ تعالےٰ کی خوشنودی مطلوب نہ ہو تو آخرت میں اس کا کوئی اجر نہیں ہوگا۔

زبان کی سچائی:

زبان کی سچائی یہ ہے کہ آدمی اپنے ضمیر کا اظہار دیانت داری سے کرے اور دیکھی یا سنی ہوئی چیز کے بارے میں سچ بیان دے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ تو ان بے بصر، بے سماعت اور ناکارہ بتوں کو کیوں پوجتا ہے۔ قرآن حکیم جب اس واقعہ کا ذکر کرتا ہے تو حضرت ابراہیم کو نبی صدیق[1] کہتا ہے۔ کیوں کہ انھوں نے ضمیر کا آزادانہ اور بے آمیزش اظہار کیا۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ صداقت کو مضبوطی سے تھام رکھو۔ صداقت نیکی کی طرف لے جاتی ہے اور نیکی جنت میں پہنچاتی ہے۔ جھوٹ بدی کی طرف لے جاتا ہے اور بدی دوزخ میں ڈالتی ہے[2]۔ آپؐ کا قول ہے کہ جھوٹا جھوٹ سے باز آجائے تو اس کے لئے جنت میں گھر بنایا جاتا ہے[3]۔ ایک دفعہ آپؐ نے فرمایا کہ جو شخص ہنسانے کے لیے بھی جھوٹ بولے اس کے لئے ہلاکت ہے۔ ہلاکت ہے، ہلاکت ہے[4]۔

زبان کی سچائی عمل کی سچائی کا وسیلہ ہے۔ راستی وہ چیز ہے جس سے سب برائیاں دور بھاگتی ہیں۔ ایک دفعہ ایک شخص آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھ میں چار بڑی برائیاں ہیں۔ شراب، بدکاری، چوری اور جھوٹ۔ ان میں سے جس برائی کا آپ حکم دیں، چھوڑ دوں۔ آپؐ نے فرمایا، جھوٹ سے باز آجاؤ۔ جب رات ہوئی تو اس کے

---

[1] سورۂ مریم [2] ترمذی موطا [3] ترمذی [4] ترمذی ابواب الزہد۔

شراب پینا چاہی، پھر خیال آیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پوچھیں گے تو سچ کہنا پڑے گا اور رسوائی ہوگی۔ شراب سے منہ موڑ لیا۔ اس کے بعد بدکاری کو بھی چاہا مگر پھر جب یہ دھیان آیا کہ حضورؐ پوچھیں گے تو سچ بتانا پڑے گا اور راز کھل جائے گا تو بدکاری کا خیال بھی چھوڑ دیا۔ اسی طرح جب چوری کی نیت کی تو یہ ارادہ بھی ہمیشہ کے لئے توڑنا پڑا۔ نتیجہ یہ کہ ایک سچ کے بدولت سب برائیوں سے پاک ہوگیا۔ اسی حقیقت کے پیش نظر ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص مجھے اپنی زبان (کی سچائی) کی ضمانت دے میں اسے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔

سچ بیان اور سچ گواہی پر اسلام نے بہت تاکید کی ہے۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جھوٹ گواہی کو شرک[1] کہا ہے سُنی ہوئی چیز کے بیان کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس لئے بغیر تحقیق یا اطمینان کے کسی بات کو آگے نہیں پھیلانا چاہیے۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ یہی بہترا جھوٹ ہے کہ آدمی کوئی چیز سنے اور اسے (بغیر تحقیق کے) آگے پہنچا دے[2]

عمل کی سچائی:

عمل کی سچائی یہ ہے کہ آدمی ظاہر و باطن ایک رکھے اور جو عزم یا وعدہ کرے اسے تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کرے۔

حضرت اسمٰعیلؑ کو عزم کی پختگی کی وجہ سے قرآن حکیم نے صادق الوعد کہا ہے[3] صداقت کی ایک مختصر مگر جامع تعریف قرآن حکیم نے یہ بتا رکھی ہے کہ مومن صرف وہ ہیں جو:

---

[1] ترمذی ابواب الزہد [2] تذکرۃ الحفاظ ذہبی [3] مریم۔

اللہ تعالٰے اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے۔ اور پھر اس ایمان میں انھیں کوئی شک نہ ہوا اور خدا کی راہ میں اپنی جان و مال سے جہاد کیا۔ صرف وہی صادق لوگ ہیں۔"[1]

صداقت دل کی ہو، زبان یا عمل کی، اس کو اسلام میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ شارعِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ توحید کی بنا ہی اپنے صدق پر رکھی تھی۔ ایک دن کوہِ صفا پر تشریف لے گئے۔ ندا دے کر مکہ کے لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا، اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اس پہاڑی کے برابر سے ایک لشکر آنے والا ہے تو کیا تم مان لوگے؟ لوگوں نے بیک آواز کہا، ہم نے آپ کی زبان سے کبھی جھوٹ نہیں سُنا۔ فرمایا، تو پھر میں تمھیں اللہ کے شدید عذاب سے ڈراتا ہوں[2]

آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی اپنے اوّلین جلوہ سے آخری جھلک تک صداقت کا ایک دل نواز اور ایمان افروز سراپا نظر آتی ہے۔ ابتدائے عمر ہی میں مکہ والوں میں آپؐ کی صداقت مُسلّم تھی۔ اعلانِ نبوّت کے بعد جب لوگ مخالف ہوئے تو آپؐ کے خلاف ہزار باتیں جوڑتے تھے مگر کسی کی زبان سے یہ حرف نہ نکلا کہ آپؐ (نعوذ باللہ) دروغ گو ہیں۔ ان دنوں ابو سفیان آپؐ کے سخت ترین مخالفوں میں سے تھے۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شاہِ روم ہرقل کو اسلام کا دعوت نامہ لکھا۔ اتفاق سے ابو سفیان بھی ہرقل کے علاقہ میں تجارت کی غرض سے موجود تھے۔ ہرقل نے بلا بھیجا اور آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں استفسار کیا تو

---

[1] الحجرات - ۱۵ [2] مسلم کتاب الایمان۔

انھوں نے تسلیم کیا کہ حضورؐ راست گو ہیں۔

آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قولاً اور عملاً، ہر دو صورت سے صداقت کی اہمیت واضح کی ہے۔ آپؐ کی حیاتِ مبارک اور صدرِ اوّل کے مسلمانوں کی سربلندی اس دعوے کی ضمانت ہے کہ عزم، قول، وعدہ اور عمل کی صداقت ہی دنیوی اور اُخروی کامیابی کا راز ہے۔

امانت

مفہوم لفظ امانت کا مادہ امن ہے اور لغوی لحاظ سے امان کا ہم معنی ہے[1] قرآن حکیم اور حدیث شریف میں اس کے یہ معنی آتے ہیں۔

(۱) اعتبار[2]

(۲) وہ چیز جو اس خیال سے کسی کی تحویل میں رکھی جائے کہ اس کی حفاظت رہے اور ضرورت کے وقت ادا ہو جائے[3]

(۳) تحویل شدہ شے کی صحیح و سالم واپسی۔

امانت اور ایمان کے لفظ نہ صرف لغوی لحاظ سے ہم مادہ ہیں بلکہ دینی نقطۂ نظر سے بھی ہم اصل ہیں چنانچہ مشہور حدیث ہے کہ جس میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں۔ اور بعض جگہ تو ساتھ یہ الفاظ بھی ہیں۔

الْاِیْمَانُ اَمَانَۃٌ

(ایمان امانت ہے)[4]

اہمیت قرآن حکیم (سورۂ احزاب) میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم نے اپنی امانت زمین و آسمان کو دکھائی، مگر کسی نے اس کے اٹھانے کی ہمت نہ کی اور وہ اس سے ڈر گئے اور اسے انسان نے قبول

---

[1] لسان العرب [2] سورہ بقرہ ۲۸۳ ترجمہ از شاہ عبدالقادر [3] الاحزاب آخری رکوع [4] لسان العرب۔

کر لیا۔ بعض علماء اس امانت سے مراد فرائض لیتے ہیں اور بعض قوتِ اختیار جو کبھی طاعت پر مائل کرتی ہے اور کبھی گناہ کی راہ دکھاتی ہے[۱] ان دونوں میں سے جس معنی کو بھی اختیار کیا جائے یہ نکتہ از خود کھل جاتا ہے کہ اس امانت کو صحیح طور پر نباہنا ہی ایمان ہے۔ ایمان اور امانت کا ناقابلِ شکست بندھن ہے۔ امانت اُٹھ جائے تو ایمان بھی رخصت ہو جائیگا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قربِ قیامت کی جو نشانیاں بتائی ہیں وہ سب ایمان کھو جانے کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ ایک نشانی یہ ہے کہ امانت جاتی رہے گی۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری اُمّت اس وقت تک فطرتی صلاحیت پر قائم رہے گی جب تک وہ امانت کو غنیمت کا مال اور زکوٰۃ کو جرمانہ نہیں سمجھے گی[۲]

ایک دفعہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے سوال کیا کہ مؤمن کون ہے؟ فرمایا مؤمن وہ شخص ہے جس کے دستِ امانت میں لوگ اپنی زندگیاں اور اپنے اموال سونپ دیں۔ منافق کی علامتوں میں سے ایک علامت آپؐ نے یہ بتائی ہے کہ وہ خیانت کار ہوتا ہے[۳] قرآنِ حکیم میں جنت کے وارثوں کی ایک خوبی یہ گنائی گئی ہے کہ وہ امانت گذار ہوتے ہیں[۴]۔ اس کے علاوہ بھی قرآنِ حکیم میں جگہ جگہ ادائے امانت کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔

ہم یہ دیکھ آئے ہیں کہ امانت کا ایک مفہوم اعتبار کی لاج رکھنا بھی

---

[۱] لسان العرب [۲] سیرۃ النبی جلد ۶۔ [۳] ریاض الصالحین باب الوفاء بالعہد بحوالہ شیخین [۴] المومنون والمعارج رکوع ۱

ہے ۔ یہ مفہوم بہت وسیع ہے جس میں ادائے حق، پاسِ عہد، قیامِ انصاف، حفظِ راز و صحیح مشورہ وغیرہ کی نوع کے فضائلِ اخلاق شامل ہیں ۔ آں حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ المجَالِسُ بِالْاَمَانَةِ یعنی مجلسوں کا مدار امانت پر ہے ۔ مراد یہ ہے کہ ایک مجلس کی گفتگو اور اس کے پوشیدنی امور کی پردہ دری کی قطعاً اجازت نہیں ۔ فرمانِ نبوی ؐ ہے کہ میاں بیوی کے درمیان پردہ کی جو باتیں ہوتی ہیں وہ بھی ایسے راز ہیں جن کا عام طور سے افشا کرنا بے شرمی کے علاوہ امانت کے بھی خلاف ہے [۱] ایک بار آپ ؐ نے فرمایا کہ اگر کوئی آدمی تیرا مشورہ چاہے تو اسے درست مشورہ دے ۔ اگر تو الیانہ کرے تو خائن ٹھہرے گا [۲] ایک دفعہ ابوذر غفاری رضؓ سے ارشاد کیا کہ اے ابوذر رضؓ امارت امانت ہے [۳] مراد یہ ہے کہ امراء عوام کی مصلحت اور فوز و فلاح کے امین ہوتے ہیں ۔ ان کو لازم ہے کہ اس فرض کو ادا کریں ۔ ایک دفعہ ایک بدو نے پوچھا کہ قیامت کب آئے گی؟ فرمایا، جب امانت جاتی رہے گی ۔ بولا، کیوں کر؟ فرمایا، جب کام نااہلوں کو سپرد ہو جائے گا [۴] امانت کا لفظ پاسِ عہد کے معنی میں قرآن حکیم میں آیا ہے جہاں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ارشاد ہے کہ اگر آپ کے دشمن (معاہدات کے بارے میں) آپ ؐ سے خیانت کرتے ہیں تو آپ ؐ بھی کھلم کھلا اور دو ٹوک ان معاہدوں سے ذمہ اٹھالیں ۔

---

[۱] سیرۃ النبی جلد ۶ بحوالہ ابو داؤد کتاب الادب [۲] مسند ابو حنیفہ کتاب الاحکم [۳] ایضاً [۴] بخاری کتاب العلم ۔

یہ اخلاقی معجزہ قرآن حکیم ہی کا ہے کہ اگر دشمن منافقانہ نیت اور دو رُخی چال سے شرائطِ صلح کو توڑنے لگیں تو بھی مسلمانوں کو اجازت نہیں کہ وہ ان کی سی دو رُخی کریں۔ نہیں، بلکہ وہ اس معاہدے سے ڈنکے کی چوٹ دست بردار ہوں، خیانت نہ کریں کیوں کہ اللہ تعالےٰ خیانت کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہودِ مدینہ کے ساتھ پیمان معاونت تھا مگر یہود نے اس پیمان کو ہمیشہ نظر انداز کیا۔ بظاہر وہ امن کا دم بھرتے تھے مگر اندرونی طور پر اسلام کے خلاف فتنہ و فساد کی تخم کاری کرتے رہتے تھے۔ قرآنِ حکیم نے یہود کی ان حرکات کو خیانت کا نام دیا ہے اور آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرمایا ہے کہ آپ ان کی خیانتوں سے مطلع ہوتے رہیں گے مگر آپ ہمیشہ درگزر سے کام لیں[1]۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس ہدایت پہ ہمیشہ کاربند رہے۔

سالارِ رُسل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امانت گذاری اوائل زندگی ہی سے مسلم تھی۔ زندگی کی ابتدائی منزل ہی میں زبانِ عام نے آپؐ کو امین کا خطاب دے دیا تھا۔ لین دین۔ عہد و پیمان اور حق رسانی کے معاملہ میں آپؐ کا کردارِ مبارک اس قدر بلند تھا کہ ہر موافق و مخالف معترف ہو گیا تھا۔ مکی زندگی کے آخری ایام میں اہلِ مکہ نے آپ کے خلاف بغض و عناد کی انتہا کر دی تھی۔ نوبت یہ کہ آپ کی جان لینے کے درپے ہو گئے مگر اخلاقِ نبویؐ کی معجز طرازی دیکھئے کہ اس عالم میں بھی یہی لوگ اپنی امانتیں آپ کے پاس رکھتے

---

[1] سورہ انفال آیت ۵۶ تا ۵۸

تھے۔ ہجرت کے موقع پر دشمن نے خانۂ نبوت پر گھیرا ڈال رکھا تھا تاکہ جس وقت آپؐ دروازے سے قدم نکالیں آپؐ پر تلواریں برسادی جائیں۔ آپؐ گھر سے نکلنے کی تدبیر کرتے ہیں مگر ساتھ ہی یہ فکر بھی دامن گیر ہے کہ یہ امانتیں کسی طرح صحیح وسالم مالکوں کے پاس پہنچ جائیں۔ اس مقصد کے لئے اپنے پیارے چچا کے پیارے بیٹے حضرتِ علیؓ کو مکان میں اکیلا چھوڑ جاتے ہیں کہ امانتیں ٹھکانے پہنچا کر آئیں۔ حضرتِ علیؓ کی جان موت کے خطرہ میں پڑ گئی۔ لیکن امانت کی لاج رکھنے کے لئے یہ سب کچھ گوارا کیا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے محفوظ رہے اور امانتیں لوٹا کر مدینہ کو ہجرت کی۔

ایک اور واقعہ سُنئے۔ مکہ کا شہر فتح ہو چکا تو آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کعبہ کے کلید بردار عثمان کو بلایا۔ یہ وہ شخص تھا کہ ایک دفعہ جب آپؐ نے کعبہ میں داخل ہونا چاہا تھا تو اس نے چابی دینے سے انکار کر دیا تھا۔ آج اس نے حاضر ہو کر چابی پیش کی۔ فارغ ہونے کے بعد آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرتِ عباسؓ نے درخواست کی کہ چابی مجھے عطا کر دیجئے۔ فرمایا: نہیں۔ یہ عثمان کا حق ہے۔ کنجی اسے لوٹا دی۔

آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس سب سے بڑی امانت پیغامِ الٰہی کی تھی۔ یہ پیغام آپؐ نے انتہائی مشکلات اور مصائب سہہ کر دنیا کو پہنچایا۔ انسانیت کے لئے ابدالآباد تک یہ ایک ایمان افروز درس رہے گا۔ آپؐ کو اس امانت کے ادا کرنے کی آخر دم تک فکر تھی۔ حجۃ الوداع کے موقع پر صحابہؓ سے پوچھا کہ تم سے میرے بارے میں پوچھا جائے گا تو کیا کہو گے؟ صحابہؓ نے عرض کی کہ آپؐ نے خدا کا پیغام پہنچا دیا ہے اور اپنا فرض ادا

کر دیا ہے آپؐ نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور تین بار فرمایا:

اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ

(اے اللہ گواہ رہ)

شہادت (گواہی) بھی ایک امانت ہے۔ شہادت کے ادا کرنے پر اللہ تعالیٰ نے اس قدر تاکید کی ہے کہ اسے اپنی چیز کہا ہے اور حکم دیا ہے کہ چاہے تمھیں نقصان اٹھانا پڑے سچ شہادت ادا کرو۔[1]

---

[1] سورۂ مائدہ آیت ۸ اور ۱۰۶ تا ۱۰۸

عَفُو

مفہوم عفو کا لفظ اضداد میں سے ہے۔ یہ کمی اور زیادتی دونوں کے معنی رکھتا ہے۔ مثلاً:

(۱) يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ۔ (آپ سے پوچھتے ہیں) کہ کیا خرچ کریں۔ فرمائیے جو بچت ہو)

یہاں عفو کا لفظ زیادت کے لئے مستعمل ہے۔

(۲) عَفَتِ الدِّيَارُ مَحِلُّهَا فَمُقَامُهَا۔ (دیار مٹ گئے ان کے محل بھی اور مقام بھی)

یہاں عفو کا لفظ مٹانے کے معنی دیتا ہے۔

قرآن حکیم میں عفو کا لفظ اکثر مغفرت کے مترادف آیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا بندے کے گناہ کو ڈھانپ دینا، میٹ دینا یا بخش دینا۔

عفو کے مراتب عفو کا ادنیٰ مرتبہ یہ ہے کہ معاف کرتے وقت طبیعت پر کچھ جبر کرنا پڑے۔ اوسط درجہ یہ ہے کہ آدمی دل کی خوشی سے معاف کرے۔ اعلیٰ ترین مرتبہ یہ ہے کہ ممکن ہو تو عفو کے ساتھ احسان بھی کرے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب ہجرت کی تھی تو اہل مکہ نے مہاجرین کے مکانوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ فتح مکہ کے بعد حضورؐ نے یہ مکانات انہی کے قبضہ میں رہنے دیئے۔

حضرت حسین رضؓ کا ایک غلام تھا۔ ایک دن وہ آپ کے لئے وضوء کا پانی لایا۔ جب آپ وضوء سے فارغ ہوئے اور غلام نے کوزہ اٹھایا تو اتفاق سے کوزہ حضرتِ حسین رضؓ کے چہرہ مبارک سے ٹکرا گیا جس سے آپ کے ایک دانت کو صدمہ پہنچا۔ آپ نے غلام پر نگاہ ڈالی اور اس کے بعد یوں مکالمہ ہوا:

غلام: (اپنی خطا پر گرفت کے خوف سے)

وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظِ:۔ (اور غصہ دبانے والے)

حسین رضؓ: میں نے اپنا غصہ فرو کر دیا

غلام: وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاس (اور لوگوں سے درگذر کرنے والے)

حسین رضؓ: میں نے تجھے معاف کیا۔

غلام: وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْن ؛ (اور اللہ محسنین کو چاہتا ہے)

حسین رضؓ: تم آزاد ہو۔ جا سکتے ہو۔

غلام: اور میری آزادی کا پروانہ؟

حسین رضؓ: تلوار اور ڈھال دیتا ہوں ان کے سوا میرے گھر میں کچھ نہیں[1]

یہ اعلےٰ ترین عفو ہے۔

اہمیت

(۱) عفو صفتِ الٰہی ہے:

اسلام نے عفو پر بہت تاکید کی ہے۔ اسے ایک عظیم اخلاقی فضیلت قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو اس صفت سے مُتّصِف بتایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں ایک نام عَفُوٌّ بہت

---

[1] دلیل الفالحین باب الصبر

معاف کرنے والا) ہے۔ اس کے مرادف غفّار اور ستّار ہیں۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ بار بار اپنی طرف سے عفو و مغفرت کا اعلان کرتا ہے اور لوگوں کو جو اس کی رحمت سے مایوس ہو جائیں کافر گردانتا ہے۔

قرآن حکیم میں کئی جگہ تلقین ہے کہ تم عفو سے کام لو۔ سورۂ انعام میں ارشاد ہے کہ اگر تم دوسروں کے ساتھ کھلم کھلا بھلائی کرو یا چھپا کر یا کسی کی برائی سے درگزر کرو تو اللہ تعالیٰ بھی معاف کرنے والا اور قدرت رکھنے والا ہے۔ اس ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ باوجود قدرت کے بندوں کی برائیوں سے درگزر کرتا ہے۔ تم بھی ان کی برائیوں کو نظر انداز کر دو۔ اس بلیغ انداز سے اس بات کو ذہن نشین کرانا مقصود ہے کہ بندوں کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا پرتو قبول کریں اور جہاں تک ہو سکے دوسروں کی لغزشوں کو معاف کر دیا کریں۔

اللہ تعالیٰ کے عفو کا اندازہ کرنا انسانی فہم کے بس میں نہیں۔ انسان جب سچے دل سے توبہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے سارے گناہ معاف کرکے اسے اپنی رحمت سے ڈھانپ لیتا ہے۔ حدیث نبوی ؐ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ سے اس طرح خوش ہوتا ہے جیسے وہ شخص جو دشت میں تھا اور اس کی سواری بھاگ گئی۔ اس پر کھانے پینے کا سامان تھا۔ وہ مایوس ہو کر درخت کے سایہ میں پڑ گیا اور اس کی سواری اچانک لوٹ آئی۔[۱]

(۲) اللہ تعالیٰ ان کو معاف کرتا ہے جو اللہ کے بندوں کو معاف کرتے ہیں۔

[۱] ریاض الصالحین باب التوبہ

اللہ تعالیٰ کی مغفرت بے حد و بے کنار ہے۔ حدیثِ قُدسی ہے کہ اے ابنِ آدم! تو زمین کو اپنی خطاؤں سے بھر کر بھی میرے پاس آئے اور مجھے اس حالت میں ملے کہ تو میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا ہو تو میں زمین کو مغفرت سے بھر کر تیری طرف توجہ کروں گا[۱] لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالےٰ کی رحمت کی وسعتیں اسی کے لئے ہیں جو اوروں کی خطاؤں اور ایذاؤں سے درگزر کرتا ہے آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ پیر اور جمعرات کے روز جنّت کے دروازے کھُل جاتے ہیں اور ہر اُس شخص کی مغفرت ہو جاتی ہے جو شرک نہیں کرتا سوائے اُس شخص کے جس کی اپنے مسلمان بھائی سے عداوت ہو۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے کہتا ہے: ان کی صلح کا انتظار کرو۔ ان کی صلح کا انتظار کرو[۲]

حضرتِ ابوبکرؓ کا ایک خالہ زاد بھائی مسطح نام تھا۔ حضرتِ ابوبکرؓ نے اسے یتیمی میں پرورش کیا تھا۔ اس کے بعد بھی اس کی ہمیشہ امداد فرماتے رہے۔ انھوں نے حضرتِ ابوبکرؓ کے دل کو ایک سخت صدمہ پہنچایا۔ حضرت ابوبکرؓ نے قسم کھالی کہ آئندہ مسطح کو خرچ نہیں دوں گا۔ اس پر سورۂ نور کی ایک آیت نازل ہوئی جس میں ارشاد ہوا:

"فراخ حال اصحاب اس بات کی قسم نہ کھائیں کہ وہ اہلِ قرابت اور مساکین وغیرہ کو مدد نہ دیں گے۔ ان کو چاہیے کہ معاف کریں اور درگزر کریں۔ اے مسلمانو! کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تمھاری مغفرت کرے۔"

---

[۱] ریاض الصالحین باب فضل البکاء.... الخ [۲] ریاض الصالحین باب النہی عن التباغض۔ الخ

اس آیت میں اس بات کی طرف واضح اشارہ ہے کہ اگر تم لوگ اللہ کے بندوں کو معاف نہیں کروگے تو اللہ بھی تمھیں معاف نہیں کرے گا حضرت ابوبکر رضؓ نے یہ آیت سنتے ہی بے ساختہ کہا، ہاں میں چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری مغفرت کرے۔ اس کے بعد انھوں نے مسطح کا خرچ پھر اٹھا لیا۔

(۳) عفو ایمان والوں کی صفت ہے:

سورۃ الشوریٰ میں اہل ایمان کی ایک صفت یہ بتائی گئی ہے:

وَاِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُوْن

(اور جب انھیں غصہ آئے تو معاف کر دیتے ہیں)

(۴) عفو دوست و دشمن کے لئے مطلوب ہے:

عفو کا حکم مسلمانوں ہی میں نہیں۔ غیر مسلموں کے ساتھ بھی حتی الوسع عفو اور درگزر سے پیش آنا چاہیے۔ سورۃ الجاثیہ میں واضح الفاظ میں یہ ہدایت ہے:

"قُلْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ"

یعنی ایمان والوں کو چاہیے کہ کفار سے درگزر کریں۔ سورۂ مائدہ (آیت ۱۳) میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہود کے بارے میں ارشاد ہے کہ آپؐ کو ان کی خیانت کی خبر برابر ملتی رہے گی لیکن آپؐ انھیں معاف کریں اور درگزر فرمائیں۔

سورہ اعراف (آیت۔ ۱۹۹) میں ارشاد ہے:

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ۔

(اے نبی عفو کی خو رکھیے، نیکی کا حکم دیجیے اور جاہلوں سے کنارہ کیجیے۔)

زندگی کا یہ سنہری اصول ہے کہ جہاں تک ممکن ہو لوگوں کی دلآزاری اور نقصان رسانی سے دل پریشان نہیں کرنا چاہیے۔ ہر مسلمان نیکی کا مُبلّغ ہوتا ہے۔ اگر وہ بات بات پر لوگوں سے الجھتا رہے تو کسی شخص کو اپنے پیغام سے متاثر نہیں کر سکتا۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ کے لئے طائف تشریف لے گئے تو وہاں کے سرداروں نے آپؐ سے بہت گستاخانہ کلام کیا۔ انھوں نے شہر کے اوباشوں کو آپؐ کے خلاف اُکسایا۔ وہ بازار کے دونوں طرف بیٹھ گئے۔ جب آں حضورؐ وہاں سے گزرے تو آپؐ پر پتھر پھینکے۔ بدن مبارک سے خون جاری ہو گیا۔ آپ شہر سے باہر تشریف لائے تو جبرئیل امین حاضر ہوئے اور کہا، آپؐ کہیں تو یہ پہاڑ طائف والوں پر گرا دوں۔ آپؐ نے فرمایا، نہیں مجھے توقع ہے کہ ان کی اولاد سے اہلِ ایمان اُٹھیں گے۔

مکہ فتح ہوا تو آپؐ نے سب لوگوں کو معاف کر دیا حالانکہ انھوں نے آپؐ پر ستم ڈھانے میں کمی نہیں کی تھی۔ یہاں تک کہ اپنے چچا کے قاتل کو بھی معاف کر دیا۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم بارہا جنگی قیدیوں کو بغیر فدیہ کے رہا فرما دیا کرتے تھے۔

حدیث نبوی ہے کہ مسلمانوں کا افضل ترین اخلاق عفو ہے۔ ایک اور حدیث ہے کہ خدا کا کوئی بندہ اس وقت تک صاحبِ تفضیلت نہیں ہوتا جب تک کہ تعلق توڑنے والوں سے تعلق نہ جوڑے، ظلم کرنے والے کو معاف نہ کرے اور جس نے اس سے بخل کیا تھا اسے عطا نہ کرے[1]

---

[1] تفسیر نیشاپوری

(۵) عفو قاتل کے لئے:

کوئی آدمی کسی کو قتل یا زخمی کر دے یا اسے مارے پیٹے تو قرآنِ حکیم کا یہ حکم ہے کہ اس سے انتقام لیا جائے۔ اسے قصاص کہتے ہیں۔ قرآن حکیم نے قصاص کی اس قدر اہمیت جتائی ہے کہ قصاص کو زندگی کا سرچشمہ بتایا ہے لیکن یہاں بھی یہ حکم ہے کہ مجرم کو ماخوذ تو ضرور کیا جائے لیکن مظلوم اگر اسے معاف کرنا چاہے تو حکومت بھی مجرم کو معاف کر دے۔ سورۂ شوریٰ (آیت۔ ۴۰) میں ارشاد ہے کہ

"ضرر کا بدلہ اس کے برابر کا ضرر ہے۔ پر جس نے معاف کیا اور (باہمی تعلقات کی) اصلاح کر دی تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔"

(۶) غصّہ دبانا

غصہ اور بغض کا دیو انسانیت کو پامال کر دیتا ہے۔ اس کے جلو میں تباہی اور تخریب کے صف بہ صف لشکر آتے ہیں۔ اس دیو کو زنجیروں میں مقید رکھنا چاہیے۔ قرآنِ حکیم میں کَاظِمِینَ الغَیظِ یعنی غصہ دبانے والوں اور عَافِینَ عَنِ النَّاسِ یعنی لوگوں کو معاف کرنے والوں کو متقین میں شمار کیا گیا ہے جن کی جزا جنت ہے [۱] آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کسی مسلمان کو حلال نہیں کہ اپنے مسلمان بھائی سے تین روز سے بڑھ کر تعلق قطع رکھے [۲] آپ نے ایک بار ایک نبی کی مثال سنائی جس کو قوم نے زخمی کر کے اس کا خون رواں کر دیا لیکن نبی کا یہ حال تھا کہ ادھر چہرے سے خون

---

[۱] پارہ ۴ ع ۵ [۲] ریاض الصالحین باب النہی عن التباغض ..... الخ۔

پونچھ رہا تھا اور اُدھر اللہ تعالےٰ سے دُعا کر رہا تھا کہ اے اللہ میری قوم کو معاف کر دے کیوں کہ وہ نادان ہیں[1] ایک دن ایک صحابی نے آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں درخواست کی کہ مجھے نصیحت فرمائیے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا، غصہ نہ کیا کر۔ صحابیؓ کو اس نصیحت کی گہرائی کا علم نہ تھا۔ برابر اپنا سوال دہراتے گئے۔ لیکن حضورؐ نے ہر بار یہی فرمایا کہ غصہ نہ کر۔

غصہ کو آدمی قابو میں نہ رکھے تو حواس کھو بیٹھتا ہے اور بارہا ایسی ناکردنی حرکت کر جاتا ہے جو قانون کی نگاہ میں قابلِ گرفت یا اخلاق کی نگاہ میں قابلِ نفرین ہوتی ہے۔ بلکہ بارہا تو بے لگام غصہ ایمان ہی کو ڈبو دیتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس طرح ایلوے کا رس شہد کو بگاڑتا ہے اسی طرح غصہ ایمان کو خراب کرتا ہے[2]

عفو کی حد

انسان کے اندر دفاع کا قدرتی جذبہ پایا جاتا ہے۔ جب اس پر کوئی حملہ کرتا ہے تو وہ اس کا مقابلہ کرتا ہے۔ اور جو اسے نقصان پہنچائے اس سے انتقام لینا چاہتا ہے یہ جذبہ انسان کی فطرت کا عنصر ہے اس لئے اس کو نابود نہیں کیا جا سکتا۔ قرآنِ حکیم میں اس جذبہ پر تصرف میں رکھنے والوں کو کَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ کہا گیا ہے یعنی غصہ کو دبانے والے نہ کہ مٹانے والے۔ دفاع کا یہ جذبہ اعتدال کے اندر ہو تو گوناگوں منافع کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے بغیر انسان میں اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کو بچانے کی لگن کبھی پیدا نہیں ہو سکتی اور مردانہ جذبات اس سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اس کے صحیح استعمال کے لئے مندرجہ ذیل

---

[1] ریاض الصالحین باب العفو ..... الخ۔ [2] باب الغضب

نکات کو ذہن نشین رکھنا چاہیے۔

(۱) جذبۂ دفاع کو افراط و تفریط ـــــ بچانا چاہیئے۔ اگر یہ بہت بڑھ جائے تو آدمی پر ہر وقت خود پرستی کا بھوت سوار رہتا ہے وہ مغرور ہو جاتا ہے اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے۔ بات بات پر بھڑک اٹھتا ہے اور مجنونانہ حرکات کرتا ہے۔ اس جذبہ کو اس قدر گھٹایا بھی نہ جائے کہ انسان بزدل ہو جائے اور مردانگی کا جوہر کھو بیٹھے۔ انفرادی اور قومی خودداری کے لئے اس کا موجود رہنا ضروری ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کو اعتدال میں رکھا جائے۔

۲- اس جذبہ کو اعتدال میں رکھ کر اس عمدگی سے بروئے کار لایا جائے کہ اس سے نہایت بلند مقاصد حاصل ہوں اور اس کی وجہ سے دیگر انسانوں کے اخلاق پر نہایت کار آمد اور نفع بخش اثر پڑے۔

عفو کی فضیلت سے مراد یہ نہیں کہ آدمی کسی وقت انتقام ہی نہ لے۔ بعض حالات میں انتقام نہایت ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی آدمی ایسا جرم کر بیٹھتا ہے جس کی اللہ تعالیٰ کے قانون میں سزا مقرر ہے یا کسی پر ظلم کرتا ہے تو حکومت کو حق نہیں کہ اسے معاف کر دے یہاں عدل کو ملحوظ رکھنا پڑے گا۔

آئے دن کی زندگی میں بھی بعض دفعہ ہم دیکھتے ہیں کہ عفو کا بعض طبائع پر الٹا اثر پڑتا ہے۔ وہ انتقام کے مستحق ہوتے ہیں۔ جناب ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مبارک میں مدینہ میں یہود کے کئی قبائل آباد تھے۔ یہ نہایت کینہ پرور اور اسلام کے دشمن تھے۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جہاں تک ہو سکا ان سے مروت کا سلوک کیا لیکن جب دیکھا کہ نیک سلوک

پر یہ لوگ اُلٹا اور دلیر ہو رہے ہیں اور ان کی شرارت پھیلتی ہے تو آپؐ نے مجبور ہو کر انھیں ایسی سزا دی جس کے وہ مستحق تھے۔

ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ عفو کی بھی ایک حد ہے۔ لیکن جہاں تک عفو کی حدود کا تعلق ہے حق یہ ہے کہ اس کے کنارے اس قدر وسیع ہیں کہ بے آسانی سے محدود نہیں کیا جا سکتا۔ عفو میں یہی خوبی ہے کہ محدود ہوتے ہوئے بھی نہایت وسیع ہے۔ اس کی ساری خوبی اور کشش اس کی وسعت میں ہے۔ یہ ہمیشہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ جہاں بھی عفو سے کوئی فائدہ متصور ہوتا ہو اور دینی یا اخلاقی حدود پر حملہ نہ ہوتا ہو اس سے کبھی دریغ نہیں کرنا چاہیے۔

ثمرات

(۱) معاشرہ کی سالمیت

انسانی معاشرہ اسی صورت میں سالم رہ سکتا ہے کہ اس کے افراد ایک دوسرے سے تعلق نہ توڑیں۔ یہ جبھی ممکن ہے کہ ایک دوسرے کی فروگذاشتوں اور قصوروں کو دل میں جگہ نہ دی جائے۔ کون ہے جس سے غلطیاں اور خطائیں سرزد نہیں ہوتیں۔ اگر ہر شخص دوسرے کی خطا پر دل میں گرہ ڈال لے تو کشیدگی بڑھتی رہے گی اور اصلاح کی صورت نظر نہیں آئے گی۔

عفو کے چھینٹے کینہ کی آگ کو بجھا دیتے ہیں۔ معلم برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ایک دوسرے کو معاف کرو۔ تمھارے باہمی کینے رفع ہو جائیں گے[1]

آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے غصے کے اس گھونٹ سے کوئی گھونٹ افضل نہیں ہوتا جو اللہ کی خاطر پیا جائے[2]

---

[1] کنز العمال جلد ۲ [2] مشکاۃ باب الغضب۔

عفو کے دم سے محبت کی دنیا میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ دشمن دوست ہو جاتے ہیں۔ پہلے ان کی یاد اور ملاقات سے رنج و ملال کی تلخی پیدا ہوتی تھی اب راحت اور مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اگرچہ غصہ کا دبانا زہر کا گھونٹ پینے کے برابر ہے لیکن اس زہر کے گھونٹ کا بعد میں اتنا میٹھا اثر ہوتا ہے کہ عمر بھر اس کی شیرینی کا مزا نہیں جاتا۔ حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ دودھ یا شہد کے ہر گھونٹ سے غصہ کا گھونٹ بہتر ہوتا ہے۔[1]

عفو کے بدولت ایثار کا جذبہ قوت مند ہوتا ہے۔ ایثار وہ جذبہ ہے جس کے ہوتے ہوئے کسی معاشرہ کی صفوں میں ضعف پیدا نہیں ہو سکتا۔

(۲) عزم و حوصلہ کی تربیت اور عزت و کامرانی:

اقوام کی کامرانی اور ظفر مندی کی پہلی شرط عزم و حوصلہ ہے۔ عزم و حوصلہ کا ایک سرچشمہ عفو کی صفت ہے۔ بلکہ عفو، عزم و حوصلہ کا دوسرا نام ہے۔ قدرتی بات ہے کہ جس اخلاقی صفت کو جتنا بروئے کار لایا جائے وہ اتنی قوی ہوتی جاتی ہے۔ عفو سے جس قدر کام لیا جائے فراخ حوصلگی کی اتنی ہی تربیت ہوتی ہے۔ سورۃ الشوریٰ میں ارشاد ہے:

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ

(اور جس نے تحمل کیا اور معاف کیا تو بے شک یہ تحمل کے کام ہیں)

عزم و حوصلہ انسان کی قوتوں کا ایک بہت بڑا سرچشمہ ہے۔ اس سے انسان کی استقامت اور شانِ مردانہ میں کمال پیدا ہوتا ہے جو انسانی شرف اور اعزاز کا مدار ہے۔ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد

---

[1] کنز العمال جلد ۲

ہے کہ اللہ تعالےٰ عفو کے عوض بندے کی عزت بڑھاتا ہے[1] ایک دفعہ حضرتِ موسیٰ نے اللہ تعالےٰ سے سوال کیا کہ اے رب! تیرے نزدیک بڑی ترین اور معزز ترین بندہ کون ہے؟ جواب ملا، جس نے قدرت رکھنے کے باوصف معافی دے دی[2]

غصہ سے جلد مغضوب ہو جانا اعصابی روگ ہے۔ تندرست جذبات اور تنومند اعصاب کے لوگ مغلوب الغضب نہیں ہوتے۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

سخت گیر پنجے والا آدمی وہ پہلوان نہیں جو دوسرے کو پچھاڑ پچھاڑ دیتا ہے بلکہ وہ مرد ہے جو غصہ کے وقت اپنے کو قابو میں رکھتا ہے[3]

الغرض غصہ سے اعصابی کمزوری بڑھتی ہے اور عفو کے دم سے اعصابی قوت اور عزم و حوصلہ کو فروغ ہوتا ہے۔

(۳) تبلیغ اسلام:

اسلام کی تبلیغ میں مسلمانوں کے کردار کو بہت دخل ہے۔ ایک وقت تھا کہ غیر مسلم اقوام اہل اسلام کے کردار ہی کو دیکھ کر ان کے دین پر فریفتہ ہو جاتی تھیں۔ اکثر یوں ہوتا تھا کہ مسلمانوں نے جب کوئی ملک فتح کیا عفو عام کا اعلان کر دیا اور سب کو امان دے دی۔ غیر مسلم یہ شان رحمت دیکھ کر جوق در جوق دین اسلام سے وابستہ ہو جاتے تھے۔ انسان کے کردار میں سے کسی صفت کا اتنا گہرا اثر نہیں پڑتا جتنا عفو کا

---

[1] ریاض الصالحین باب التواضع [2] کنز العمال جلد دوم۔
[3] ریاض الصالحین باب الصبر۔۔۔۔ الخ (متفق علیہ)

(۴) اللہ کی مغفرت:

اس موضوع پر کئی آیات اور احادیث گزر چکی ہیں کہ اللہ تعالیٰ اُسی کو بخشتا ہے جو اوروں کو بخشے۔ سورۂ مائدہ (آیت۔ ۴۵) میں بتایا گیا ہے کہ مظلوم کا ظالم کو معاف کرنا مظلوم کے گناہوں کا کفّارہ ہوگا۔

عدل

مفہوم عدل کے لغوی معنی ہیں ؛

سیدھا کرنا
برابر تقسیم کرنا
توازن قائم کرنا
دو چیزوں میں مساوات قائم کرنا

انصاف کا لفظ بہت حد تک عدل کا ہم معنی ہے ۔ انصاف کے لغوی معنی ہیں کسی چیز کو دو برابر کے نصف حصوں میں بانٹنا[1]

حضرت داتا گنج بخش لکھتے ہیں کہ عدل کے معنی ہیں کسی چیز کو اس کے صحیح موقع و محل میں رکھنا ۔ اس کی ضد ظلم کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کو ایسی جگہ رکھنا جو اس کے لائق نہ ہو[2] امام غزالیؒ کے ہاں بھی یہ معنی ملتے ہیں ۔

عدل کے ساتھ کا ایک اور لفظ اعتدال ہے جو عدل ہی سے نکلا ہے ۔ اس کے لغوی معنی ہیں میانہ روی ۔ یہ عدل کا وسیع تر مفہوم ہے ۔ اس

---

[1] ان معانی کے لئے دیکھئے لسان العرب ، سورۃ الانفطار اور سورۃ الانعام ۔ [2] کشف المحجوب ۔

لحاظ سے عدل کے مقابل جوَر کا لفظ ہوگا جو حد سے نکلنے کے معنی دیتا ہے۔
احادیث میں بجائے اعتدال کے اقتصاد کا لفظ آیا ہے۔ قرآنِ حکیم میں عدل کے لئے قِسط کا لفظ بھی آیا ہے۔

اہمیّت

۱۔ عدل کائنات کی جان ہے۔

عدل نظامِ عالم کی جان ہے۔ یہ وہ اصول ہے جس کے سہارے کائنات کا سارا کارخانہ چل رہا ہے۔ ہر شے ایک مقررہ مقدار میں ہے۔ کائنات کے سب اجزاء ایک مکمل توازن میں ہیں۔ اس توازن کو قرآنِ حکیم میزان کے نام سے بھی یاد کرتا ہے۔
اجزائے عالم کے درمیان ایک پختہ توازن ہے۔ اگر یہ توازن قائم نہ رہے تو کائنات کا نظام ٹوٹ جائے۔ مقداروں میں غیر طبعی کمی بیشی ہو، ایک شے دوسری کے دائرۂ عمل میں داخل ہونے لگے، چاند سورج کے حلقہ میں آجائے اور سورج مریخ کی دنیا میں دخیل ہوجائے اور کائنات کا شیرازہ آناً فاناً بکھر جائے مگر اللہ تعالیٰ کی حکمت اور عدل نے ہر چیز کی مقدار کانٹے کے تول مقرر کردی ہے اور اس کا دائرۂ عمل متعین کردیا ہے۔
انسانی بدن بھی عدل ہی کا مرہونِ منّت ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

"اے انسان! تو اپنے ربّ کریم سے کیوں بھٹک گیا جس نے تیری تخلیق کی۔ پھر تجھے ہموار ترکیب دی اور پھر تجھ میں عدل (توازن)

لہ الشوریٰ۔ ۱۷۔ الرحمٰن، ۱تا۹۔

قائم کیا۔[۱]

۲۔ عدل صراطِ مستقیم پر چلاتا ہے:

عدل انسان کو سیدھی راہ پر چلاتا ہے اور افراط و تفریط یعنی کمی بیشی کرنے سے بچاتا ہے۔ اسے عام لغت میں اعتدال کہتے ہیں۔ سورۃ النحل (آیت ۔ ۷۶) سے ثابت ہوتا ہے کہ اپنے بدن کو نیکی میں لگانا، نکمانہ رہنا اور دوسروں پر بوجھ نہ بننا عدل کا عین تقاضا ہے۔ اس سے آدمی صراطِ مستقیم پر قائم رہتا ہے۔

۳۔ قرآن کی تعلیم عدل کی تعلیم ہے۔

قرآنِ حکیم سراپا عدل ہے اور انسان کو میانہ روی سکھاتا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا

(الانعام ۔ ۱۱۵)

(اللہ تعالےٰ کا کلمہ صدق و عدل میں کامل ہے)

لہٰذا قرآنِ حکیم پر عمل کرنا عدل ہے اور گناہ کا مرتکب ہونا ظلم۔ قرآنِ حکیم میں گناہ کو اپنی ذات پر ظلم کرنے کے برابر بتایا گیا ہے۔

۴۔ اُمتِ مسلمہ وسطی اُمت ہے:

اعتدال اور میانہ روی کی اسلام میں جو اہمیت ہے اس کے اندازہ کے لئے یہی جان لینا کافی ہے کہ اسلام کا ایک نام مذہب اعتدال بھی ہے اور امتِ اسلامیہ کو قرآنِ حکیم میں اُمتِ وَسَط (وسطی اُمت) بھی کہا گیا ہے۔

حدود | عدل کے بغیر بے شک انسانی معاشرہ قائم نہیں رہ سکتا لیکن

---

[۱] الانفطار ۔ ۷

بعض معاملات میں احسان کا اصول عدل سے بڑھ کر مفید رہتا ہے۔ قرآن حکیم سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر تم پر کوئی ظلم کرے تو بے شک برابر کا بدلہ لو لیکن معاف کردو تو یہ زیادہ بہتر ہوگا۔ یہ احسان ہے ۔ احسان کی اجازت صرف مظلوم کو ہے۔ حاکمِ عدالت اپنی طرف سے کسی ظالم کو معاف نہیں کر سکتا۔

اللہ تعالےٰ کی سب سے بڑی صفت رحمت ہے۔ وہ بے شک عادل ہے لیکن یہ اس کی سب سے بڑی صفت نہیں۔ عیسائیت اور اسلام میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ عیسائیوں کے نزدیک اللہ تعالےٰ کی سب سے بڑی صفت عدل ہے اور مسلمانوں کے نزدیک رحمت۔ یہی وجہ ہے کہ جب مسلمانوں کو دنیا میں عروج حاصل ہوا تو وہ ہر قوم کے لئے رحمت کے سفیر ثابت ہوئے۔

عدل کی شروط

عدل کے لئے مندرجۂ ذیل بنیادوں کا ہونا ضروری ہے:-

(۱) شرعی حدود کا پہچاننا:

جب تک شرعی حدود، حرام و حلال اور جائز و ناجائز کا فرق معلوم نہ ہو اس وقت تک عدل کے رستہ پر قائم رہنا مشکل ہے۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ دین کے بنیادی احکام سے واقفیت رکھے۔ اسے علم ہو کہ صراطِ مستقیم کیا ہے تاکہ اِدھر اُدھر نہ بھٹکے۔

(۲) حرص سے گریز:

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حرص سے بچ کر رہو۔ حرص نے ہی تم سے پہلے لوگوں کو برباد کیا۔ انھیں اس بات پر اکسایا کہ لوگوں کا خون بہائیں اور ان کے جان و مال اور آبرو وغیرہ کو حلال جانیں [۱]

---

[۱] ریاض الصالحین باب تحریم الظلم .....

(۳) راست گوئی:

امام غزالی لکھتے ہیں کہ سچ بولنے سے دل میں راستی اور استقامت آتی ہے اور آدمی اعتدال پر قائم رہتا ہے۔ دروغ گوئی دل میں کجی پیدا کرتی ہے جو انسان کو اعتدال کے رستہ سے دور کردیتی ہے اس لئے دل میں جھوٹے خیالات کو جگہ نہیں دینی چاہیے اور سچ بولنا چاہیے۔

(۴) عدل کا نظام قائم کرنا:

ہر حکومت کا فرض ہے کہ وہ عدل کا نظام قائم کرے۔ دیانت دار پولیس اور قاضی مقرر کرے اور اسلامی قوانین نافذ کرے اس رستے عدل پختہ ہو جائے گا۔

عوام کا بھی فرض ہے کہ معاملات میں نہایت احتیاط برتیں اور ایسے حالات پیدا نہ ہونے دیں جن میں کسی فریق کو بددیانتی کی سوجھے۔ مثلاً جیساکہ قرآن حکیم میں ارشاد ہے قرض کا کوئی معاملہ طے کرنا ہو تو اسے سپرد تحریر کر لیا جائے اور گواہ قائم کر لئے جائیں۔

عدل کے شعبے

عدل کے دو بڑے شعبے ہیں:

انفرادی

اور

جماعتی

ان شعبوں کی حدود کو پہچاننے اور ان کے اندر رہے بغیر عدل کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔

جماعتی عدل میں بھی انفرادی عدل ہی کی روح کارفرما ہوتی ہے لیکن عملی لحاظ سے ان الگ الگ شعبوں میں بحث کرنے سے زیادہ وضاحت حاصل ہوتی ہے۔

(۱) انفرادی عدل

انفرادی عدل کو صرف ایک لفظ اعتدال سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

کامیابی کا راز اعتدال میں ہے۔ عبادات، روزمرّہ کے کام کاج اور کھانے پینے وغیرہ کے معاملہ میں اعتدال پر قائم رہنا ازبس ضروری ہے۔ اس کے بغیر زندگی کے کسی شعبہ میں کامیابی نصیب نہیں ہو سکتی۔ نہ بدنی صحت حاصل ہو سکتی ہے اور نہ روحانی ترقی کی صورت نظر آتی ہے۔ انسان الٹا بدنی اور روحانی امراض میں گرفتار ہو جاتا ہے اور لحظہ بلحظہ تنزل کی پستی میں گرے جاتا ہے۔

زندگی کے سب شعبوں میں اعتدال:

زندگی کے بے شمار شعبے ہیں۔ سب شعبوں کے درمیان اعتدال قائم رکھنا چاہیے۔ آدمی کسی ایک شعبہ میں اتنا نہ کھو جائے کہ دیگر شعبوں کی خبر ہی نہ رہے۔ مثلاً طالب علم کے لئے ضروری ہے کہ وہ حصولِ علم کے ساتھ ساتھ بدنی صحت کا بھی خیال رکھے۔ نہ تو پڑھائی میں اس قدر مصروف ہو جائے کہ صحت تباہ کر ڈالے اور نہ صحت کا اس قدر فریفتہ ہو کر سارا وقت کھیل کود میں گنوا دے۔

اسلام بدنی اور روحانی اعمال میں مکمل اعتدال ملحوظ رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ عبادات اور دنیاوی معاملات کے درمیان توازن قائم رکھنا چاہیے۔ اسلام نہ تو یہ اجازت دیتا ہے کہ دنیا کے کام کاج چھوڑ کر ہر وقت محوِ عبادت رہو اور نہ اس بات کو حلال قرار دیتا ہے کہ دنیا کی مصروفیتوں میں کھو کر اللہ تعالےٰ سے بے خبر ہو جاؤ۔ اسلام میں رہبانیت بھی حرام ہے اور قارونیت بھی حرام۔

رہبانیت یہ ہے کہ آدمی دنیا کو ترک کر دے اور ریاضت اور نفس کُشی کو مایۂ زندگی بنالے۔ قارونیت یہ ہے کہ آدمی صرف مادی ترقی ہی کو انسانی ترقی کی معراج سمجھ لے۔ اگر آدمی مادہ اور روح کے درمیان اعتدال کا رشتہ قائم کرلے تو نہ رہبانیت باقی رہتی ہے اور نہ قارونیت۔ آدمی کا تعلق اللہ تعالیٰ سے بھی قائم رہتا ہے اور بندوں سے بھی۔

حد سے بڑھ کر بوجھ نہ اُٹھانا:

دنیاوی کاروبار ہو یا عبادات، حد سے زیادہ بوجھ اُٹھانا خود کو ہلاک کرنا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

عَلَيْكُمْ بِمَا تُطِيْقُوْنَ [1]

(طاقت بھر بوجھ اٹھاؤ)

جو لوگ ہر وقت عبادت میں مصروف رہ کر ہڈیاں گھلا لیتے ہیں وہ سنّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے انحراف کرتے ہیں۔ حضورؐ نے عبادت کے اعتدال کو اپنی سنّت قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ بے جا سختی اختیار کرنے والے ہلاک ہوتے ہیں[1]۔

جذبات اور مَیلانات میں اعتدال:

اپنے جذبات اور میلانات کو اعتدال میں رکھے بغیر اخلاقی فضیلت حاصل نہیں ہو سکتی۔ جب تک جذبات اعتدال میں نہ ہوں آدمی حالات کا مقابلہ نہیں کر سکتا، اگر دولت کی فراخی آئے تو تعیش میں فنا ہو جاتا ہے اور افلاس کا دور آئے تو در در قرض اور بھیک مانگتا پھرتا ہے۔ کمزور پر رعب گانٹھتا ہے اور طاقتور

---

[1] ایضاً [1] ریاض الصالحین باب الاقتصاد فی العبادۃ۔

کے آگے گردن جھکا دیتا ہے۔ اس کا زندگی میں کوئی مضبوط مؤقف اور تعلم نہیں ہوتا۔ ہوا کا ہر جھونکا اسے اپنے ساتھ اڑائے جاتا ہے۔ جو فیشن پسند آیا اسے فوراً پسند کر لیا اور جس ملک کی معیشت میں کچھ آب و تاب دیکھی اس کی تہذیب بلکہ بد تہذیبی پر بھی لٹو ہو گئے۔ یہ سب بے راہی اور گمراہی اعتدال سے دست بردار ہو جانے کا نتیجہ ہے۔

اخلاقی فضائل کی روح اعتدال ہے۔

اخلاق کا کوئی شعبہ بھی ہو اعتدال ہی پر پختہ رہنے سے اس میں کمال حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً

(ا) گزران کے معاملہ میں نہ تو بخیلی کی اجازت ہے اور نہ فضول خرچی اور عیاشی کی بلکہ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان رہنا ہے۔ اسی کو سخاوت کہتے ہیں۔ سورۃ الفرقان میں اللہ تعالےٰ کے بندوں کی ایک خوبی یہ بتائی گئی ہے:

وَالَّذِيْنَ اِذَا اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا

(اور جس وقت خرچ کرتے ہیں تو حد سے نہیں نکلتے اور نہ تنگی کرتے ہیں اور اس کے درمیان (ان کی) سیدھی گزران ہے)

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

اَلْاِقْتِصَادُ فِی النَّفَقَةِ نِصْفُ الْمَعِيْشَةِ

(خرچ میں اعتدال رکھنا آدھی زندگی ہے)

یعنی

جس شخص نے اعتدال سے خرچ کیا سمجھو اس نے آدھی زندگی کی کامیابی

لہ مشکاۃ باب الرفق۔

فوراً پالی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کیا کرتے تھے کہ مجھے فقر و غنا دونوں حالتوں میں اعتدال عطا کر۔[1]

(ب) دشمن کا مقابلہ آپڑے تو نہ بزدلی دکھانے کی اجازت ہے اور نہ جان کو عمداً ہلاک کرنے کی ضرورت۔ بلکہ ان انتہاؤں کے درمیان رہنا چاہیے۔ اسے شجاعت کہتے ہیں۔

(ج) عوام کے ساتھ میل جول یا عام سلوک میں تکبر کرنا حرام ہے لیکن اس بات کی اجازت بھی نہیں کہ آدمی خود کو ذلیل کر دے۔ اس کا نام حِلم ہے۔

ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت عمر رضؓ سے کہا کہ اللہ تعالیٰ مجھے آپ پر فدا کر دے۔ جواب ملا: پھر تو اللہ تعالےٰ تمھیں ذلیل کرے گا۔

(د) کھانے پینے کے باب میں اسلام کی واضح ہدایات ہیں کہ اعتدال کے اندر رہو۔ یہی صحت کا راز ہے۔ پُرخوری کو حدیث میں کافروں کی علامت بتایا گیا ہے لیکن حد سے بڑھ کر کم خوری بھی ممنوع ہے۔ لہٰذا سوائے رمضان کے اور بعض دیگر خاص خاص صورتوں کے مسلسل روزے رکھنا منع ہے۔

لباس کے معاملہ میں یہ روش رہے کہ نہ تو بہت قیمتی لباس پہنا جائے اور نہ مقدور کے باوصف گھٹیا لباس اختیار کیا جائے۔

(۲) جماعتی عدل

جماعتی عدل کو، ہم مندرجۂ ذیل پانچ انواع میں تقسیم کریں گے،

(۱) کلمۂ عدل

(۲) کسی پر زیادتی نہ کرنا

---

[1] مشکوٰۃ باب جامع الدعاء

(۳) حفظِ مراتب

(۴) ادائے حق

(۵) عدالتی انصاف

ذیل میں ان عنوانوں کا ہم تفصیلی جائزہ لیں گے:

(۱) کلمۂ عدل یعنی حق بات کہنا۔

قرآنِ حکیم میں ارشاد ہے:

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى

(جب تم بات کہو تو عدل ملحوظ رکھو چاہے کوئی قرابت دار ہی کیوں نہ ہو)
اس آیت سے مراد یہ ہے کہ چاہے تمھارے کسی قریبی رشتہ دار ہی کو نقصان کیوں نہ پہنچے تم ہمیشہ عدل کی بات کہو۔ عدل کی بات سے مراد یہاں کلمۂ حق ہے۔ مثلاً اگر کسی رشتہ دار کا کسی کے ساتھ مقابلہ یا جھگڑا ہو اور اس بارے میں کہیں گفتگو آپڑے۔ تو بے لاگ رائے کا اظہار کرے۔ یہ نہیں کہ جان بوجھ کر رشتہ دار کی طرف داری کرے اور مخالف پر اعتراض جڑ دے۔

کلمۂ حق کہنے کے لئے بہت اخلاقی جرأت کی ضرورت ہے بلکہ ارباب اختیار کو تو بعض دفعہ کلمۂ حق پر بہت طیش آجاتا ہے اور وہ خوفناک سزائیں دینے پر اُتر آتے ہیں۔ امام مالک رح کو کلمۂ عدل پر کہنے کی پاداش میں کوڑے کھانے پڑے اور ایسا ہی دور امام ابوحنیفہ رح اور امام احمد بن حنبل رح پر بھی گزرا۔ لیکن دنیا کی کوئی مصیبت انھیں کلمۂ عدل کہنے سے روک نہ سکی۔

یزید کے دربار میں جب اہلِ بیتِ کرام کے سر پیش ہوئے تو ساتھ ہی اسیرانِ سادات کا مظلوم اور بے کس قافلہ بھی تھا۔ ان میں حضرت حسین علیہ السلام کی ہمشیرۂ مکرمہ حضرتِ زینب علیہا السلام بھی تھیں۔ یزید نے

برسرِ دربار حضرت حسینؓ کے خلاف نہایت ظالمانہ کلام کیا۔ اس وقت حضرت زینب کا سہارا سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے اور کوئی نہ تھا۔ ہر طرف موت کے پہرے تھے تاہم آپ نے نہایت بے خوفی سے یزید کو منہ توڑ جواب دیا اور کلمۂ عدل کہہ کر رہیں۔ آپ نے اپنے نانا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اس ارشاد کی منہ بولتی تصویر پیش کر دی:

اَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ عَدْلٍ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ[1]

(ظالم سلطان کے آگے کلمۂ عدل کہنا افضل جہاد ہے)

آئے دن کے معاملات میں جب ہم کسی کے بارے میں رائے کا اظہار کرتے ہیں تو اکثر یوں ہوتا ہے کہ جس کے ساتھ ہمارے تعلقات اچھے ہوں اسے اچھا کہتے ہیں اور جس سے ہم ناراض ہوں اسے بُرا کہتے ہیں۔ عدل کا تقاضا ہے کہ ہماری زبان تعلقات کی اسیر نہ ہو۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے کہ مجھے اللہ کی طرف سے حکم ہے کہ رضا اور ناراضی دونوں حالتوں میں کلمۂ عدل کہوں[2]

(۲) کسی پر زیادتی نہ کرنا۔

بعض لوگ اپنے حقوق کے لئے بہت شور مچاتے ہیں لیکن دوسروں کے حقوق پامال کرنے میں باک نہیں کرتے۔ انھیں عدل کی راہ اختیار کرنی چاہیے اور اپنی طرح دوسروں کے حقوق کو بھی عزیز جاننا چاہیے۔ اپنے فائدہ کی خاطر دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنا ظلم ہے۔

عدل کا تقاضا ہے کہ کسی کی عزت پر حملہ نہ کیا جائے۔ اسے گالی گلوچ نہ دی

---

[1] ریاض الصالحین۔ [2] مشکوٰۃ باب الغضب۔

جائے۔ اسے ناحق پیٹا نہ جائے۔ اس کا مال نہ چھینا جائے اور نہ اس کی چوری کی جائے۔ اس کی غیبت نہ کی جائے اور نہ اس سے حسد کیا جائے۔ یہ صرف چند مثالیں ہیں۔ یہ فہرست بہت طویل ہو سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ظلم کے معاملہ میں پورا پورا انصاف کرے گا۔ آں حضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ میری امت میں مفلس وہ ہے جو قیامت کے روز آئے گا تو اس کے پلّے نماز ہوگی، نہ روزہ اور نہ زکوٰۃ اور اس نے (دنیا میں) کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر بہتان لگایا ہوگا، کسی کا مال کھایا ہوگا، کسی کا خون بہایا ہوگا، اور کسی کو پیٹا ہوگا۔ ہر مظلوم کو اس کی نیکیوں سے کچھ دلوایا جائے گا حتیٰ کہ اس کے حساب میں کوئی نیکی باقی نہیں رہے گی۔ اس کے بعد مظلوموں کے گناہ اس پر ڈالے جائیں گے۔ اور پھر وہ دوزخ میں پھینک دیا جائے گا۔[۱]

بعض لوگ دوسروں سے قرض لے کر مزے سے ہڑپ کر جاتے ہیں۔ یہ بھی ظلم ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ شہید کے سب گناہ معاف کر دئے جائیں گے لیکن قرض معاف نہیں ہوگا۔

(۳) حفظِ مراتب:

سابقہ صفحات میں ہم حضرت داتا گنج بخش رحؒ اور امام غزالی رحؒ کے حوالہ سے دیکھ آئے ہیں کہ عدل کے ایک معنی ہیں ہر چیز کو اس کے صحیح مقام پر رکھنا۔ اس معنی کی رو سے حفظِ مراتب عدل کا ایک نہایت ضروری شعبہ ٹھہرتا ہے۔

---

[۱] ریاض الصالحین

حفظِ مراتب کے معنی ہیں مراتب کا لحاظ رکھنا۔
یعنی:

اہل شخص کے مرتبہ و مقام کو پہچاننا اور اس کا اعتراف کرنا

اور

اس کا مقام چھیننے کی ناحق کوشش نہ کرنا

اور

بغیر استحقاق کے اونچا بننے کی سعی نہ کرنا

حفظِ مراتب کے بغیر امن و اطمینان کی بنیاد مٹ جاتی ہے اور انصاف کا خون ہو جاتا ہے۔ سورۃ القصص میں ارشاد ہے۔

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۚ

(وہ آخرت کا گھر ہے۔ ہم اسے اُن کے لئے وقف کردیں گے جو دنیا میں (ناحق) بڑائی اور فساد نہیں چاہتے)

اہل و نا اہل کا فرق: اگر اللہ تعالیٰ نے کسی کو اہلیت کی بنا پر کوئی بلند مرتبہ دیا ہو تو اس سے حسد نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کے مرتبہ کا احترام کرنا چاہیے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہر قبیلہ کے سردار کا احترام کرو۔ اگر بلند مراتب کا احترام باقی نہ رہے تو اہل و نا اہل کی تمیز اُٹھ جائے گی۔ چنانچہ قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ لئیم ابن لئیم قوم کا سردار ہوگا۔

عمر کا فرق: معاشرہ کے جو افراد عمر کے لحاظ سے بزرگانہ حیثیت رکھتے ہیں ان کی عزت کرنی چاہیے اور جو عمر میں چھوٹے ہوں ان پر شفقت کی

نظر ڈالنی چاہیے۔ اگر کم عمر بچوں کی عمر کا خیال نہ رکھا جائے اور ان سے محبت اور شفقت کا سلوک نہ کیا جائے تو ان کی ذہنیت پر بہت بڑا اثر پڑتا ہے۔ اُن سے یہ توقع رکھنا کہ وہ ہر بات میں بزرگوں کی سی ذمہ داری کا ثبوت دیں ان پر زیادتی ہے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس آدمی نے بزرگ مسلمان کی توقیر نہ کی اور کم عمر فرد پر رحم نہ کیا وہ ہم میں سے نہیں۔ مراد یہ ہے کہ چھوٹے بڑے ہر ایک کے مرتبہ کا خیال رکھا جائے اور کسی کی ہتک یا دل شکنی نہ کی جائے۔

معاشی فرق: حفظِ مراتب کے سلسلہ میں مساوات کا سوال اٹھتا ہے۔ بعض لوگ مساوات کے جوش میں ہر ایک کو مساوی سطح پر رکھنا چاہتے ہیں لیکن یہ قانونِ قدرت کی خلاف ورزی ہوگی۔ ان لوگوں کو معاشی اور مساوات میں فرق ملحوظ رکھنا چاہیے۔

معاشرتی مساوات یعنی احترامِ آدمیت کے معاملہ میں تو سب برابر کے حق دار ہیں فرق یہ ہے کہ کسی کے حق میں ادب کا پہلو غالب ہے اور کسی کے حق میں شفقت کا لیکن معاشی مساوات میں اس قسم کی برابری ناممکن ہے۔ معاشی مساوات یہ ہے کہ ہر ایک کے لئے کام کاج اور ترقی کے برابر مواقع مہیا ہوں۔ یہ نہیں کہ امراء کے بیٹوں کو تو بلند عہدوں سے نوازا جائے اور غریبوں کو اہلیت کے باوجود نظر انداز کر دیا جائے۔ یہ ظلم ہوگا جو آدمی اپنی ہمت اور قابلیت کے سہارے بلند مقام پیدا کرتا ہے اس کے مرتبہ کا اعتراف کرنا چاہیے۔ یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ جو آدمی نہ اہلیت رکھتا ہو نہ اخلاق اور نہ قومی خدمت انجام دیتا ہو اسے بھی ترقی دی جائے۔

اعتقادات اور حفظِ مراتب: اگر اعتقاد کے معاملہ میں اعتدال

کو مدِ نظر نہ رکھا جائے تو غُلوّ پیدا ہوتا ہے۔ غُلوّ کے معنی ہیں دینی معاملات میں حد سے بڑھ جانا یعنی اعتدال سے باہر ہو جانا۔

اعتقادی غُلوّ نے کئی اقوام کو گمراہ کر دیا۔ مثلاً انھوں نے نبی کو خدا کے درجے پر پہنچا دیا اور کہا کہ عیسیٰ اللہ تعالیٰ کے بیٹے تھے۔ اسلام نے اس غُلوّ سے منع کیا ہے اور ایسی صاف اور واضح تعلیمات دی ہیں جن کی روشنی میں اللہ تعالیٰ، انبیائے کرام اور صالحین کے مراتب میں غلط فہمی پیدا نہیں ہو سکتی۔

(۱۴) ادائے حق: یعنی کسی کا حق پورا پورا ادا کرنا۔

ہر انسان پر متعدد حقوق عائد ہوتے ہیں جن کو پوری طرح ادا کرنا چاہیے۔ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا یہ حق عاید ہوتا ہے کہ ہم توحید کا اقرار کریں اور اسے وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ مانیں۔ توحید عین عدل ہے اور شرک ظلم ہے۔ اس سے بڑھ کر اور بے انصافی کیا ہو گی کہ بجائے اللہ تعالیٰ کے اس کی مخلوق کے آگے سر جھکا دیا جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ

(یقیناً شرک بڑی بے انصافی ہے)

اللہ تعالیٰ کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حق ہے۔ آپ کے حقوق کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر حضورؐ سے محبت کی جائے اور آپ کی اطاعت میں پوری کوشش صرف کی جائے۔

آپؐ کے بعد والدین اور دیگر لوگوں کے حقوق آتے ہیں ان کا ادا کرنا بھی ضروری ہے۔

ادائے حق کے سلسلہ میں قرض کے ادا کرنے اور پورا ماپ تول کرنے

کا ذکر خصوصیت سے ضروری ٹھہرتا ہے۔

حسنِ قضا: جس وقت حالات اجازت دیں قرض فوراً ادا کیا جائے۔ غنی شخص کا قرض کو ٹالے رکھنا ظلم ہے۔ قرض ادا کیا جائے تو خوشی اور فراخ دلی سے۔ طبیعت پر کوئی بوجھ نہ ہو۔ اس انداز سے ادا کیا جائے کہ قرض خواہ کو ملال نہ ہو۔ اسے حسنِ قضا کہتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک بدو سے جو غالباً غیر مسلم تھا ایک اونٹ اُدھار لیا۔ بدو اونٹ طلب کرنے آیا اور جیسا کہ قبل اسلام کے عرب قرض خواہوں کا قاعدہ تھا سخت الفاظ میں مطالبہ کیا۔ صحابۂ کرام رضی نے چاہا کہ اُسے سزا دیں لیکن حضور نے فرمایا کہ اسے کچھ نہ کہو۔ حق دار کو بولنے کا حق ہے۔ آپؐ نے صحابہ رض سے فرمایا کہ اسے اس کی اونٹ کی عمر کا ایک اونٹ دو۔ صحابہ رض نے عرض کیا کہ ہمارے پاس تو اس وقت اس سے بہتر اونٹ ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا، اسے (بہتر اونٹ) ادا کر دو۔ تم میں بہترین آدمی وہ ہے جو قرض ادا کرنے میں بہترین ہے[1]

ایک دفعہ حضورؐ نے ایک شخص سے کچھ کھجوریں قرض کے طور پر لیں۔ چند روز کے بعد وہ تقاضا کو آیا۔ آپؐ نے ایک انصاری رض کو حکم دیا کہ اس کا قرضہ ادا کریں۔ انصاری رض نے کھجوریں دیں لیکن ویسی عمدہ نہ تھیں جیسی اس نے دی تھیں، اس شخص نے لینے سے انکار کر دیا۔ انصاری رض نے کہا، کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی عطا کی ہوئی کھجوریں لینے سے انکار کرتے ہو؟ وہ بولا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم عدل نہ کریں گے تو اور کس سے توقع رکھی جائے؟ حضورؐ نے یہ جملے سُنے تو آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

---

[1] ریاض الصالحین و دلیل الفالحین۔

اور فرمایا کہ یہ بالکل سچ ہے۔ (سیرت النبی شبلی)

ماپ تول کی درستی: صحیح وزن اور عدل کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ قرآنِ حکیم میں ارشاد ہے:

حق تعالٰے نے آسمان کو بلندی پر رکھا اور میزان قائم کی تاکہ تم میزان میں بے اعتدالی نہ کرو اور انصاف کے ساتھ وزن قائم کرو اور تول میں فرق نہ کرو۔

معاش کا انحصار زیادہ تر تجارت پر ہوتا ہے۔ اگر صحیح ماپ تول اور درست حسابات نہ ہوں تو تجارت تباہ ہو جائے اور معاشی تباہی گھیر لے۔ قرآنِ حکیم میں ایک ایسی قوم کا ذکر آیا ہے جو ماپ تول میں ظلم کرنے کی وجہ سے تباہ ہو گئی۔

(۵) عدالتی انصاف:

اردو زبان میں عدل سے مراد عام طور پر عدالتی انصاف ہی ہوتا ہے۔ قرآنِ حکیم اور حدیث شریف میں بھی عدل کا لفظ ان معنی میں بار ہا آیا ہے۔ اس پر قرآنِ حکیم نے اس قدر تاکید کی ہے کہ ایک جگہ حکم دیا کہ اگر تمھیں کسی قوم سے دشمنی بھی ہو تو یہ دشمنی تمھیں بے انصافی پر نہ اکسائے۔ ہمیشہ انصاف کرو کیونکہ یہ بات) تقوٰی کے قریب ترین ہے[۱]۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی انصاف پروری کا اس قدر شہرہ تھا کہ دین کے دشمن بھی بالخصوص یہود آپ کے پاس اپنے قضیے کبھی تو محض امتحاناً اور کبھی صحیح فیصلہ کے لئے لاتے تھے۔ چونکہ بعض اوقات اُن کی غرض صرف یہ ہوتی تھی کہ آپؐ سے اپنی مرضی کے فیصلے حاصل کریں اور (نعوذ باللہ) کسی طرح آپؐ کو راہِ حق سے ڈگمگا کر آپؐ کی شہرت کو زک پہنچائیں اسی لئے

---

[۱] سورۃ المائدہ ۔ ۸

قرآن حکیم میں ارشاد ہوا کہ آپؐ کو اختیار ہے، چاہیں تو ان کے مقدمات فیصل کریں اور چاہیں تو انکار فرمادیں۔ لیکن جب فیصلہ کرنا ہی ہو تو عدل کو ملحوظ رکھیں کیونکہ اللہ تعالےٰ انصاف پسندوں سے محبت رکھتا ہے۔

عدالتی فیصلوں کے بارے میں شارع اعظم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یہ حدیث یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بعض لوگ میرے پاس آکر چرب زبانی سے اپنے کو سچا ظاہر کرکے اپنے حق میں ڈگری لے جاتے ہیں مگر انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ آگ پھانکتے ہیں۔

اسلامی عدل کی نگاہ میں رنگ و نسل، قبیلہ و خاندان، آزاد و غلام، مرد و عورت اور امیر و غریب کی کوئی تفریق نہیں۔ قوم قریش کے ایک معزز خاندان کی ایک عورت نے چوری کا ارتکاب کیا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ لوگوں نے آپؐ کے پاس آپ کے چہیتے غلام حضرت زید رضؓ کے بیٹے جناب اُسامہ رضؓ کو سفارش کے لئے بھیجا۔ آپؐ کو اسامہ رضؓ سے بہت محبت تھی مگر یہ سفارش سن کر ناراض ہوئے اور فرمایا کہ تم سے اگلی اقوام اسی لئے ملیامیٹ ہوئیں کہ بڑوں کے جرم معاف کر دیتی تھیں اور چھوٹوں کو سزا دیتی تھیں۔ خدا کی قسم اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ رضؓ بھی یہ جرم کرتی تو یہی سزا دیتا۔ چنانچہ مجرمہ کا ہاتھ قطع کر دیا گیا۔

بدر کی جنگ میں دشمن کے قیدیوں میں آنحضرتؐ کے چچا جناب عباس رضؓ بھی گرفتار ہوئے۔ مدینہ میں ان کا ننھیال تھا۔ بعض انصار رضؓ نے کہا کہ اجازت ہو تو اپنے بھانجے عباس رضؓ کا فدیہ چھوڑ دیں۔ آپؐ نے فرمایا، ایک درم بھی کم نہ ہو[1]

---

[1] صحیح بخاری۔

یہودِ خیبر مسلمانوں کے جانی دشمن تھے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بدعہدی کر کے کئی جنگیں لڑ چکے تھے۔ بالآخر ہار کر اسلامی حکومت کو تسلیم کر لیا تھا۔ ایک دفعہ ایک صحابیؓ کو انھوں نے شہید کر دیا۔ عینی گواہ میسر نہ تھے اس لئے آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلامی بیت المال سے خون بہا کی رقم ادا کر دی اور یہود کو کچھ نہ کہا۔[1]

ثمرات

۱۔ بادی سے نجات

گزشتہ صفحات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ عدل کی روح میانہ روی ہے۔ میانہ روی انسان کو مادی اور روحانی ہر دو لحاظ سے محفوظ رکھتی ہے اور گمراہی اور ہلاکت سے بچاتی ہے: آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نجات دینے والی تین چیزوں میں ایک چیز فقر و غنا ہر دو حالت کی میانہ روی بتائی ہے۔[2]

۲۔ امن و امان

اگر دنیا میں انصاف قائم رہے تو امن و امان اور اتحاد بھی قائم رہے گی۔ قوم تعمیری کاموں کی طرف متوجہ رہے گی اور کامیابی کی انتہائی رفعت تک جا پہنچے گی۔

۳۔ آخرت میں سرفرازی

انصاف کرنا بہت بڑی اخلاقی فضیلت ہے جس کا اللہ تعالے کے ہاں بے پایاں اجر ہے، جیسا کہ مندرجۂ ذیل حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے۔

(۱) وہ لوگ جو اپنے گھر والوں میں یا اُن میں جن کی حکومت انھیں سپرد کی

---

[1] صحیح بخاری مع مشکاۃ باب الغضب

گئی ہے انصاف کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے پاس نور کے میناروں پر ہوں گے۔[1]

(۲) قیامت کے دن امام عادل پر اللہ تعالیٰ کا سایہ ہو گا۔[2]

(۳) قیامت کے دن امام عادل کا درجہ سب سے بلند ہو گا۔

---

[1] ریاض الصالحین باب الوالی العادل [2] ریاض الصالحین

تدبر کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً

(۱) **منزلِ مقصود کی فکر کرنا**: اس کے لئے ساز و سامان کی پوری تیاری کرنا اور راہ کے بارے میں معلومات حاصل کر کے ان کے مطابق اپنا منصوبہ بنانا۔

(۲) **عمارت کا نقشہ**: اگر کوئی عمارت بنانی ہو تو اس کا نقشہ یا نمونہ تیار کر کے اس کے مطابق اس کی تعمیر شروع کرنا۔

(۳) **بجٹ**: حکومت اپنے انتظامی اور تعمیری پروگراموں کا ایک خاکہ تیار کر کے اس کے مناسب رقوم مہیا کرتی ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ رقم گھٹ جائے یا کوئی منصوبہ اپنی استطاعت سے بڑھ کر ثابت ہو۔ یہ تدبر ہے۔

(۴) **باطن تک پہنچنا**: عقل کا تقاضا ہے کہ ہم کسی چیز یا عبارت کے ظاہر تک ہی محدود نہ رہ جائیں بلکہ اس کے باطن پر بھی غور کریں اور حالات و واقعات کی تہ تک پہنچیں۔ چنانچہ تدبر فی القرآن سے مراد ہے اپنے علم و استطاعت کے بموجب قرآن کی معنویت تک پہنچنے کی کوشش کرنا۔

(۵) **مستقبل کی فکر**: یعنی حال ہی میں سمٹ کر نہ رہ جانا بلکہ اس کے حصار سے باہر نکل کر مستقبل کو بھی دیکھنا اور اس کی تیاری کرنا۔

(۶) **آخرت کی فکر**: دنیا کی رنگینیوں میں جذب ہو کر نہ رہ جانا بلکہ آخرت کی بھی فکر کرنا۔ فکر و نظر کی جولان گاہ اس دنیا کی سطح تک ہی محدود نہ رکھنا بلکہ بقولِ شبیر احمد عثمانیؒ یہ دیکھنا کہ اس زندگی کی تہ میں ایک اور زندگی کا راز بھی پوشیدہ ہے۔

تدبر کے مراتب

حضرت شاہ ولی اللہ کی تالیف حجۃ اللہ البالغہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تدبر کے دو درجے

ہیں : ادنےٰ اور اعلےٰ۔

ادنےٰ تدبر :

ادنےٰ تدبر عوام کا تدبر ہے۔ ان کے پاس جو کچھ سرسری علم ہوتا ہے وہ اس کے موافق اپنے محدود طریقہ سے سوچ لیتے ہیں۔ انھیں حقائقِ موجودات کی گہرائیوں میں جانے کی حاجت نہیں ہوتی۔ وہ ارض و سماوات پر ایک سرسری نظر ہی ڈال کر اللہ تعالےٰ کے جلال کے معترف ہو جاتے ہیں۔ انبیاء کرام کے [illegible] ات زیادہ تر اسی طبقہ کے لئے ہوتے ہیں۔

عرب کے ایک اَن پڑھ بدو کو علم و حکمت کے اسرار کی طرف متوجہ کرنا یا اس سے سائنسی اور تحقیقی رمزیں بیان کرنا بے کار ہوگا۔ اس کی زندگی بڑی سادہ ہوتی ہے وہ وادیوں اور کوہساروں کے دامن کا پروردہ ہوتا ہے۔ اُونٹ اس کی زندگی کی بیش قدر متاع ہے، جس پر سوار ہو کر وہ خانہ بدوش زندگی کے فاصلے طے کرتا ہے سفر میں آنکھوں کے سامنے کبھی پہاڑوں کا نظارہ آتا ہے اور کبھی میدانوں کا۔ اس کا سفر چونکہ اکثر رات کو ہوتا ہے اس لئے اس کی نگاہ رہ رہ کر آسمان کے دل فریب منظر کی طرف بھی اُٹھتی ہے جس کے چاند تاروں کی روشنی میں وہ نشیب و فراز میں ہموار اور لگاتار چلا جاتا ہے۔ یہی اس کا سارا ماحول ہے جس پر وہ سرسری نظر ڈال کر اللہ کی قدرت کا مطالعہ کر سکتا ہے۔ لہٰذا قرآنِ حکیم اسے اسی تدبر کی دعوت دینے پر اکتفا کرتا ہے اور کہتا ہے:

اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ ٥
وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ ٥ وَاِلَی الْجِبَالِ

کَیْفَ نُصِبَتْ ۝ وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ۝

(سورۃ الغاشیہ پارہ - ۳۰)

(بھلا کیا وہ نظر نہیں کرتے اونٹوں پر کہ کیسے بنائے گئے ہیں اور آسمان پر کہ کیسے بلند کیا گیا ہے اور پہاڑوں پر کہ کیسے کھڑے کیے گئے ہیں اور زمین پر کہ کیسے بچھائی گئی ہے)

ہر ایک شخص سے اس کی علمی سطح کے موافق ہی سمجھ اور فہم کی توقع ہو سکتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ ایسے آدمی سے علمی بات کہنا جو اس کے اہل نہ ہو علم کو ضائع کرنا ہے[1] علم تدبر کی بنیاد ہے۔ ہر شخص کا علم ایک سا نہیں ہوتا اس لئے ہر عامی سے یہ توقع رکھنا کہ وہ خود قرآن کی تفسیر کر سکے جہالت ہے۔

اعلیٰ تدبر:

اعلیٰ تدبر علماء کا حصہ ہے۔ اس تدبر کے لئے ضروری ہے کہ ذہن میں علم کا خزانہ ہو۔ یہ تدبر ذہنی خلاء میں نہیں کیا جا سکتا۔ گذشتہ علماء کے خیالات سے واقف ہونا ضروری ہے۔ جب تک روایتی علم میں کمال پیدا نہ کر لیا جائے تدبر حاصل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ہر آدمی کے لئے ناممکن ہے کہ وہ قرآن میں اعلیٰ تدبر پیدا کر سکے۔ ایک عامی اس کے اسلوب اور تاثیر کی معجزیت کو پالے تو اس کے لئے یہی تدبر کافی ہے۔ ہر چھوٹے بڑے آدمی کے لئے قرآن حکیم کا مفسر بننا ناممکن ہے۔ قرآن حکیم میں اعلیٰ تدبر کا مقام

---

[1] مشکاۃ کتاب العلم

حاصل کرنا ہو تو عربی زبان اور قواعد میں مہارت پیدا کرے۔

اعلیٰ تدبّر کی شروط:

(۱) اللہ تعالےٰ کا خوف:

صحیح معنی میں تدبّر وہی کر سکتا ہے جس کے دل میں اللہ تعالےٰ کا خوف ہو ورنہ وہ فکر کی غلط راہوں پر چل دے گا۔ خود بھی گمراہ ہوگا اور دوسروں کو بھی گمراہ کرے گا۔ ایسی حرکت کرنا منافقوں کا کام ہے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جن تین چیزوں سے اسلام کو صدمہ پہنچے گا ان میں سے ایک وہ منافق ہوگا جو قرآن کی آیات پڑھ پڑھ کر اپنے (غلط) نظریات پیش کرے گا۔[۲]

(۲) فنی مہارت:

کوئی بھی فن ہو اس میں اعلےٰ تدبّر کا مقام پیدا کرنے کے لئے برسوں کی ریاضت ضروری ہے۔ اس کی بنیاد علم پر ہونی چاہیے ورنہ یوں تو میاں بدھو بھی بڑے مدبّر تھے اور شیخ چلّی کا تدبّر بھی کسی سے کم نہ تھا۔

علم کا تقاضا ہے کہ سابقہ علماء کی تحقیقات سے پوری واقفیت بہم پہنچائی جائے۔ ان کی تحریرات اور خیالات کا گہری توجہ سے مطالعہ کیا جائے۔ ضرور نہیں کہ ان کی ہر بات سے اتفاق کیا جائے۔ ان سے اختلاف بھی ہو سکتا ہے، لیکن اس اختلاف کا حق صرف اسی شخص کو حاصل ہوتا ہے جس نے اس فن میں کمال پیدا کیا ہو۔

مثال کے طور سے تدبّر فی القرآن کو لیجیے۔ تفسیر میں مستند اور اعلےٰ مقام پیدا کرنا ہو تو عربی زبان اور قواعد میں ماہر ہونا چاہیے۔ قرآن حکیم کے مفسّر اوّل

---

۲ مشکاۃ کتاب العلم۔

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث کا نظرِ غائر سے مطالعہ کرنا چاہیے نیز ماضی و حال کے مفسرین کے خیالات سے آگاہی پیدا کی جائے تو جب کہیں آدمی مستند مقام حاصل کرنے کا حق دار ہوتا ہے۔ بشرطیکہ اللہ کا خوف دل میں مکین ہو اور اللہ نے صاف ذہن اور بصیرت بھی عطا کی ہو۔

(۳) تحمل:

تدبر کے لئے بہت صبر و تحمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر معاملہ میں ٹھنڈے دل سے غور سے کیا جائے۔ نتیجہ تک پہنچنے میں جلدی نہ کی جائے، ورنہ تدبر غلط راستے پر ڈال دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی فقہ کی رو سے قاضی کو غصہ کی حالت میں فیصلہ کرنے کی اجازت نہیں۔

سائنسی تحقیقات میں بعض دفعہ برسوں گزر جاتے ہیں جب تک طبیعت میں تحمل نہ ہو انسان تحقیقات کے دوران دل برداشتہ ہو جاتا ہے۔

(۴) تجربہ:

تدبر کو عملی دنیا سے جدا نہیں رکھنا چاہیے۔ محض فکری شعبدہ بازیوں کو ہم حکمت کا کمال نہیں کہہ سکتے۔ بہت لوگ نہایت خوشنما باتیں کہتے ہیں، لیکن عمل کی دنیا میں یہ باتیں تباہ کرتی ہیں مثلاً بعض لوگ کہتے ہیں کہ پردہ ترقی کی راہ میں حائل ہے، اگر عورتیں پردہ چھوڑ دیں تو آزادی سے بیرونی دنیا میں بھی وہ اپنا کردار ادا کر کے قوم کو کامیابی سے ہم کنار کر دیں گی لیکن یورپ کی تاریخ کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ بے پردگی نے وہاں کی اخلاقی حالت کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔

ہمیشہ اسی مدبر کی بات کا اعتبار کرنا چاہیے جو عملی دنیا میں بھی کچھ کر کے دکھاتا ہے۔ صرف خوش کلامی کے دھوکے میں نہیں آنا چاہیے۔ جناب

رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد ہے:

لَا حَکِیْمَ اِلَّا ذُوْ تَجْرِبَۃٍ [۱]

(تجربہ کے بغیر کوئی شخص صاحبِ حکمت نہیں ہوتا)

تدبّر کی حدود | ۱- عقلیت پرستی سے گریز

عقل بے شک بہت کارآمد شے ہے لیکن اسے بے لگام چھوڑ دیا جائے تو فساد پیدا کرتی ہے۔ عقل کو قرآن و سنت کے تابع رکھنا چاہیے۔ جو تدبر قرآن و سنت سے آزاد ہو جائے وہ گمراہی کے رستے پر چل دیتا ہے۔ عقل کو چراغ کے طور پر استعمال کیا جائے۔ اسے نصب العین نہیں بنانا چاہیے ؎

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے (اقبال)

۲- اسلام نے جن چیزوں میں غور کرنے سے منع کیا ہے ان میں کرید نہ کی جائے۔ ان چیزوں کا زیادہ تعلق عالمِ غیب سے ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی گتھیاں سلجھانا انسانی ذہن کے بس کی بات نہیں جو شخص اس بحث میں پڑے گا وہ اپنی حدود سے تجاوز کرے گا۔ جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مخلوق میں غور و فکر کرنے کی اجازت دی ہے لیکن خالق کی ذات میں تفکر کرنے سے منع فرمایا ہے۔

اسی ضمن میں تقدیر کا مسئلہ بھی آتا ہے جس میں بعض لوگ بہت عقل

---

[۱] مشکاۃ باب الحذر

دوڑاتے ہیں۔ تقدیر میں فقط اسی حد تک غور کرنا چاہیے جس حد تک اسلام اجازت دیتا ہے - یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ تقدیر کی گتھیاں کبھی نہیں سلجھائی جا سکتیں۔ امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے کہ تقدیر میں غور کرنے والے کی مثال سورج کی شعاعوں سے نظر ملانے والے کی ہے وہ جس قدر دیکھے گا اس کی سرگشتگی اور حیرانی بڑھے گی۔

اہمیت

ا۔ تدبر انسان کی امتیازی صفت ہے:

انسان کو جو چیز بنیادی طور سے حیوانات سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کی دُور اندیش اور منصوبہ خیز عقل ہے۔ حیوانات پر ان کے جذبات حکمران رہتے ہیں۔ لیکن انسان اپنے جذبات کو عقل کے تابع رکھتا ہے۔ حیوانات کی عقل محدود ہوتی ہے۔ وہ دُور بین اور دُور اندیش نہیں ہوتے۔ انسان سالوں بلکہ صدیوں تک فکر کرتا ہے وہ حال سے زیادہ مستقبل میں کھویا رہتا ہے۔ اس حقیقت کا اظہار علامہ اقبال نے ان الفاظ میں کیا ہے ؎

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے

انسان صرف اپنے بارے ہی میں نہیں سوچتا بلکہ کل انسانیت کے مستقبل کی فکر بھی کرتا ہے اس مقصد کے لئے وہ انفرادی اصول ہی نہیں بلکہ کلیات بھی وضع کرتا ہے اور فکر و تدبر کا ایک عالمگیر نظام قائم کرتا ہے۔

تدبر انسان کی فطری استعداد اور امتیازی صفت ہے اسے معطل کر دینا حیوانیت کی طرف پلٹنے کے مترادف ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو

جو لوگ تدبر سے کام نہیں لیتے وہ چوپایوں سے بھی بدتر ہیں، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت کو ٹھکرا کر ناشکری کا ثبوت دیتے ہیں۔ سورۂ الاعراف کے دسویں رکوع میں اس بارے میں ایک اثر انگیز آیت آئی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے

"اور ہم نے جن و انس میں بہتیرے ایسے افراد پیدا کیے جن کی عاقبت جہنم ہے۔ وہ دل رکھتے ہیں لیکن ان سے سمجھ کا کام نہیں لیتے، وہ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ ان کے کان ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ وہ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی بڑھ کر بے راہ۔ وہی لوگ (حقیقتاً) غافل ہیں"

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ تدبر انسانوں کا شیوہ ہے اور غفلت چوپایوں کی خصلت۔

انسان کا فرض ہے کہ تدبر کے جوہر چمکانے کی کوشش کرے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

"دل کو مراقبہ کی عادت ڈلواؤ اور عبرت پذیری پڑھاؤ"[1]

ایک صحابیؓ نے بارگاہ نبوی میں حاضر ہو کر عرض کی کہ مجھے کوئی نصیحت فرمایئے۔ آپؐ نے فرمایا، ہر کام کو تدبیر کے تحت رکھ۔ اگر تو سمجھے کہ اس کام کے انجام میں بھلائی ہو گی تو اسے انجام دے اور اگر تجھے اس کے ہاتھوں بھٹک جانے کا ڈر ہو تو باز آجا[2]

---

[1] کنزالاعمال جلد [2] مشکاۃ باب الحذر والتانی۔

۲۔ تدبر ایمان کی راہ پر چلاتا ہے۔

تدبر چونکہ باطل سے پھیر کر حق کی طرف لاتا ہے اس لئے بارہا اس کے بدولت کفار ایمان لے آتے ہیں اور مومنوں کا ایمان مزید پختہ ہوتا ہے۔

۳۔ تدبر حقائق کی تہ تک پہنچاتا ہے۔

انسان کے ذہن میں تدبر اور تفکر کی استعداد کا بے کنار خزانہ ودیعت ہے وہ اس سے کام لے کر حقائق کی تہ تک پہنچ سکتا ہے اور محض ظاہریت کے فریب میں نہیں رہتا۔ کائنات کے سینہ میں بے شمار اسرار پوشیدہ ہیں جو انسان کی نگاہِ خار اشگاف کے انتظار میں ہیں۔ انسان جس قدر تحقیق اور تفکر کرے گا وہ کائنات کے اسرار کی معرفت حاصل کرتا جائے گا۔ اس معرفت کے ذریعے اس کا توحید پر ایمان پختہ سے پختہ تر ہوتا جائے گا۔ اس حقیقت کے پیش نظر علامہ اقبالؒ نے کہا ہے ؎

اے اہل نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا

کفارِ مکہ، جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکمت اور ذہنی رفعت پر اُلٹے سیدھے اعتراض جڑ دیتے تھے۔ اس پر قرآنِ حکیم نے حضورؐ کو یوں خطاب کیا:

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا قف (سبا۔ ۴۶)

(کہہ دیجئے کہ میں تمھیں ایک ہی بات کی دعوت دیتا ہوں کہ اللہ کے واسطے ایک ایک دو دو آدمی ہو کر ہمت کرو اور

غور و فکر کرو)

اس دعوت میں کفار کو چیلنج ہے کہ تم اندھادھند اعتراض کیے جاتے ہو اور سوچتے سمجھتے کچھ نہیں ہیں۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذہنی صلاحیتوں کا اندازہ کرنا ہے تو دماغ سے کام لیکر دیکھو۔ دل میں اللہ کا خوف رکھو اور چاہے اکیلے اور چاہے مل کر خوب غور و فکر کرو تم یقیناً صحیح نتیجہ پر پہنچو گے۔

۴۔ تدبر عبادت ہے

تدبر ذکر کی ایک نہایت ارفع صورت ہے اس لئے علماء نے ذکر کی طرح تدبر کو بھی افضل عبادت شمار کیا ہے۔ اس بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعض نہایت بصیرت افروز احادیث ہیں مثلاً:

(۱) لَا عِبَادَةَ كَالتَّفَكُّرِ [۱] (تفکر کی طرح کوئی عبادت نہیں)

(۲) فِكْرُ سَاعَةٍ خَيْرٌ مِّنْ قِيَامِ لَيْلَةٍ [۲]

(ایک گھڑی کا تفکر رات بھر کی نماز گزاری سے بہتر ہے)

(۳) ایک گھڑی کا تفکر ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے [۳]

ان دو حدیثوں میں سے ایک میں تفکر کی ایک گھڑی کو ایک رات کے قیام سے اور دوسری میں ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔ یہ فرق تفکر کی نیت اور نوعیت کا فرق ہے۔

علم دین کے شعبوں میں ان شعبوں کو افضلیت حاصل ہے جن کا تعلق فکر و تدبر سے ہے۔ ارشاد نبوی ہے کہ ایک فقیہہ ہزار عابدوں سے

---

[۱] دلیل الفالحین [۲] اکمال کنز العمال جلد ۲ [۳] کنز العمال جلد ۲ [۴] ترمذی ابواب العلم

بڑھ کر شیطان پر بھاری ہوتا ہے۔[1]

تدبر کے تقاضے

(۱) قرآن میں تدبر:
قرآن حکیم حق کا صحیفہ ہے۔ یہ حکمت اور بصیرت کا سرچشمہ اور علم دین بلکہ سب علوم کا مخزن ہے۔ اس لئے اس میں غور و فکر کرنا فرض ہے۔ سورۂ ص میں ارشاد ہے:

كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُوا الْأَلْبَابِ.

(ایک کتاب ہے جو ہم نے تیری طرف اتاری، برکت والی تاکہ عقل والے لوگ اس میں تدبر کریں اور اسے سمجھیں)

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ نزول قرآن کا مقصد ہی یہ تھا کہ لوگ اس میں حسب عقل غور و فکر کریں۔ اس کی تائید سورۂ نحل کی ایک آیت سے بھی ہوتی ہے جس کا ترجمہ ہے:

(ہم نے تیری طرف قرآن نازل کیا تاکہ تو اسے لوگوں کے آگے بیان کرے اور تاکہ وہ تفکر کریں)

سورۂ لقمان میں اللہ کے بندوں کی ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے:

وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا

ترجمہ: اور جب ان کو اپنے رب کی آیات سمجھائی جائیں تو وہ ان پر بہرے اندھے ہو کر نہیں گرتے۔

یعنی آنکھیں کھول کر اور دھیان کے ساتھ قرآن حکیم کی آیات سنتے

---

[1] ترمذی ابواب العلم۔

ہیں۔

قرآنِ حکیم کی تلاوت میں بہت ثواب ہے لیکن جس آدمی کو قرآنِ حکیم کے معنی سمجھ میں آسکتے ہوں اسے لازم ہے کہ ہر آیت کی سوچ سمجھ اور تدبر سے تلاوت کرے۔ قرآنِ حکیم میں ترتیل یعنی ٹھہر ٹھہر کر تلاوت کرنے کا حکم ہے۔ ترتیل کا مقصود یہ ہے کہ فہم و تدبر حاصل ہو۔ جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک دفعہ ساری رات ایک ہی آیت بار بار پڑھتے رہے۔ ایسی ہی مثالیں بعض صحابہ رضؓ کی زندگی میں بھی ملتی ہیں۔

قرآنِ حکیم سے آنکھیں بند کرنا کُفّار اور مُنافقین کا کام ہے۔ سورۂ محمدؐ میں منافقین کے بارے میں ارشاد ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالےٰ نے لعنت کی ہے۔ پس ان کو بہرہ کیا اور ان کی آنکھوں کو اندھا کیا وہ قرآن میں تدبّر نہیں کرتے۔ کیا اُن کے دِلوں پر قفل ہیں؟ اس ارشاد سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو لوگ قرآنِ حکیم میں تدبر نہیں کرتے وہ بصیرت سے محروم ہیں۔ مراد یہ ہے کہ دل کا نور قرآنِ حکیم میں تدبّر کرنے ہی سے حاصل ہوتا ہے۔

۲۔ کائنات میں تدبّر:

قرآنِ حکیم ہی میں نہیں بلکہ کائنات میں بھی غور و فکر کرنے کی ہدایت ہے۔ سورۂ آلِ عمران کے گیارھویں رکوع میں بتایا گیا ہے کہ:

عقل والے لوگ آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں غور کرتے ہیں

سورۂ رعد کے ساتویں رکوع میں ارشاد ہے:

"اور (اللہ تعالےٰ) وہی ہے جس نے زمین پھیلائی اور اس میں پہاڑ اور ندیاں رکھ دیں اور ہر پھل میں جوڑے بنائے۔ دن پر رات کو ڈھانپتا ہے۔ اس میں یقیناً اُن لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو تفکر کرتے ہیں"۔

سورۃ الملک میں اللہ تعالےٰ کا انسان سے یوں خطاب ہے:

"اللہ تعالےٰ کی کائنات میں کوئی تفاوت نہیں۔ تو دوبارہ نظر ڈال اور دیکھ کہ کیا اس میں کوئی رخنہ ہے"؟

مراد یہ ہے کہ ساری کائنات ایک ہموار، متوازی اور مضبوط نظام میں جکڑی ہوئی ہے۔ اس میں کوئی ناہمواری یا بے ربطی نہیں۔ کائنات پر جتنا غور کیا جائے یہ حقیقت روشن سے روشن تر ہوتی چلی جاتی ہے۔

قرآنِ حکیم میں ارشاد ہے:

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ
اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۝

(یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور شب و روز کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں)

جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس نے اس آیت کو پڑھا اور اس میں غور نہ کیا وہ خراب حال ہے[1]

---

[1] دلیل الفالحین۔

اللہ تعالےٰ نے قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر اپنی قدرت کی نشانیوں کی طرف اشارہ کر کے انسان کو یہ دعوت دی ہے کہ ان میں غور و فکر کرے۔ انہی آیات کا فیض تھا کہ مسلمانوں نے زمین و آسمان کے مطالعہ کی تحقیقی تجرباتی طرح ڈالی اور اہلِ عالم کو سائنسی علوم کی راہ پر چلایا۔

واقعات و حقائق کو ذہن میں محفوظ رکھنا بے شک علم کا ایک لابدی شعبہ ہے لیکن اصل فضیلت اس بات میں ہے کہ انھیں تدبر کی بنیاد بنایا جائے۔

(۳) اپنی ذات میں تدبّر:

انسان سب سے زیادہ اپنی ذات کے بارے میں فریب کھاتا ہے۔ وہ بارہا اپنی طاقت اور استعداد کے بارے میں اتنا مغرور ہوجاتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کو بھول جاتا ہے۔ وہ ذاتی منفعت میں اس قدر کھو جاتا ہے کہ اسے آخرت کی فکر نہیں رہتی۔ اگر وہ اپنی اصلیت اور انجام پہ غور کرے تو اس کے سامنے یہ بات خوب روشن ہو جائے کہ میں خاک سے اُٹھا اور خاک میں مل جاؤں گا۔ میری زندگی فانی ہے۔

جو لوگ اپنی جان کے متوالے ہوتے ہیں اور اللہ تعالےٰ کی طرف سے بے فکر رہتے ہیں ان کے بارے میں سورۂ روم میں آیا ہے:

اَوَ لَمْ يَتَفَكَّرُوا فِي أَنْفُسِهِمْ (آیت۔)

(کیا انھوں نے اپنی جانوں میں غور نہیں کیا)

آدمی اگر اپنی ہستی پر غور کرے تو اپنی بے بضاعتی اور عاجزی کا احساس دل میں خوب جم جاتا ہے اور اللہ کی عظمت اور ربوبیت کا دل سے اعتراف ہو جاتا ہے:

مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ

(جس نے خود کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا)

حضرت حسن بن ابو الحسن فرماتے ہیں:

فکر مومن کا آئینہ ہے جس میں وہ اپنی خوبیاں اور خرابیاں دیکھتا ہے[۱]

(۴) تاریخ میں تدبر

سورۃ الروم میں ارشاد ہے:

اَوَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ ط

(کیا انھوں نے زمین کی سیر نہیں کی کہ دیکھیں ان لوگوں کا جو اُن سے پہلے تھے کیا انجام ہوا)

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ اقوام کے عروج و زوال کے اسباب کھُل کر سامنے آجائیں۔ بڑی بڑی صاحب حشمت اقوام اس دنیا میں آئیں۔ ان کی صنعت و حرفت اور تہذیب نے انتہا کی ترقی کی لیکن جب انھوں نے اللہ تعالیٰ سے بغاوت کی تو اللہ تعالیٰ نے انھیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔ اُن کی آبادیوں کے کھنڈر آج بھی جابجا بکھرے پڑے ہیں۔ ان پر نظر ڈالو تو عبرت حاصل ہوگی۔

قرآن حکیم میں تاریخ کی بعض کڑیاں اس لیے مذکور ہیں کہ لوگ ان سے

---

[۱] ذیلی الفالحین۔

درس حاصل کریں۔

۵۔ آخرت میں تدبر

انسان کو چاہیے کہ موت سے غافل نہ رہے اور آخرت کی فکر کرتا رہے۔ انسان کی آخری اور دائم منزل آخرت ہے۔ دنیا کی رنگینیوں میں کھو کر آخرت سے غفلت کرنے والے لوگ بہت خسارے میں رہتے ہیں۔ ارشاد نبوی ہے کہ آخرت کے فرزند ہو کر رہو۔ دنیا کے فرزند نہ بنو۔[۱]

آخرت کا تدبر ہی انسان کو مادی دنیا کے پھندے سے نکال کر نیکی کی جنت میں لے جاتا ہے۔ یہ تصور نہ ہو تو آدمی مادہ پرست، کمیونسٹ اور خود غرض ہو جائے۔

ثمرات

تدبر کے فیوض و برکات کا اندازہ مشکل ہے۔ تدبر بھلائی کا سرچشمہ ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

جسے حکمت دی گئی (سمجھ کر) اُسے خیر کثیر دی گئی۔ گذشتہ صفحات میں تدبر کے ثمرات کا بھی ذیلی طور پر ذکر گزر چکا ہے۔ ذیل میں انھیں مختصراً پھر بیان کیا جاتا ہے:

(۱) تدبر ایمان کی راہ پر چلاتا ہے۔

(۲) تدبر عبادت کا قائم مقام ہے۔

(۳) تدبر سے عرفان و بصیرت کی دولت ملتی ہے اور حق روشن ہوتا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے کہ ہم اسی طرح تفکر کرنے والوں کے لئے آیات کو کھول کھول کر بیان کرتے ہیں (یونس)

تدبر کرنے والے لوگ اکثر صحیح فیصلہ تک پہنچتے ہیں۔

(۴) تدبر انسان کو زندگی کے بارے میں سنجیدہ بناتا ہے اور لہو و لعب

میں مبتلا ہونے سے بچاتا ہے۔

(۵) تدبر فوری نفع کے بجائے آخری فلاح کی راہ دکھاتا ہے اور یہ حقیقت روشن کرتا ہے کہ حقیقی فلاح وہی ہے جو ساری قوم کی ہے۔ انسان کو ملّت کی خاطر اپنا ذاتی نفع قربان کر دینا چاہیے۔ تدبر نہ ہو تو انسان میں قربانی کا مادہ مشکل سے پیدا ہو سکے۔

(۶) تدبر سے علم و حکمت کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ علم کے سب شعبوں میں تحقیقی بصیرت پیدا ہوتی ہے۔

علم

مفہوم علم کے لغوی معنی ہیں جاننا۔
سُن کر یا مطالعہ کر کے صحیح معلومات کو ذہن میں محفوظ رکھنے کا نام علم ہے۔

جنابِ ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے کہ وہ شخص کامران ہوا جس نے اپنے دل کو ایمان کے لئے صاف کیا، اس کا دل سلیم، زبان سچی، روح مطمئن، اور فطرت مستقیم بنائی گئی اور اس کا کان سننے والا اور آنکھ دیکھنے والی بنائی گئی۔ اس کا کان گویا کیف ہے اور اس کی آنکھ دل کی یادداشت کی تائید کرتی ہے اور جس کا دل یاد رکھنے والا بنایا گیا وہ کامران ہوا۔[1]

اس حدیث میں علم کی جامع و مانع تعریف دی گئی ہے اس سے بہتر تعریف کسی انسان کے تصور میں بھی نہیں آسکتی۔ اس میں علم کو مندرجۂ ذیل چیزوں پر مشتمل بتایا گیا ہے:

(۱) قلب سلیم ہو یعنی غلط بات کو پسند نہ کرے۔

(۲) حافظہ اچھا ہو۔

---

[1] الترغیب والترہیب باب الاخلاص۔ مشکوٰۃ کتاب الرقاق۔

(۳) کان سُنیں تو کیف کی طرح چھانٹ کر بات کو دل میں اُترنے دیں۔
(۴) آنکھ کوئی ایسی بات قبول نہ کرے جو علم کے منافی ہو۔
اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ علم اچھی چیز کے یاد رکھنے کا نام ہی نہیں بلکہ بُری معلومات سے دُور رہنا بھی اس کا بڑی عنصر ہے۔ ورنہ یہ علم ملاوٹی دودھ کی طرح ذہن کی خراب پرورش کرے گا۔ امام مالکؒ جہلاء کے ساتھ میل جول بھی روا نہیں رکھتے تھے۔ امام زہری کو جب اندیشہ ہوتا کہ کان میں کوئی غلط بات پڑے گی تو کان میں انگلی ڈال لیتے تھے۔
طالب علم کو صرف اچھی کتابیں پڑھنی چاہییں۔ اگر وہ فحش اور لغو کتابیں پڑھے گا تو اس کا علم خالص نہیں رہے گا اور جب اس میں ملاوٹ بڑھتے بڑھتے غالب آجائے گی تو بجائے علم کے اس کو جہالت کا نام دینا موزوں ہوگا۔

علم کی وسعت

اگرچہ افضل ترین علم کتاب و سنت کا علم ہے کیونکہ یہی علم ورثۂ انبیاء ہے لیکن علم کی دنیا بہت وسیع ہے۔ اس کا کوئی کنارہ نہیں۔ جو علم بھی اللہ تعالیٰ کی رضا اور خدمت دین کی خاطر حاصل کیا جائے قربِ الٰہی کا ذریعہ ہوتا ہے۔ قرآن حکیم نے مطالعۂ کائنات کی طرف بہت توجہ دلائی ہے۔ مثلاً ارشاد ہے کہ

زمینوں اور آسمان کی تخلیق اور رات دن کے پس و پیش آنے جانے میں نشانیاں ہیں عقل والوں کے لئے جو اللہ تعالیٰ کو بیٹھے اُٹھتے اور کروٹ کے بل پڑے یاد کرتے ہیں۔ زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں تفکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے رب! تو نے یہ عبث نہیں بنایا۔ تو سب عیبوں سے پاک ہے۔ سو ہمیں عذاب سے بچا۔[1]

---

[1] پارہ ۴۔ رکوع ۱۱۔

یہاں اللہ تعالیٰ کی کائنات کی تحقیق کو بہت قابلِ ستائش بتایا ہے بشرطیکہ اللہ تعالیٰ کی یاد بھی دل میں موجزن رہے۔ ستاروں کی گزرگاہوں کو ڈھونڈنے والا استدلال ہی میں اُلجھ کر اُن کے صانع کی معرفت سے نہ رہ جائے۔
علم کے بے شمار شعبے ہیں۔ اسلام نے سب مفید شعبوں کے حاصل کرنے کی تلقین کی ہے۔ چنانچہ اہلِ اسلام نے نو بہ نو علوم ایجاد کر کے دنیا کے سامنے پیش کیے۔

علم کے مراتب

علم کے دو اہم مرتبے ہیں۔ ایک وہ علم جو فرضِ عین ہے اور دوسرے وہ جو فرضِ کفایہ ہے۔

فرضِ عین: علم کی ابتداء یہ ہے کہ آدمی توحید سے واقف ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کی ذات پہ ایمان لے آئے۔ اس کے ساتھ دیگر اجزائے ایمان سے آگاہی بھی لازم ہے۔ اجزائے ایمان کے بعد اسلام کے ارکان اور دیگر بنیادی احکام سے واقف ہونا ضروری ہے۔ اگر ان سے ناواقفی کی وجہ سے کوئی جرم سرزد ہو جائے تو مجرم محض اس لئے چھٹکارا نہیں پا سکتا کہ اس بارے میں احکام کا علم نہ تھا۔ یہ وہ بنیادی علم ہے جس کا حاصل کرنا ہر مسلمان پہ فرضِ عین ہے۔ اس سے کوتاہی کرنے والا گنہگار ٹھہرتا ہے۔ البتہ اس میں عمر کا اعتبار ضرور ہے۔ جتنا علم ایک بالغ مسلمان کے لئے فرض ہے ضروری نہیں کہ نابالغ کے لئے بھی اسی قدر علم فرض ہو۔

فرضِ کفایہ: عقائد و فقہ کی باریکیاں، قرآن و حدیث میں کمال علم حاصل کرنا، لغت، گرامر، ریاضیات، جغرافیہ، سائنس اور صنعت و حرفت وغیرہ میں درجۂ فضیلت حاصل کرنا ہر شخص کے بس کا کام نہیں۔ ان میں صرف خواص ہی صاحبِ کمال ہو سکتے ہیں۔ البتہ جب کسی ایک شعبۂ علم میں فضلا کی ضروری تعداد نہ ہو تو ساری کی ساری قوم اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں مجرم ٹھہرتی ہے کہ اس نے اس

شعبۂ علم کے قیام کے لئے ضروری اہتمام کیوں نہیں کیا۔

فرض کفایہ صرف دینی علم ہی میں نہیں بلکہ ہر اس سائنسی علم میں بھی ہے جو قوم کی بقا و فلاح کیلئے ضروری ہے۔ مثلاً اگر سائنس کے شعبہ میں غفلت ہو رہی ہو تو سب قوم کل اللہ تعالیٰ کے آگے جواب دہ ہوگی۔

اہمیت علم ایک ایسی لازوال دولت ہے جو قوت، امن اور سربلندی عطا کرتی ہے۔ حضرت علیؓ کا اس بارے میں نہایت بصیرت افروز قول ہے کہ:

علم دولت سے بہتر ہے۔ علم پاسبانی کرتا ہے اور دولت کی پاسبانی تمھیں کرنی پڑتی ہے۔ علم حکمران ہوتا ہے اور دولت پر حکمرانی کی جاتی ہے۔ دولت خرچ کرنے سے کم ہوتی ہے اور علم بڑھتا ہے

علم کی اہمیت بے شمار پہلو رکھتی ہے جن کا احاطہ مشکل ہے۔ مختصراً اس پر مندرجۂ ذیل عنوانوں کے تحت گفتگو ہو سکتی ہے:

(۱) علم شرطِ انسانیت ہے۔

(۲) علم شرطِ نبوت ہے۔

(۳) علم شرطِ حکومت ہے۔

ذیل میں ہم ان پر الگ الگ تبصرہ کریں گے:

(۱) علم شرطِ انسانیت ہے:

انسانیت کا شرف علم سے وابستہ ہے۔ علم نہ ہو تو آدمی جانوروں سے بھی بدتر ہوتا ہے۔ وہ کسی عزت کے قابل نہیں ہوتا۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا قول ہے کہ مجھے اس شخص پر تعجب آتا ہے جو علم حاصل نہیں کرتا اور اس کے باوجود اپنے کو عزت کئے جانے کا مستحق سمجھتا ہے[۱]

---

[۱] اسلامی نظامِ تعلیم از ریاست علی ندوی۔

قرآنِ حکیم میں ارشاد ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے زمین پر اپنا خلیفہ بنانا چاہا تو فرشتوں کے آگے اپنے ارادہ کا اظہار کیا اور فرمایا کہ میں انسان کو خلافت کا منصب دینا چاہتا ہوں۔ فرشتے بولے، کیا تو اسے اپنا نائب کیا چاہتا ہے جو وہاں بگاڑ پیدا کریگا اور خون بہائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے اس اعتراض کا منہ یوں بند کیا کہ انسان کو کچھ اشیاء کے نام بتا دئیے۔ پھر فرشتوں سے ان اسماء کے بارے میں پوچھا تو وہ کچھ نہ بتا سکے اب اللہ تعالیٰ نے انسان کو حکم دیا تو اس نے نام سُنا دئیے۔ فرشتے دم بخود رہ گئے۔ انھوں نے عجز کا اقرار کیا اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے انسان کو ہدیہ تعظیم پیش کیا۔

اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ جس چیز نے انسان کو فرشتوں سے بھی اشرف ثابت کیا وہ علم ہے۔

اللہ تعالیٰ کے انسان پر بے حد و کنار احسانات ہیں۔ ان میں بنیادی احسان علم ہے۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جو پہلی وحی نازل ہوئی ان میں اس حقیقت کو واشگاف طور پر بیان کیا گیا ہے۔ وحی کے الفاظ یہ ہیں:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ؕ

ترجمہ: پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ انسان کو لیس دار مادہ سے پیدا کیا۔ پڑھو اور تیرا رب وہ کریم ہے جس نے قلم سے تعلیم کیا اور جس نے انسان کو سکھایا وہ جو وہ نہیں جانتا تھا۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور کریمی کا ذکر ہے۔ اس کی کریمی کا بیان فقط ایک ہی فیض بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو

قلم سے تعلیم دی اور اسے نامعلوم چیزوں کا علم دیا۔ گویا تخلیق کے بعد انسان پر اللہ تعالےٰ کا دوسرا احسان علم ہے۔

(۲) علم شرطِ نبوّت ہے۔

قرآن حکیم میں کئی مقام پر انبیاءؑ کی ایک امتیازی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ علم رکھتے تھے۔ حضرتِ لوط، حضرتِ یوسفؑ، حضرتِ موسےٰؑ، حضرتِ داؤد، اور حضرتِ سلیمانؑ کے تذکروں میں خصوصیت سے بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں حکم اور علم عنایت کیا۔ حکم سے مراد قوتِ فیصلہ ہے جس کے لیے علم نہایت ضروری ہے۔

چونکہ انبیائے کرام کا بنیادی فریضہ یہ تھا کہ اللہ تعالےٰ کے پیغام کی لوگوں کو تعلیم دیں اس لیے اللہ تعالےٰ انھیں علم وحکمت سے مالا مال کرتا رہا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فرضِ منصبی کے بارے میں اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے:

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۔

(ان کو اللہ کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور انھیں (برائی سے) پاک کرتا ہے اور انھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی کا بنیادی فریضہ تعلیم ہے جس کے لئے اللہ تعالےٰ اس کو علم کی امتیازی شان عطا کرتا ہے۔

(۳) علم شرطِ حکومت ہے:

قرآن حکیم میں آیا ہے کہ بنو اسرائیل نے جب اپنے ایک نبی سے کہا کہ ہم پر بادشاہ مامور کیا جائے جس کے زیرِ علَم ہم جہاد کریں گے تو اللہ تعالےٰ نے

نے حضرتِ طالوت کو ان پر بادشاہ مقرر کیا۔ طالوت ایک غریب آدمی تھے۔ اس لئے بنو اسرائیل نے جھٹ اعتراض کر دیا کہ اسے ہم پر بادشاہی کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اس پر نبی نے جواب دیا کہ اللہ تعالےٰ نے اسے علم اور بدن میں فوقیت دی ہے۔ یہ سُن کر اسرائیلی دم بخود رہ گئے۔

اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ حکمران کے لئے صاحب علم ہونا ضروری ہے۔ جاہل حکمران قوم کو غلط رستے پر ڈال دیتا ہے۔

طلبِ علم

طلبِ علم فرض ہے:

سابقہ صفحات میں ہم نے دیکھا ہے کہ علم انسانیت کی شرط ہے۔ اس کے بغیر کسی انسان کا شرف قائم نہیں رہ سکتا۔ اس لئے اسے حسب ضرورت اور حسب استطاعت سیکھنا چاہیے۔ بلکہ علم کا ایک ایسا حصّہ بھی ہے کہ جس کا حاصل کرنا فرضِ عین ہے۔ جس نے اس میں کوتاہی کی وہ مجرم ہوا۔ جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ [1]

(علم کی طلب ہر مسلمان پر فرض ہے)

اس میں مرد اور عورت کی کوئی تخصیص نہیں۔ جہاں تک فرضِ عین علم کا تعلق ہے۔ اس سے عورت کو بھی معافی نہیں۔ اس کو دین اور زندگی کے بنیادی امور سے آگاہ ہونا چاہیے۔

جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مستورات کو بھی دین کی ضروری تعلیم دیا کرتے تھے۔ اُمہات المومنین کا ایک فریضہ یہ تھا کہ وہ مومن عورتوں

---

[1] الترغیب والترہیب بحوالہ ابن ماجہ وغیرہ

کو دینی مسائل سے آگاہ کیا کریں۔ مرد ہو یا عورت جس نے بھی دین کی تعلیم حاصل کی اس نے دنیا و آخرت دونوں کو سنوار لیا۔ ارشادِ نبوی ہے کہ اللہ تعالےٰ جس کی بھلائی چاہتا ہے اسے دین میں سمجھ عطا کر دیتا ہے[۱]

اگر کوئی آدمی ذہنی یا کسی اور مجبوری کی وجہ سے کوشش کے باوجود علم حاصل نہ کر سکے تو بھی اسے ثواب ملتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ جس نے علم کی طلب کی اور وہ کامیاب ہوا تو اسے دوہرا اجر ملے گا اور اگر وہ ناکام رہا تو اکہرا اجر پائے گا[۲]

طلب علم نفل عبادت سے افضل ہے :

عبادت کا فائدہ اپنی ذات تک محدود رہتا ہے اور علم کی برکت میں ملت بھی حصہ دار ہوتی ہے اس لئے طلب علم کا درجہ ہر نفل عبادت سے افضل ہے، یہاں تک کہ بقول حضرتِ ابن عباسؓ رات کی ایک گھڑی علم سیکھنا ساری رات کی عبادت سے بہتر ہے[۳] حضرتِ ابن عمرؓ نے فرمایا ہے کہ فقہ کی ایک مجلس ساٹھ سال کی عبادت سے افضل ہے[۴]

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ عالم کو عابد پر اسی طرح فضیلت حاصل ہے جیسے چودھویں کے چاند کو سب ستاروں پر[۵] حضورؐ نے عالم کو چودھویں کے چاند سے اس لئے تشبیہ دی ہے کہ وہ دنیا کو دین کے نور سے منور کرتا ہے۔

طلب علم کی کوئی انتہا نہیں : علم کا اُفق بے حد وسیع ہے۔ اس

---

[۱] بخاری کتاب العلم [۲] مشکاۃ کتاب العلم [۳] مشکاۃ کتاب العلم [۴] اسلامی نظام تعلیم و سیاست ملی [۵] مشکاۃ کتاب العلم

کی وسعتیں کائنات کی طرح پھیلی ہوئی ہیں۔ اس لئے جو آدمی طلب علم کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیتا ہے وہ مہد سے لے کر لحد تک بھی اس کے لئے کوشاں رہے تو اس کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مومن نیک علم سے کبھی سیر نہیں ہوتا حتیٰ کہ جنت میں پہنچ جاتا ہے۔[۱]
آپ کا ایک اور فرمان ہے کہ طالب علم اور طالب دنیا دونوں کا جی نہیں بھرتا البتہ دونوں میں فرق ہے اور وہ یہ کہ طالب علم اللہ تعالےٰ کی رضا میں بڑھے جاتا ہے اور طالب دنیا سرکشی میں بڑھتا جاتا ہے[۲]

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینۃ العلم تھے جس کے کنارے اُفق تا اُفق پھیلے ہوئے تھے تاہم اللہ تعالیٰ کا آپؐ سے ارشاد ہوا:

وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (طٰہٰ ۲۰)

(اور کہیے کہ اے میرے رب میرا علم بڑھا)

علم کی پیاس کبھی بجھ نہیں سکتی۔ نیک علم دنیا کے کسی خطے میں بھی ہو اُسے حاصل کرنا چاہیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حکمت کا کلمہ حکیم کی گمشدہ چیز ہے اسے جہاں پائے وہ اس کا حق دار ہے[۳] مراد یہ ہے کہ اسے سیکھنے میں عار نہ کرے۔

علم کی تلاش میں ساری دنیا کے سفر سے بھی گریز نہیں کرنا چاہیے۔ جہاں سے کوئی اچھی چیز ملے اسے لے لیا جائے۔ اور کوئی بری چیز سامنے آئے تو اس سے اجتناب کیا جائے۔

آج سفر بہت آسان ہے لیکن کسی زمانے میں سفر کرنا جان کو ہلاکت

---

[۱] مشکوٰۃ کتاب العلم [۲] مشکوٰۃ کتاب العلم [۳] مشکوٰۃ کتاب العلم

میں ڈالنے کے برابر تھا تاہم جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طلب علم کی خاطر سفر اختیار کرنے کی تاکید فرمائی ہے - اس بارے میں آپؐ کے چند ارشادات درج ذیل ہیں :-

جو آدمی تلاشِ علم کا رستہ اختیار کرے اللہ تعالے اس کے لئے جنت کا رستہ آسان کر دیتا ہے۔[1]

جو آدمی علم کی تلاش میں نکلتا ہے وہ واپسی تک اللہ کی راہ میں ہوتا ہے۔[2]

طالب علم کو علم کی تلاشِ کے دوران موت آجائے تو وہ شہید ہوتا ہے۔[3]

جو آدمی تلاشِ علم کا رستہ اختیار کرے اللہ تعالے اس کے لئے جنت کا راستہ آسان کر دیتا ہے - فرشتے طالب علم پر اظہارِ رضا کے لئے پروں کا سایہ کرتے ہیں۔ عالم کی مغفرت کے لئے آسمانوں اور زمینوں کی ہر چیز حتیٰ کہ مچھلیاں بھی مغفرت کی دعا کرتی ہیں۔ عالم کو عابد پر اسی طرح فضیلت حاصل ہے جس طرح چاند کو سب ستاروں پر۔ علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ انبیاء نے درہم و دینار نہیں چھوڑے - انھوں نے علم کا ورثہ چھوڑا ہے۔ جس نے اس ورثہ کو لیا اس نے بہت وافر حصہ پایا۔[4]

جماعتی تدریس :

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جماعتی تدریس کی ہدایت

---

[1] ریاض الصالحین کتاب العلم [2] ریاض الصالحین کتاب العلم [3] جامع بیان العلم
[4] - ریاض الصالحین کتاب العلم

فرمائی ہے تاکہ لوگوں کو علم حاصل کرنے میں سہولت ہو۔ آپ کی حیاتِ مبارک میں مسجدِ نبوی میں علمی مجلسیں برپا ہوتی تھیں جن میں حضورؐ صحابہؓ کو تعلیم دیتے تھے اور وہ باہم بھی ایک دوسرے سے علم حاصل کرتے تھے۔

ایک دفعہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد نبوی میں تشریف لائے تو دیکھا کہ دو مجلسیں منعقد ہیں۔ آپؐ نے فرمایا، دونوں نیکی میں معروف ہیں البتہ ایک دوسرے سے افضل ہے۔ ایک مجلس والے اللہ تعالیٰ سے مانگتے اس سے دعا کرتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ ان کا سوال پورا کرے یا نہ کرے اس کی مرضی ہے۔ البتہ یہ دوسری مجلس والے فقہ اور علم حاصل کر رہے ہیں اور بے علموں کو پڑھا رہے ہیں یہ افضل ہیں۔ مجھے بھی معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہے۔ یہ فرما کر حضورؐ اس مجلس میں شریک ہو گئے۔[۱]

آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشادِ مبارک ہے کہ جب کسی مسجد میں لوگ جمع ہوتے ہیں اور مل کر قرآن شریف کی تلاوت کرتے ہیں اور اس کو آموختہ کرتے ہیں تو ان پر تسکین نازل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت انھیں ڈھانپ لیتی ہے اور فرشتے ان پر چھا جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے مقربین میں یاد کرتا ہے۔[۲]

ایک بار آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا کہ جب تم جنت کے باغوں سے گزرو تو ان کا پھل کھاؤ۔ صحابہؓ نے پوچھا، جناب! جنت کے باغ کون سے ہیں؟

فرمایا، علم کی مجلسیں۔[۳]

---

[۱] مشکوٰۃ کتاب العلم [۲] اربعین نووی بحوالہ مسلم
[۳] الترغیب والترھیب کتاب العلم۔

علم کی شروط

علماء کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ ہیں جو دنیا کے بہترین لوگ ہیں اور دوسرے جو بدترین مخلوق ہیں، پہلی قسم کے علماء صحیح اور صالح علم حاصل کرتے ہیں۔ وہ ان شرائط کو مدِ نظر رکھتے ہیں جو اسلام نے علم کے لئے مقرر کی ہیں - یہ شرائط مندرجہ ذیل ہیں :-

تقویٰ

عمل

تحقیق

نفع رسانی

ذیل میں ہم ان پر الگ الگ بحث کریں گے۔

(۱) تقویٰ :

اللہ تعالیٰ کا خوف علم کی بنیادی شرط ہے۔ حضرتِ عبداللہ بن مسعودؓ کا قول ہے کہ علم خوفِ خدا کا دوسرا نام ہے [۱]

علم کا تقویٰ سے مشروط رہنا ازبس ضروری ہے کیونکہ :

(i) اللہ تعالیٰ کا خوف نہ ہو تو آدمی اپنے علم کو نیک کام میں لگانے کے بجائے برائی میں صرف کرتا ہے۔ غدار اور منافق انسان علم کے بدولت نہایت چالاک اور پرکار ہو جاتا ہے۔ منافق کا ایک نہایت کامیاب ہتھیار حکیمانہ کلام ہوتا ہے۔ وہ اپنی گفتگو کو علم کا رنگ دے کر بہت پرکشش بنا لیتا ہے اور عوام کو نہایت آسانی سے اپنے جال میں پھانس لیتا ہے۔ جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مجھے اپنی

اُمّت کے بارے میں منافقوں کا اندیشہ ہے جن کا کلام حکیمانہ اور عمل ظالمانہ ہوگا۔[1]

ہر عالم کی اوّلین پرکھ اس کی پرہیزگاری ہے۔ اگر وہ پرہیزگار نہ ہو تو اس سے کنارہ کرنا چاہیے۔

(ب) اگر اللہ تعالیٰ کا خوف نہ ہو تو آدمی گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی ذہنی قوت برباد ہو جاتی ہے۔ حافظہ ختم ہو کر رہ جاتا ہے اور فکری استعداد سلب ہو جاتی ہے۔ جس آدمی کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہو وہ برائیوں سے دور رہتا ہے اور اس کی ذہنی قوت ٹھکانے سے خرچ ہوتی ہے۔

اللہ تعالےٰ کا خوف دل میں دنیا کی حد سے بڑھی ہوئی محبت پیدا نہیں ہونے دیتا۔ تقویٰ کے بدولت ذہن بے کار خیالات اور تصورات سے خالی رہتا ہے اور اس میں علم کی پوری آمادگی پیدا ہو جاتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب آدمی کو دنیا سے رغبت نہ ہو اللہ تعالےٰ اس کے دل میں حکمت اگاتا ہے اور اسے اس کی زبان پر بھی جاری کرتا ہے۔ اس کو دنیا کے عیوب دکھاتا ہے اور دنیوی امراض اور ان کے علاج سے آگاہ کرتا ہے اور اسے عافیت کی دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔[2]

(ج) تقویٰ غرور پیدا نہیں ہونے دیتا۔ غرور علم کے لئے زہر ہے۔ اس سے ریاء پیدا ہوتی ہے اور طلب حق کا صحیح جذبہ ختم ہو جاتا ہے۔ بارہا محض اپنے وقار کے لئے متکبّر عالم جان بوجھ کر غلط مسلک اختیار کر لیتا ہے۔ خود

---

[1] مشکوٰۃ باب البکاء والخوف۔ [2] مشکوٰۃ کتاب الرقاق۔

بھی گمراہ ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے۔

(۲) عمل :

اسلام نے علم کے ساتھ عمل کو لازم قرار دیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علم باعمل کو خیر کے لفظ سے یاد کیا کرتے تھے[1] حضور کا ارشاد ہے کہ قیامت کے روز ہر عالم سے پوچھا جائے گا کہ تم نے علم کو کیسے برتا ہے[2]

ایک دفعہ چند صحابہؓ مسجدِ قبا میں بیٹھے علم کی باہم تدریس کر رہے تھے۔ آں حضرت علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے انھیں دیکھ کر فرمایا کہ جتنا پڑھ سکتے ہو پڑھو لیکن جب تک عمل نہ کرو اللہ تعالیٰ تمھیں اجر نہیں دے گا[3] ایک صحابیؓ کا قول ہے کہ جب ہم دس آیات پڑھتے تھے تو انھیں علمی اور عملی لحاظ سے خوب سمجھ چکنے کے بغیر آگے نہ بڑھتے تھے[4]

جو عالم صاحبِ عمل نہ ہو قرآنِ حکیم اسے گدھے سے تشبیہ دیتا ہے جس پہ کتابوں کا بار لدا ہو۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہر وہ علم جس پر عمل نہ ہو وبال کا سبب ہوتا ہے[5]

اسلامی دنیا میں جس قدر علماء اٹھے وہ علم اور عمل ہر دو کے پیکر ہوتے تھے۔ علم کے ساتھ ساتھ شہسواری، تیغ رانی اور تیر اندازی بھی سیکھتے تھے۔ جب انھیں میدانِ جہاد کی طرف بلایا جاتا تو بے دریغ لبّیک کہتے تھے۔

علم باعمل کا ایک اور تقاضا یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو علم کو تجربہ کی دنیا میں

---

[1] مشکوٰۃ کتاب العلم میں خیر کا لفظ کئی جگہ علم باعمل کے لئے آیا ہے۔

[2] ریاض الصالحین باب الخوف [3] جامع بیان العلم۔ [4] جمع الفوائد باب آداب العلم

[5] الترغیب والترھیب کتاب العلم

پرکھا جائے۔ علم محض باتوں کا بتنگڑ نہ ہو۔ تجربہ کے بغیر آدمی علم کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

لَا حَكِيمَ إِلَّا ذُو تَجْرِبَةٍ [۱]

(صرف تجربہ کار آدمی ہی صاحب حکمت ہوتا ہے)

قرآن تجرباتی علم کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اسلام سے قبل اگر حکمت کہیں تھی بھی تو محض نظری اور کتابی حکمت تھی۔ اسلام نے بتایا کہ جب تک عملی علم و حکمت نہ ہو اس وقت تک نرا کتابی علم بے کار ہے۔ اہل اسلام نے اقوام عالم کے سامنے تجرباتی علم رکھا اور بتایا کہ صحیح فکر اور فلسفہ وہی ہے جس کو تجربہ کی کسوٹی پر پرکھا جائے

۲۔ تحقیق:

ہر معاملے میں تحقیقی نقطۂ نظر ہونا چاہیے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آدمی کے لئے یہی بہتیرا جھوٹ بن جاتا ہے کہ وہ کوئی خبر سنے اور (بغیر تحقیق) آگے پہنچا دے [۲]

اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہر بات کا فوراً اعتبار نہیں کرنا چاہیے، بلکہ اسے ایک خاص معیار پر پرکھنا چاہیے۔ اللہ تعالے نے عقل اسی لئے دی ہے کہ اس سے کام لیا جائے۔

قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ط إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا (پ ۱۵ ع ۱۴)

ترجمہ: اور جس بات کی تجھے خبر نہیں اس کے پیچھے نہ پڑ۔ یقیناً کان اور آنکھ اور

---

[۱] مشکاۃ باب الحذر [۲] تذکرۃ الحفاظ ذہبی۔

دل، اُن میں سے ہر ایک سے پُوچھ ہو گی۔
اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ علم کوئی اٹکل پچّو چیز نہیں۔ اللہ تعالےٰ نے انسان کو اعضاء اس لئے دئیے ہیں کہ اُن سے کام لے۔ آنکھ کے ہوتے اندھا بنا اور ہر چیز کے پیچھے بغیر تحقیق کے پڑنا درست نہیں۔ انسان کو کل اللہ تعالےٰ کے آگے جواب دینا پڑے گا کہ اپنے اعضاء سے کیا کام لئے تھے۔ ان کو معطّل اور بے کار رکھنا بہت بڑی کوتاہی ہے۔

(۴) نفع رسانی :

علم سے کسی شخص کے دل میں یا تو اللہ تعالیٰ کی رضا اور خدمتِ خلق کی غرض ہو سکتی ہے اور یا دنیوی ہوس اور نمائش کی تمنّا۔ صالح علم وہ ہے جس کا بنیادی نصب العین اللہ تعالےٰ کی رضا اور نفعِ عامہ ہو۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ جس علم سے رضائے الہٰی مقصود ہونی چاہیے اگر وہ محض دنیوی لالچ کی خاطر سیکھا جائے تو سیکھنے والا قیامت کے روز جنّت کی ہوا بھی نہیں پائے گا[1]

جس علم سے صرف دنیا کی لالچ وابستہ ہو اس سے انسانیت کو بہت کم نفع ہوتا ہے بلکہ بار ہا ضرر پہنچتا ہے جیسے کہ موجودہ دور میں سائنس نے دنیوی اغراض کے پیچھے چل کر نہایت تباہ کن آلاتِ جنگ تیار کر دئیے ہیں۔ ایسا علم اگرچہ بظاہر اوروں کے لئے ضرر رساں ہوتا ہے لیکن بالآخر اس علم کے مالک کو بھی تباہ کر دیتا ہے۔

رحمانی علم وہی علم ہے جو دنیا کے لئے فائدہ بخش ہو ورنہ علم شیطانی سرمایہ

---

[1] ریاض الصالحین کتاب العلم

ہے - اس لیئے مفید علم کے حصول کی کوشش کرنی چاہیئے - جناب رسالت مآب
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کی بارگاہ میں یوں دُعا کرتے تھے !
(اے اللہ! تونے مجھے جو علم دیا ہے اس سے مجھے فائدہ بخش
اور مجھے (مزید بھی) وہ علم دے جو فائدہ بخش ہو - اے ربّ میرا
علم بڑھا دے)[1]

حضور کا ارشاد ہے کہ اگر کسی شخص کو اس اثناء میں موت آجائے جب کہ
وہ احیائے اسلام کے لیئے علم طلب کر رہا ہو تو جنت میں اس کے اور انبیاء
کے درمیان صرف ایک درجہ کا فرق ہوگا[2]

جناب ہادیِ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ صرف دو آدمیوں
سے رشک ہو سکتا ہے - ایک وہ جسے اللہ نے مال دیا ہو اور وہ اُسے حق
راہ میں خرچ کرے اور دوسرے وہ جس کو اللہ تعالیٰ نے حکمت دی ہو او
اس کے موافق فیصلہ کرے اور اس کی تعلیم دے[3]

بعض لوگ محض ذاتی نمائش اور مجلسی رتبہ کے لیئے علم حاصل کرتے ہیں
ان کا علم محض تکلف کے لیئے ہوتا ہے - وہ ہر مسئلہ میں دخل در معقولات
دے کر اسے بگاڑتے ہیں - ان سے کوئی سوال پوچھئے وہ اپنے پاس سے جوا
گھڑ کے فوراً حاضر کر دیتے ہیں اور گمراہی پیدا کرتے ہیں - وہ بات بات
کج بحثی کرتے ہیں اور ہر صاحبِ علم کے لیئے منہ آنا موجبِ فخر سمجھتے ہیں
ایسے لوگ دوزخ کے مہمان ٹھہریں گے - ارشادِ نبوی ہے کہ جس شخص

---

[1] مشکاۃ باب جامع الدعاء [2] مشکاۃ کتاب العلم
[3] ریاض الصالحین کتاب العلم -

علم محض اس لئے حاصل کیا کہ وہ علماء سے بحث کرے یا نادانوں کا منہ بند کرے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مائل کرے وہ دوزخ میں داخل ہوگا[1]

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قیامت کے روز سب سے پہلے جن تین آدمیوں کا امتحان ہوگا ان میں ایک وہ عالم ہوگا جس نے محض دکھاوے کے لئے علم حاصل کیا ہے۔ اسے منہ کے بل دوزخ میں پھینک دیا جائے گا[2]

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی دعاؤں میں بے نفع علم سے پناہ مانگا کرتے تھے[3] آپ کا ارشاد ہے کہ قیامت کے روز سب سے زیادہ عذاب اس عالم کو ہوگا جس کے علم سے لوگوں کو نفع نہیں[4]

حضرت حسن بصریؒ کا قول ہے کہ علم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک علم وہ ہے جو دل میں گھر کرتا ہے۔ یہی علم نافع ہوتا ہے۔ دوسرا وہ علم ہے جو فقط زبان تک محدود رہتا ہے۔ اسی علم کو اللہ تعالےٰ لوگوں کے خلاف حجت کے طور پر لائے گا[5] مراد یہ ہے کہ جو لوگ اس علم کے مالک ہوں گے اللہ تعالےٰ انہیں عذاب دے گا۔

علم کی اشاعت

علم کی طلب چونکہ اہل اسلام پر فرض ہے اس لئے اس کی نشر و اشاعت میں تعاون کرنا ہر مسلمان پر فرض کفایہ ہے۔

تعلیم کا اہتمام کرنا اسلامی حکومت کے اولین فرائض میں شامل ہے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مبارک میں ہر مسجد میں مکتب لگتا تھا۔ مختلف قبیلوں

---

[1] مشکوٰۃ کتاب العلم [2] ریاض الصالحین باب تحریم الریاء
[3] ترمذی ابواب الدعوات [4] الترغیب الترھیب کتاب العلم۔
[5] مشکوٰۃ کتاب العلم

سے اُن کے نمائندے آکر مدینہ میں اسلام کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور واپس جا کر اس کی اشاعت کرتے تھے۔

جناب ہادیِ برحق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عرب بھر میں لکھنے پڑھنے کا مذاق عام کر دیا۔ آج کل کے زمانے میں یہ بات انوکھی نظر آئے گی کہ اسلام سے قبل عرب کے لوگ قلم کو ہاتھ لگانا عار سمجھتے تھے۔ اسے شہری زندگی کے بے کار تکلفات میں شمار کرتے تھے۔ دیہات کے بدو شہری باشندوں کے تکلفات کو نہایت حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جہاں تک شہری زندگی کی خواندگی کا تعلق ہے اس وقت مکہ لیے متمدن شہر کا یہ حال تھا کہ پوری آبادی میں صرف سترہ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے لیکن اسلام کے بدولت علم کا رواج اس تیزی سے پھیلا کہ تھوڑی ہی مدت میں صحرا نشین عرب علم کے کاروانوں کی رہبری کرتے نظر آتے۔

اسلام کی علمی تحریکات کی عالمگیر کامیابی کا سبب یہ تھا کہ اسلام نے طلب علم اور نشرِ علم کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے اور اس فریضہ میں کوتاہی کرنے والوں کو مجرم گردانا ہے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کسی سے علم کے بارے میں کوئی بات پوچھی جائے اور وہ جانتے بوجھتے نہ بتلائے تو قیامت کے روز اسے آگ کی لگام دی جائے گی۔[1]

اشاعتِ علم کے بارے میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چند ارشادات درج ذیل ہیں:

۱۔ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً [2]

ترجمہ: مجھ سے جو سنو اُس کی تبلیغ کرو چاہے وہ ایک آیت ہی ہو۔

---

[1] ریاض الصالحین کتاب العلم [2] ایضاً

۲۔ ضروری علم اور قرآن سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ۔[1]

۳۔ اللہ تعالیٰ اس آدمی کو شادکام رکھے جس نے میری باتیں سُنیں، انھیں از بر کر کے یاد رکھا اور انھیں نشر کیا۔[2]

۴۔ صرف دو آدمیوں سے رشک جائز ہے۔ ایک وہ جسے اللہ تعالیٰ نے مال دیا اور اس نے نیک کام میں خرچ کیا۔ دوسرا وہ جسے اللہ نے حکمت دی اور وہ اس کے بموجب کام طے کرتا ہے اور اس کی تعلیم دیتا ہے۔[3]

۵۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اور ارض و سماوات کی ہر شے حتیٰ کہ چیونٹی اور مچھلی بھی نیک علم پڑھانے والے کی بھلائی چاہتی ہے۔[4]

علم کی جستجو اور اس کی اشاعت چونکہ دینی فریضہ ہے اس لئے ہمارے علماء نے اس راہ میں طلب صادق اور جہدِ پیہم کی حیرت انگیز مثالیں قائم کی ہیں جو آج بھی ہمارے لئے مشعلِ ہدایت ہیں۔ صرف امام احمد بن حنبلؒ کی مثال ہی لیجئے۔ آپ طفلی ہی میں سایۂ پدری سے محروم ہو گئے تھے۔ مالی حالت بہت تنگ تھی۔ اس لئے تحصیل علم کی راہ میں بہت مصائب اُٹھائے۔ برسوں پردیس میں رہے۔ کوفہ میں گئے تو یہ حال تھا کہ اینٹ کا سرہانہ رکھ کر سوتے تھے یمن کا سفر کیا تو شتربانوں کی ملازمت کرنی پڑی۔ واپسی کے پیدل سفر میں پاؤں شق ہو گئے۔ ان مصائب کے باوجود کسی پہ بوجھ نہیں بنتے تھے کرایہ پر سامان ڈھونے کی بھی نوبت آئی لیکن کسی کے شرمندۂ احسان نہ ہوئے۔

علمائے کرام کی زندگیاں اس حقیقت کا نقش ہمارے دل پر مزید پختہ کرتی ہیں کہ ہمیں علم حاصل کرنے اور اس کی اشاعت میں کوئی کمی نہیں کرنی چاہیے ورنہ کل ہم

---

[1] مشکوٰۃ کتاب العلم [2] مشکوٰۃ کتاب العلم [3] ریاض الصالحین کتاب العلم [4] ایضاً

اللہ تعالٰی کی بارگاہ میں جواب دہ ہوں گے۔

علم کے ثمرات

(۱) علم خدا شناسی سکھاتا ہے:
علم پر قرآن حکیم نے اس قدر تاکید کی ہے کہ اسے خدا شناسی کی ابجد قرار دیا ہے:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ط
إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُوا الْأَلْبَابِ ۞

(اے نبی کہہ دیجئے کہ کیا علم والے اور بے علم لوگ برابر ہیں۔ صرف وہی لوگ سوچتے ہیں جن کو عقل ہے) (الزمر۔ ۹)

ایک اور آیت ہے: شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ وَ الْمَلَائِكَةُ وَأُولُوا الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ ط

(اللہ نے، اور فرشتوں نے اور علم والوں نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ صاحب انصاف حاکم ہے) (آل عمران۔ ۱۸)۔

ان دونوں آیات سے قطعیت کے ساتھ ثابت ہوتا ہے کہ صاحب علم شخص ہی کو توحید کا گہرا احساس ہوتا ہے۔

(۲) علم قوت ہے:
حقیقی قوت یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالٰی کی ہدایات کے بموجب کائنات کو اس طرح تسخیر کرے کہ اسے اپنے مقصد کے لئے آسانی سے استعمال کر سکے۔ یہ تسخیر صرف علم ہی سے ممکن ہے۔ حقائق کی تلاش اور نئی ایجادات میں صرف علم کے بدولت ہی آدمی کامیاب ہو سکتا ہے۔ یہ کامیابی بین الاقوامی سربلندی کا وسیلہ ہے۔

(۳) علم صدقہ جاریہ ہے: علم کے اثرات زندگی کے بعد بھی باقی

رہتے ہیں۔ اس لئے نیک علم صدقۂ جاریہ کا کام دیتا ہے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ علم نافع کا ثواب زندگی کے ساتھ منقطع نہیں ہوتا ہے۔[1]

(۴) آخرت میں اجر:

علم توحید اور عملِ صالح کی راہ پر چلاتا ہے اس لئے آخرت میں علماء کے بہت بلند مراتب ہوں گے۔ سورۃ المجادلہ میں ارشاد ہے کہ تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنہیں علم عطا ہوا ہے اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے گا۔

---

[1] ریاض الصالحین کتاب العلم

خدمتِ خلق

مفہوم خدمتِ خلق سے مراد ہے اللہ تعالےٰ کی رضا کی خاطر مخلوق کی مدد اور معاونت کرنا۔

قرآنِ حکیم اور حدیث میں اس کا قریب المعنی لفظ تعاوُن ہے۔

خدمتِ خلق کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس میں انسان و حیوان سب شامل ہیں۔

خدمتِ خلق کی رُوح :

خدمت کا مفہوم سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی روح کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اگرچہ بنیادی اور ظاہری اعتبار سے خدمتِ خلق سے مراد بے معاوضہ خدمت ہے لیکن انسان چاہے تو اپنی ملازمت اور کاروبار میں بھی اس روح کو سمو سکتا ہے۔

انسان کو روزی کمانے سے چارہ نہیں۔ لیکن وہ اپنی ملازمت یا کاروبار میں یہ نظریہ پیدا کرے کہ میں روزی پیدا کرنے کے ہمراہ خدمتِ خلق بھی کر سکتا ہوں تو انسانیت کا ایک نہایت مفید فرد ثابت ہوگا وہ ملازمت کے فرائض نہایت دیانت داری اور تن دہی سے انجام دے گا۔ اگر وہ کاروباری آدمی ہے تو کسی کو دھوکا نہیں دے گا ناجائز منافع نہیں لے گا، چور بازاری نہیں کرے گا اور ملک کی اخلاقی اور اقتصادی ترقی میں بہت مددگار ثابت ہوگا۔ ہمارے سامنے خلفائے راشدین

کی زندگیاں اس کی مثال پیش کرتی ہیں۔ ان کے بعد بھی حضرت عمر بن عبد العزیزؒ
اور صلاح الدین ایوبی ایسے فرماں روا آئے جنھوں نے حکومت کے خزانے سے
صرف ضرورت بھر خرچ لیا اور اپنی زندگیاں قوم کی خدمت میں وقف کردیں۔
اپنے گھر والوں کی خدمت کرنا اگرچہ بظاہر ایک دنیوی فریضہ ہے لیکن اگر آدمی
یہ فرض اللہ تعالےٰ کی خوشنودی کی غرض سے ادا کرے تو یہ بھی اللہ تعالےٰ کی نگاہ میں
خدمتِ خلق شمار ہوگی۔

مراتب

خدمتِ خلق کا اعلےٰ ترین درجہ یہ ہے کہ دوسروں کی خدمت کے لئے
دل اس طرح بے تاب رہے گویا اپنی ہی خدمت کا ایک نادر موقع
ہاتھ آرہا ہے۔ اس جذبہ کے ساتھ اگر رستہ کے درمیان سے ایک کانٹا
بھی دور کردیا جائے تو اس کا ثمرہ جنت کی صورت میں ملے گا۔

وسعت

خدمتِ خلق کی دنیا بہت وسیع ہے۔ دل کی خیر خواہی سے
لے کر میدانِ جہاد میں سر کٹوانے تک خدمتِ خلق کے بے شمار
مقامات آتے ہیں۔ نادار اور معذور آدمی اور کوئی کام انجام نہ دے سکے تو خلق
کے لئے دعا مانگ کر ہی خدمتِ خلق کا حق ادا کرسکتا ہے۔

روحانی خدمت:

روحانی خدمت بدنی اور مالی خدمت سے بھی بڑھ کر لازم ہے۔ برائی سے
بچانا اور نیک راہ پر چلانا روحانی خدمت ہے۔ ایک بار جناب رسالت مآب
صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا، تیرا (مسلمان) بھائی چاہے ظالم ہو چاہے
مظلوم تو اس کی مدد کر۔ ایک صحابیؓ نے پوچھا، مظلوم کی تو مدد کروں لیکن ظالم
کی مدد کیسے ہو؟ فرمایا، اسے ظلم کرنے سے بچا۔ اس کی یہی مدد ہے[1]

---

[1] ترمذی ابواب الفتن، مسلم کتاب البر والصلہ، بخاری کتاب المظالم۔

...برائی کو روکنا اور نیکی کی تبلیغ کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔

خدمتِ خلق کی تبلیغ :

کسی شخص کے بس میں نہیں کہ وہ ساری دنیا کی خدمت کر سکے۔ اس لئے خدمتِ خلق کا تقاضا ہے کہ پوری قوم میں تعاون کے لئے آمادگی ہو۔ اس مقصد کے لئے تبلیغ کی ضرورت ہے۔ جنابِ ہادیِ برحق صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اگر انسان کسی مجبوری سے حاجت مند کی مدد نہ کر سکے تو اسے چاہیے کہ کسی اور شخص کو سفارش کر دے[1] آپ کا فرمان ہے کہ اگر خود نیکی نہ کر سکو تو کسی اور ہی کو سفارش کر دو۔ یہ بھی نیکی ہے[2]

اہمیت

دنیا میں وہی قوم کامرانی اور راحت سے ہم کنار ہو سکتی ہے جس کے افراد میں خدمتِ خلق کا جذبہ ہو۔ خدمتِ خلق کا جذبہ انسان سے بہت ایثار کا طالب ہوتا ہے۔ انسان اپنے آرام کو چھوڑ کر اور قیمتی وقت سے صرفِ نظر کر کے کسی کی خدمت میں مصروف ہو یہ بہت بڑی قربانی ہے۔ اس کی توقع اسی انسان سے ہو سکتی ہے جسے اللہ تعالٰی نے بہت عظیم اخلاق عطا کیا ہو۔ اس میں ایثار، بے نفسی، انکسار، مساوات، محنت کشی اور ہمدردی کے اوصاف ہوں۔ قرآن حکیم نے نیک لوگوں کا ایک وصف یہ بتایا ہے : وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ٥[3]

اس کا ترجمہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالٰی کی محبت کے لئے مسکین، یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں۔ اس کا ایک اور ترجمہ یہ ہے کہ حالانکہ ان کو کھانے کی خود بھی ضرورت اور خواہش ہوتی ہے لیکن وہ مسکین، یتیم اور اسیر کو کھانا کھلا دیتے

---

[1] بخاری کتاب الادب [2] بخاری کتاب الادب [3] پارہ ۲۹ ع ۱۹

ہیں۔ مُراد یہ ہے کہ خود بھُوکے رہ جاتے ہیں۔

مسلمانوں کی زندگی راہ خدا میں وقف ہے :

مسلمان کی زندگی اللہ تعالےٰ کی راہ میں وقف ہونی چاہیے۔ اگر وہ اپنی زندگی کا ایک حصہ خلقِ خدا کی خدمت میں بسر نہیں کرتا تو بخیل ہے اور اللہ تعالےٰ کی نگاہ میں مجرم۔ اگر کسی جگہ ایذا رساں چیز پڑی ہو تو اسے دُور نہ کرنا گناہ ہے۔ کوئی کسی مشکل یا مصیبت میں ہو تو اس کی حاجت روائی سے جان بوجھ کر گریز کرنا عصیان ہے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کسی آدمی کے پاس چٹیل میدان میں فالتو پانی ہو اور وہ مسافر کو نہ دے تو اللہ تعالےٰ قیامت کے روز اس سے کلام نہ کرے گا، نہ اس پر رحم کی نظر ڈالے گا اور نہ اسے گناہوں سے پاک کرے گا[1]

اسلامی فقہ کا مسئلہ ہے کہ اگر چند اشخاص کے پاس پانی ہو اور ان کے قریب کوئی آدمی ان کے علم کے باوجود پیاسا مر جائے تو ان پر اس کی جان کی قیمت کا تاوان ڈالا جائے گا۔

جس طرح مال کی زکوٰۃ فرض ہے اسی طرح بدن کی زکوٰۃ بھی لازم ہے اللہ تعالےٰ نے انسان کو صحیح بدن اور سالم و تنومند اعضاء دیئے ہوئے ہوں تو ان سے مخلوقِ خدا کی خدمت کے لئے بھی ضرور کچھ کام لے۔ اللہ تعالےٰ نے انسان کو وقت کی بے اندازہ دولت عطا فرمائی ہے۔ چاہیے کہ اس وقت کی بھی زکوٰۃ نکالے اس کا ایک حصہ خدمتِ خلق میں صرف کرے۔

آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے کہ ہر روز جب کہ سورج

---

[1] ریاض الصالحین باب المنثورات حدیث نمبر ۲۶۔

طلوع ہوتا ہے انسان کے ہر جوڑ پر صدقہ واجب ہو جاتا ہے، تو دو آدمیوں کے درمیان عدل سے فیصلہ کرے تو یہ صدقہ ہے۔ تو کسی آدمی کو سواری میں مدد دے تو یہ صدقہ ہے، تو اسے سواری پر بٹھائے یا اس پر اس کا سامان رکھے تو یہ صدقہ ہے، کلمہ طیبہ صدقہ ہے، ہر قدم کے عوض جو تو نماز کے لئے اٹھاتا ہے صدقہ ہے اور تو ایذا دہ رساں چیز کو راستہ سے ہٹائے تو یہ بھی صدقہ ہے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدمتِ خلق کی تاکید ایسے الفاظ میں کی ہے جن سے اس کی فضیلت ہزار چند ہو جاتی ہے۔ آپؐ کا فرمان ہے کہ مجھے رمضان بھر کے روزے رکھنے اور اس مہینے مسجدِ حرام میں بیٹھ کر اعتکاف کرنے سے یہ زیادہ عزیز ہے کہ اپنے بھائی کی بوقتِ ضرورت امداد کروں[1]

خدمتِ خلق کا رتبہ:

خدمت کا اسلام میں بہت بلند مرتبہ ہے۔ سَیِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُمْ (قوم کا سرداران کا خادم ہوتا ہے) حضرتِ عمرؓ خطوط میں اپنے نام کے ساتھ اَجِیْرُ الْمُسْلِمِیْن لکھا کرتے تھے۔ ایک دن سرکاری اونٹوں پر تیل مل رہے تھے۔ ایک صحابی رضؓ نے دیکھ کر کہا کہ یہ کام کسی سرکاری غلام سے لیا ہوتا۔ فرمایا مجھ سے بڑھ کر کون غلام ہو سکتا ہے؟

خدمت کے فیض میں سب مخلوق شریک ہے:

خدمتِ خلق کا فیض اللہ تعالےٰ کی سب مخلوق کے لئے عام کیا جائے۔ اس میں مسلم و غیر مسلم، امیر و غریب اور انسان و حیوان جس کو ضرورت ہو

---

[1] کنز العمال جلد دوم

مستفید کرنا چاہیے۔ ہم اس موضوع پر مندرجہ ذیل عنوانوں کے تحت بحث کریں گے۔

(۱) اہل اسلام کی خدمت :

قرآن حکیم میں آیا ہے کہ مسلمان ایک دوسرے کے ولی ہوتے ہیں مراد یہ ہے کہ ان کے درمیان قلبی رفاقت ہوتی ہے۔ اس قلبی رفاقت کو تباصنا اور آپس میں تعاون رکھنا اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہونا ہر مسلمان کا طبعی خاصہ ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تو مومنوں کو باہمی رحمدلی، محبت اور ارتباط میں ایک جسم کے مانند دیکھے گا کہ جب ایک عضو بیمار ہو تو سارا جسم بے خوابی اور بخار میں شریک ہو جاتا ہے [۱] حضور کا ایک اور ارشاد ہے کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہوتا ہے۔ نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ مشکل کے وقت اس کا ساتھ چھوڑتا ہے [۲] آپ نے فرمایا ہے کہ جب کوئی مسلمان کسی ایسے مسلمان کی مدد نہیں کرتا جس کی حرمت یا عزت کی ہتک ہو رہی ہو تو اللہ تعالے بھی بوقت ضرورت اس کی مدد نہیں کرتا [۳]

خدمتِ خلق ہر مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق ہے۔ جو شخص یہ حق ادا نہیں کرتا وہ اللہ تعالے کے آگے جواب دہ ہوگا۔

(ب) امیر و غریب کی خدمت :

اسلام میں امیر و غریب کی کوئی فریق بندی نہیں۔ سب بھائی بھائی ہیں۔ امیر آدمی سے محض اس لئے بغض رکھنا حرام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے مال دار کیا ہے۔ رہا غریب تو اسے محض غریبی کے سبب سے حقیر اور ناقابل التفات سمجھنا انسانیت سے بعید ہے۔

---

[۱] صحیحین [۲] صحیحین [۳] دلیل الفالحین بحوالہ ابو داؤد۔

سیرۃ النبیؐ کے مؤلف شبلی لکھتے ہیں کہ حضرت خباب کے گھر میں کوئی مرد نہ تھا اور عورتوں کو دودھ دوہنا نہیں آتا تھا۔ اس بنا پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر روز ان کے گھر جاتے اور دودھ دوہ دیا کرتے۔ مدینہ کی لونڈیاں آپؐ کی خدمت میں آتیں اور کہتیں "یا رسول اللہ! میرا یہ کام ہے"۔ آپؐ فوراً اٹھ کھڑے ہوتے اور ان کا کام کر دیتے۔

ایک حبشی عورت مسجد النبی میں جھاڑو دیا کرتی تھی۔ وہ چند روز نہ آئی۔ حضورؐ نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وفات پا چکی ہے۔ لوگوں نے اس کی موت کی خبر حضورؐ تک پہنچانے کے شایاں نہیں سمجھی تھی۔ آپؐ نے فرمایا مجھے بتاؤ اس کی قبر کہاں ہے؟ آپؐ قبر پر تشریف لے گئے اور نماز پڑھی [1]

(ج) غیر مسلموں کی خدمت:

ضرورت پڑنے پر غیر مسلم کی بھی مدد کرنی چاہیے۔ سورۂ توبہ میں آیا ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم تمھارے پاس پناہ کا طالب ہو کر آئے تو اسے پناہ دو اور حفاظت کے ساتھ اس کے ٹھکانے پہنچاؤ۔

(د) حیوانات کی خدمت:

حیوانات کو مشکل یا مصیبت سے نکالنا بہت ثواب کا کام ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دن یہ واقعہ بیان کیا کہ ایک شخص سفر پر تھا۔ رستے میں پیاس لگی۔ اچانک ایک کنواں نظر آیا۔ اس میں اترا۔ پیاس بجھا کر اوپر آیا تو دیکھا کہ ایک کتا پیاس کے مارے کنوئیں کے کنارے کی نم آلود مٹی چبا رہا ہے۔ مسافر کو ترس آیا۔ دوبارہ کنوئیں میں اترا۔ اس کے پاس برتن نہ

---

[1] مسلم کتاب المساجد

تھا۔ اپنے موزے کو پانی سے بھرا، اسے منہ میں تھام کر باہر آیا اور کُتّے کی پیاس بجھائی۔ اللہ تعالےٰ کو اس کا یہ فعل اس قدر پسند آیا کہ اس کی مغفرت کر دی۔ صحابہؓ نے یہ واقعہ سُن کر پوچھا، حضورؐ! کیا جانوروں کی خدمت کا بھی ثواب ملے گا۔ آپؐ نے فرمایا، ہر ذی روح چیز کی خدمت میں ثواب ہے[1]

مستحقین کے مدارج:

ویسے تو ہر ضرورت مند مدد کا مستحق ہوتا ہے لیکن ان کے مدارج میں فرق ہے مثلاً ایک ہی وقت دو آدمیوں کی مدد کے درمیان فیصلہ کرنا لازم ہو تو متقی آدمی کو ترجیح دی جائے گی۔ اسی طرح بے کس لوگوں کے بعض طبقے ایسے ہیں جن کی بے کسی کے پیشِ نظر ان کو اوروں پر ترجیح حاصل ہے۔ ان میں بالخصوص یتیموں، بیواؤں اور معذوروں کا بہت خیال رکھنا چاہیے۔ جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بیوگان اور مسکینوں کی مدد میں کوشاں رہنے والا ایسا ہے جیسا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا یا رات بھر کا عبادت گزار اور دن بھر کا روزہ دار[2] یتیم کے بارے میں آپ نے فرمایا ہے کہ یتیم کا مُربّی میرے اس قدر قریب ہوگا جیسے میری یہ دو اُنگلیاں[3]

خدمتِ خلق اور اربابِ اقتدار:

بلند مناصب اور مال و دولت کے ساتھ تکبّر کا بہت خدشہ ہوتا ہے۔ اسے دُور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ حکمران طبقہ وقتاً فوقتاً خدمتِ خلق کے بعض عوامی امور میں حصّہ لے۔ اس کا ایک اور فائدہ یہ ہوگا کہ ان کے دیکھا

---

[1] ریاض الصالحین باب الحث ۔۔۔۔ [2][3] بخاری

دیکھی عوام میں خدمتِ خلق کا جذبہ اور پروان چڑھے گا۔

حضرت عمرؓ جن دنوں خلیفہ تھے وہ مجاہدین کی محاذِ جنگ سے بھیجی ہوئی چٹھیوں کو ان کے گھروں پر تقسیم کرنے کے لئے بنفسِ نفیس تشریف لے جاتے اور ان کی چوکھٹ پر بیٹھ کر چٹھیاں تحریر کر دیتے۔ ایک بار مدینہ کے باہر گشت کر رہے تھے۔ دیکھا کہ ایک عورت نے ہنڈیا چڑھا رکھی ہے اور بچے پاس رو رہے ہیں۔ آپؓ نے اس عورت سے بچوں کے رونے کا سبب پوچھا۔ اس نے کہا کہ ہمارے پاس کھانے کو کچھ نہیں۔ ان کے بہلاوے کو خالی ہنڈیا چولہے پر رکھ دی ہے۔ آپ اسی وقت مدینہ آئے۔ بیت المال سے خوردنوش کی اشیاء لے کر باندھیں اور اپنے غلام اسلم سے کہا کہ اٹھا کر میری پیٹھ پر رکھ دو۔ اس نے کہا، میں خود اٹھائے چلوں گا۔ فرمایا، آج تو یہ بوجھ تم سنبھال لو گے کل قیامت کے روز میرا بوجھ کون اٹھائے گا۔ آپ سامان اٹھائے واپس اس عورت کے پاس پہنچے۔ کھانا پکانے میں خود اس کی مدد کی۔ چولہا تک پھونکتے رہے۔ کھانا تیار ہو چکا تو بچوں نے سیر ہو کر کھایا۔

شروط

(۱) ایثار:

خدمت کے لئے ضروری ہے کہ انسان کے اندر ایثار کا جذبہ ہو یعنی وہ اپنی ذات پر دوسرے آدمی کو ترجیح دے۔ اگر ایثار کا جذبہ نہ ہو تو انسان کسی صورت خلق کی خدمت نہیں کر سکتا۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: کہ لوگوں کو پانی پلانے والا خود سب سے آخر پانی پئے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ پانی پلانا بہت خدمت ہے لیکن اس کا حق جبھی ادا ہو سکتا ہے کہ آدمی اوروں کو ترجیح دے اور اپنی پیاس کو دبائے رکھے۔

(۲) احسان نہ جتلانا:

جس نے بھلائی کر کے احسان جتایا اس نے گویا بھلائی اللہ تعالیٰ کی
طر نہیں کی تھی بلکہ کسی ذاتی غرض کے لئے کی تھی۔ اس کا کوئی ثواب نہیں
و سکتا۔ بلکہ احسان جتانے سے دوسرے آدمی کے جذبات کو جو صدمہ پہنچتا ہے
ں کا گناہ ہوگا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مدد دے کر احسان
تانے والے کو خسارہ مند بتایا ہے[1] مراد یہ ہے کہ اس کی نیکی اکارت گئی
ر گناہ لازم ٹھہرا۔

رات خدمتِ خلق کے دینی اور دنیوی ہر دو لحاظ سے بے شمار فوائد
ہیں جیسا کہ آں حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی مندرجہ ذیل احادیث
ے ثابت ہوتا ہے:

(۱) جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں مصروف رہتا ہے اللہ تعالےٰ
س کا مددگار رہتا ہے جس نے مسلمان سے تنگی دُور کی، اللہ تعالےٰ قیامت
ے روز اس سے تنگی دُور کرے گا[2]

(۲) اللہ تعالےٰ تمھیں صرف تمھارے ضعیف لوگوں کی مدد کے عوض ہی
زق دیتا ہے اور مدد کرتا ہے[3]

(۳) جس نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کا سامان تیار کیا وہ گویا جہاد
ں شریک ہوا۔ جس نے مجاہد کے بعد اس کے گھر والوں کی خبر گیری کی، اس
نے جہاد کی شرکت پائی[4]

---

[1] مسلم [2] دلیل الفالحین باب الیقین [3] ریاض الصالحین باب قضاء
حوائج المسلمین [4] ریاض الصالحین باب فی التعاون ..... الخ

(۴) ایک دفعہ ایک شخص نے رستہ سے شاخ ہٹادی تو اللہ تعالے نے اسے بخش دیا[1]

حضرتِ علیؓ کا قول ہے کہ جنت اس شخص کی سعی کی مشتاق رہتی ہے جو اپنے مؤمن بھائی کی حاجت روائی کرتا ہے[2]

(نوٹ: خدمتِ خلق پر مزید بحث اخوت کے زیرِ عنوان آئے گی)

---

[1] مسلم [2] کنز العمال ۲: ۱۶۱ -

آدابِ مجلس

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس گاہ بالعموم مسجد
ہوتی تھی۔ مسجدِ نبوی صرف عبادت کی جگہ نہ تھی بلکہ قومی صلاح ومشورہ
یوان بھی تھی۔ فرزندانِ اسلام کی آئے دن کی زندگی کے فیصلہ طلب امور
ں پیش ہوتے تھے۔ شارع اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عدالت بھی
ں لگتی تھی۔ خلافتِ راشدہ کے ایام میں بلکہ بہت بعد تک یہی دستور رہا۔
بھی ملتِ اسلامیہ کے اجتماعی امور کے بارے میں غور وخوص کا ٹھکانا یا رہا
د ہی قرار پاتی ہے۔ یہ حقائق ہمیں یہ درس دیتے ہیں کہ شارعِ اسلام صلی
علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں مسجد نبوی میں نشست وبرخاست کے جو
ب وآئین تھے وہی آج بھی ہماری عمومی مجلسوں کے لیے بمنزلہ ہدایت ہوں۔
عملی نظیریں ہیں۔ اس موضوع پر آپؐ کے زبانی ارشادات کا بھی خاصا ذخیرہ
د ہے۔

اسلام میں مجلسی زندگی کی اوّلین تربیت گاہ مسجد ہے۔ اس لئے بلا عذر
عتِ نماز میں شریک نہ ہونے والا عتابِ الٰہی کا مستوجب ہوتا ہے[1] مسجد
اہلِ اسلام کو دیگر بے شمار فوائد کے علاوہ نشست وبرخاست کی تربیت

---

[1] بخاری کتاب بدء الاذان

حاصل ہوتی ہے۔ مسجد میں صاف بدن اور ستھرے لباس کے ساتھ جانے کا حکم ہے۔ مسجد میں داخل ہوتے ہی یہ احساس جاگتا ہے کہ اب میں ایک ظاہری اور باطنی ضبط کے مقدس دائرہ میں داخل ہو گیا ہوں۔ مسجد میں جو آدمی پہلے آ کر جہاں بیٹھ جائے وہی اس جگہ کا حق دار ہو جاتا ہے اسے کوئی دوسرا وہاں سے نہیں اٹھا سکتا۔ بعد میں آنے والے اصحاب درمیان میں خالی جگہ دیکھیں تو وہاں جا کر بیٹھ سکتے ہیں ورنہ صفوں کے اخیر ہی میں جہاں ان کو جگہ ملتی ہے بیٹھ جاتے ہیں۔ مسجد میں امیر و غریب کے درمیان محل و مقام کی کوئی تمیز نہیں ہوتی خواجہ و خادم اور حاکم و محکوم سب ایک ہی صف میں دوش بدوش نظر آتے ہیں۔ باہر سے کوئی ذی جاہ یا صاحب ثروت شخص آئے تو کوئی آدمی تعظیم کو نہیں اٹھتا۔ اور نہ اس کے لئے موزوں مقام کی تلاش ہوتی ہے۔ جہاں اسے ٹھکانا ملتا ہے خاموشی اور تواضع کے ساتھ بیٹھ جاتا ہے۔

مسجد میں پیاز لہسن کی طرح بدبودار چیز کھا کر جانے کی اجازت نہیں[1] کیونکہ ان کی بدبو سے ہم نشینوں کو زحمت ہوتی ہے۔ مسجد میں تھوکنا منع ہے لغو، بے مقصد اور بے ہودہ گفتگو کی اجازت نہیں۔ شور و شغب حرام ہے سوائے ضروری گفتگو یا ذکرِ الٰہی کے خاموشی اور سکون کی پُر تمکنت فضا طاری رہتی ہے۔ نماز کے دوران دلی رغبت کے ساتھ امام کی وفادارانہ اطاعت ہوتی ہے۔ وہ جب خطبہ دیتا ہے تو سامعین نظم و ضبط کی مورتیں بنے ہمہ تن گوش ہو جاتے ہیں تاکہ مقرر کی زبان سے نکلا ہوا ایک لفظ بھی اَن سُنا نہ رہ جائے سوال کرنا ہو تو انتہائی ادب اور شائستگی کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ نہ اس میں لغویت کا شائبہ ہو اور نہ عدمِ تعظیم کا پہلو نکلتا ہو۔ الغرض صحن مسجد میں مجلسی

---

[1] مسلم کتاب المساجد ۲: ۸۰

آداب کا تقریباً ہر شعبہ سامنے آجاتا ہے۔

عام مجالس میں بھی انہی آداب کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اہل اسلام کی مجلس جہاں بھی ہوں اس میں تقدس کا رنگ ہونا چاہیے۔ بے ہودہ گفتگو، شور وغل اور گمراہ کن مشاغل سے مجلس کو پاک رکھنا چاہیے۔ ہنسی مزاح کی اجازت ہے لیکن اخلاقی حدود کے اندر۔ مزاح ایسا نہ ہو کہ اس میں پھوہڑپن آجائے یا کسی کی دل آزاری ہو۔ زیادہ ہنسی کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ آلہ وسلم نے زیادہ ہنسی کو دل کی موت کہا ہے۔ گفتگو ایسی ہو جس سے شرکائے مجلس کو فائدہ پہنچے۔ نکمی باتوں سے اسلام نے منع کیا ہے۔

کوئی مجلس ذکر خدا سے خالی نہ ہونے پائے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو لوگ ایسی مجلس سے اُٹھتے ہیں جس میں خدا کا ذکر نہیں آیا وہ گویا گدھے کی لاش کے سرہانے سے اٹھتے ہیں اور ان کے حصہ میں حسرت آتی ہے[1] آج کل ہمارے ہاں رواج ہے کہ عام جلسات کی ابتداء قرآنِ حکیم کی تلاوت سے کرتے ہیں یہ ایک نہایت مبارک قاعدہ ہے۔

مجلسی آداب کے بارے میں آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مزید احادیث یہ بتاتی ہیں کہ نیکوں کے ساتھ مجالس رکھو۔ نیک جلیس کی مثال ایک مشک بردار شخص کی ہے اور بُرے ہم نشین کی مثال ایک بھٹی دھونکنے والے کی۔ خوشبو والے سے مفت یا قیمتاً خوشبو ملے گی یا ویسے ہی اس سے عمدہ بُو آئے گی۔ اور بھٹی دھونکنے والا یا کپڑے جلائے گا یا بدبُو پہنچائے گا[2]

---

[1] ریاض الصالحین باب فی آداب المجلس بحوالہ ابوداؤد [2] ریاض الصالحین باب زیارۃ اہل الخیر ...... الخ بخاری کتاب الذبائح والصید ..... الخ

رستوں پر بزم مت جماؤ۔ اگر مجبوری ہو تو کافی رستہ چھوڑ کر بیٹھو۔[1]

کوئی آدمی کسی شخص کو مجلس سے اُٹھا کر نہ بیٹھے۔ دوسرے آدمی کے آنے پر کھل کر بیٹھو۔[2]

کسی آدمی کو حلال نہیں کہ دو آدمیوں کو بغیر اُن کی اجازت کے جُدا کر کے بیٹھے۔[3]

کوئی شخص اپنی جگہ سے اُٹھ کر جائے تو واپسی پر اپنی جگہ کا حق دار ہو گا۔[4]

جو شخص وسطِ حلقہ میں کھڑا ہوتا ہے اس پر لعنت ہے۔[5] (یہ اس لئے کہ جو لوگ اپنی سماعت یا دید کی تشفی کے لئے وسطِ مجلس میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان کے دیکھا دیکھی سبھی اُٹھ اُٹھ کر مجلس کو درہم برہم کر دیتے ہیں)

مجلس میں مت تھوکو۔ اگر مجبوری ہو تو کپڑے میں تھوکو۔[6] (آج کل مجلس میں رومال میں تھوک کر مَل دینے کا رواج ہے یہ درست ہے)

جب کوئی شخص جمائی کے وقت "ہا" کہتا ہے تو شیطان ہنستا ہے۔[7] جمائی شیطانی عمل ہے۔ جہاں تک ممکن ہو اسے روکو ورنہ منہ پر ہاتھ رکھ لو۔[8]

تین آدمی ہوں تو ان میں سے دو آدمی تیسرے سے الگ راز کی بات نہ

---

[1] بخاری کتاب المظالم اور مسلم باب النہی عن الجلوس الطرقات۔

[2] ریاض الصالحین بحوالہ صحیحین (بخاری کتاب الاحکام) ترمذی ابواب الاستیذان

[3] ترمذی ابواب الاستیذان و آداب

[4] ایضاً [5] ایضاً [6] صحیح مسلم ۸: ۲۳۲ حدیث جابر الطویل۔

[7] بخاری۔ کتاب بدء الخلق [8] صحیح مسلم۔

کریں[1]

ایک شخص نے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کسی کی (مبالغہ آمیز) تعریف کی۔ آپؐ نے فرمایا، تونے اس کی گردن اڑا دی۔ یہ الفاظ آپؐ نے باربار دہرائے پھر فرمایا کہ تعریف کرنی ہو تو کہو کہ میرا یہ گمان ہے اور اس کا صحیح حساب تو اللہ تعالے کے پاس ہوگا[2]

ایک شخص نے حضرتِ عثمان رضؓ کے سامنے اُن کی تعریف شروع کی۔ ایک صحابی رضؓ نے تعریف کرنے والے کے منہ پر کنکر پھینکنے شروع کئے۔ جناب عثمان رضؓ نے پُوچھا، یہ کیا؟ جواب دیا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں حکم دیا ہے کہ تعریف خوانوں کے منہ پر خاک ڈالا کرو[3]

(ان دو حدیثوں میں ان لوگوں کے لئے گراں بہا سبق ہے جن کے ہاں مجلسوں کا موضوع بالعموم تحسین باہمی ہوتا ہے۔ خوشامد گری اور خوشامد پسندی سے قوائے عملیہ شل ہو جاتے ہیں۔)

ایک شخص نے (مجلس میں) بات کی اور پھر جھانکا (کہ کوئی اور تو نہیں سنتا) تو یہ بات امانت ہے[4] مجلس میں جو اعتماد کی بات کہی جائے اسے افشا نہیں کرنا چاہیے۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: اَلْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَۃِ (مجلسیں امانت کے ساتھ ہیں)

آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ بات پسند نہ تھی کہ لوگ آپؐ کی تعظیم کو

---

[1] بخاری کتاب الاحکام ترمذی [2] صحیح مسلم ۸: ۲۲۸۔ باب النہی عن المدح ....الخ

[3] صحیح مسلم ۸: ۲۲۹ باب النہی عن المدح .....الخ

[4] ترمذی ابواب البر والصلہ۔

کھڑے ہوں۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ جس شخص کو یہ پسند ہو کہ اس کے آنے پر لوگ صورتِ تصویر کھڑے ہو جائیں وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں تلاش کرے۔ آپؐ سے بڑھ کر صحابہؓ کو کون عزیز تھا مگر جب آپؐ مسجد میں تشریف لاتے تو کوئی بھی کھڑا نہیں ہوتا تھا کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے ناپسند کرتے ہیں[1]

---

[1] ترمذی ابواب الاستیذان والادب۔

آدابِ شُرب و طعام[1]

کھانے پینے کے باب میں اوّلین ادب پاکیزگی ہے۔ قرآنِ حکیم نے ایک قاعدۂ کلیہ یہ بتایا ہے کہ پاک چیزیں حلال اور ناپاک حرام ہیں۔ پاکیزگی اخلاق اور صحت دونوں لحاظ سے مطلوب ہے۔ جو چیزیں اللہ تعالےٰ نے منع کر دی ہیں انھیں جزوِ خوراک نہ بنایا جائے۔ کوئی شخص ناجائز طور پر کما کر نہ کھائے اور نہ صفائی سے غفلت برتے۔

ہر مسلمان کو کھانے پینے کے بارے میں علم ہونا چاہیے کہ کیا چیز حلال اور کیا حرام ہے؟ جو چیزیں اللہ تعالےٰ نے حرام قرار دی ہیں وہ کسی صورت حلال نہیں ہو سکتیں، سوائے اس کے کہ بھوک کے ہاتھوں جان جانے کا خطرہ ہو۔ ایسے میں بھی فقط ضرورت بھر کھانے کی اجازت ہے اور وہ بھی اس تلخ احساس کے ساتھ کہ میں ایک غیر طیب چیز کو اپنے طیب منہ میں ڈال رہا ہوں۔

اس باب میں دوسرا بڑا ادب اِسراف (فضول خرچی) سے پرہیز ہے۔ اسراف ایک تو یہ ہے کہ آدمی ضرورت سے زیادہ پیٹ کا پجاری ہو جائے اور دوسرے یہ کہ چٹ پٹے کھانوں میں دل دئیے رہے۔ ان دونوں حد شکنیوں سے اسلام نے منع کیا ہے۔

کھانا پینا زندگی کو قائم رکھنے کا ایک وسیلہ ہے، مقصود بالذّات نہیں۔

---

[1] شَرب یا شُرب کے معنی ہیں پینا اور طعام کے کھانا۔ پینے کی چیز کو مشروب کہتے ہیں۔

زیادہ کھانا آدمی کو سست کر دیتا ہے اور اسے ہزار مرضوں میں گرفتار کراتا ہے۔ اس لئے غذا پر چوپایوں کی طرح نہیں لپکنا چاہیے۔ ہادیِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ دو کا کھانا تین کو اور تین کا چار کو کافی ہوتا ہے [۱] بلکہ ایک حدیث میں تو یہ ہدایت ہے کہ ایک کا کھانا دو کو، دو کا چار کو، اور چار کا آٹھ کو کافی ہوتا ہے [۲]

ایک دفعہ ایک کافر آیا اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاں مہمان ٹھہرا۔ آپؐ نے حکم دیا کہ اس کے لئے ایک بکری دوہی جائے۔ مہمان سب دودھ پی گیا۔ آپؐ نے دوسری بکری کے دوہنے کا حکم دیا۔ کافر اُسے بھی ختم کر گیا۔ اس طرح سات بکریوں کا دُودھ چڑھا گیا۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی سب ناشائستگیوں کو نہایت فراخدلی سے گوارا کیا۔ وہ بہت متاثر ہوا اور اگلی صبح اسلام لے آیا۔ اب اس کے لئے دودھ دوہا گیا۔ تو دو بکریوں کا دودھ بھی تمام نہ کر سکا۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مومن ایک آنت سے کھاتا ہے اور کافر سات آنت سے [۳] مراد یہ کہ مومن کا پیٹ قانع ہوتا ہے اور کافر کا حریص۔

جس طرح پرُخوری قبیح عادت ہے اسی طرح لذیذ کھانوں کے پیچھے بھاگنا بھی حقیر ذوق ہے۔ تاجدارِ رسل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سادہ کھانوں سے بہت رغبت تھی۔ مہینوں گھر میں چولھا نہیں دہکتا تھا۔ کھجور اور پانی ہی پر زیادہ گزران تھی [۴] نفیس چپاتیوں کا کبھی لطف نہیں اٹھایا [۵] چھلنیوں کا اُن دنوں

---

[۱] موطا جامع ما جاء فی الطعام والشراب۔ بخاری کتاب الاطعمہ۔
[۲] مسلم ج ۲ ص ۱۳۲ کتاب الاشربہ [۳] مسلم جلد ۲ ص ۱۳۳ کتاب الاشربہ
[۴] ریاض الصالحین باب فضل الجوع ..... [۵] ایضاً

رواج نہ تھا۔ پھونک مار کر آٹے کی بھوسی اڑا دیتے تھے[1] ایک دفعہ آپؐ نے اہلِ خانہ سے پوچھا، کیا گھر میں کوئی سالن ہے؟ جواب ملا کہ سوائے سرکہ کے اور کچھ نہیں۔ فرمایا سرکہ بہترین سالن ہے[2] آپ کھانے میں عیب چینی نہیں کرتے تھے۔ اس کی طلب ہوتی تو کھا لیتے ورنہ رہنے دیتے[3]

کھانے کے بارے میں اسلام ہدایت دیتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اکٹھے بیٹھ کر کھانا چاہیے۔ ایک دفعہ چند صحابہؓ نے آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے عرض کی کہ ہم کھانے پر بیٹھتے ہیں تو سیر نہیں ہوتے۔ فرمایا، شاید تم الگ الگ بیٹھتے ہو۔ عرض کیا، ہاں۔ فرمایا، مل کر کھانا کھاؤ اور خدا کا نام لو۔ اللہ تعالےٰ تمھیں برکت دے گا[4]

کھانے سے پہلے ہاتھ دھو لینے چاہییں۔ ابتداء میں کلمہ پڑھنا چاہیے۔ شروع میں بھول جائے اور درمیان میں یاد آ جائے تو بِسْمِ اللّٰهِ فِیْ اَوَّلِهٖ وَاٰخِرِهٖ کہے[5] خاتمہ پر اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہہ کر خدا تعالےٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ کھانے میں تکبر کی اجازت نہیں۔ خدا کو یاد کر کے عاجزانہ طریق سے دستر خوان پر بیٹھنا چاہیے۔ خوراک اللہ تعالےٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اس نعمت کے موقع پر جو شخص اللہ تعالےٰ کو یاد نہیں کرتا اور اس کے حضور میں ہدیۂ نیاز پیش نہیں کرتا وہ بھلا اور کس موقع پر خدا کا شکر گزار ہوگا۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تکیہ لگا کر نہیں کھاتے تھے[6] سونے چاندی کے برتنوں سے حضورؐ نے روکا ہے۔ آپؐ کا فرمان ہے

---

[1] ریاض الصالحین باب فضل الجوع ..... الخ [2] ریاض الصالحین کتاب الطعام۔
[3] مسلم کتاب الاشربہ ۲۴۶ ۲۴۶[4] ریاض الصالحین بحوالہ ابوداؤد
[5] ترمذی ابواب الاطعمہ [6] بخاری کتاب الاطعمہ۔

کہ جو شخص طلائی اور نقرئی برتنوں میں کھاتا ہے وہ اپنے پیٹ میں دوزخ کی آگ بھرتا ہے[1]

برتنوں کی صفائی کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ حدیث ہے کہ کھانے کے برتن ڈھانپ کر رکھنے چاہییں۔

سوائے مجبوری کے ہمیشہ دائیں ہاتھ سے کھانا چاہیے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بائیں ہاتھ سے کھانا شیطان کا کام ہے[2] اسلام اپنے پیروؤں کے آئے دن کے معمولات میں موافقت اور یکسانی پیدا کرنے کا خواہاں ہے۔ یہی موافقت قومی اتحاد کی بنیاد ہوتی ہے اس لئے اسلام دائیں ہاتھ سے کام لینے کا حکم دیتا ہے۔ ممکن ہے اس کے اور اسباب بھی ہوں۔ سید سلیمان ندوی رح لکھتے ہیں کہ ایک ہاتھ کو کھانے پینے وغیرہ کے لئے مختص کر دینے کا یہ فائدہ ہے کہ اس کی صفائی کا زیادہ خیال رہتا ہے۔ عام کام کاج میں دائیں ہاتھ کو استعمال کرنے میں یہ بہتری ہے کہ یہ ہاتھ دل سے دور ہے اس لئے دل پر اس کے جھٹکوں کا اثر کم پڑتا ہے۔

کھانے میں فقط تین انگلیوں سے کام لینا چاہیے[3] ضرورت پر گوشت وغیرہ کاٹنے کے لئے چھری کا استعمال مباح ہے۔

ایک سے زائد آدمی شریکِ طعام ہوں اور کھانا زیادہ نہ ہو تو کوئی آدمی دوسرے سے بڑھنے کی کوشش نہ کرے۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دو کھجوریں ملا کر مت کھاؤ۔۔۔ عربوں کا دسترخوان عام طور پر کھجوروں

---

[1] مسلم کتاب الاشربہ ۲: ۲۴۴ [2] مسلم باب آداب الطعام ۲: ۱۱۴

[3] مسلم باب آداب الطعام۔

ہی پر مشتمل ہوتا تھا۔ ہاں ساتھی اجازت دے تو اور بات ہے[1] سالن کے برتن میں اپنے سامنے سے ہاتھ ڈالنا چاہیے۔ تمام برتن میں ہاتھ مت گھماؤ۔ البتہ ایک برتن میں متفرق پھل ہوں تو بے شک اپنی پسند سے کھاؤ[2]

پینے کی اشیاء کے بارے میں ہادیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم ہے کہ ڈھانپ کر رکھو۔ آپ نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ مشکوں کو یا بڑے برتنوں کو جھکا کر اور اس سے منہ لگا کر پانی پیا جائے[3] آپ نے اس بات سے بھی روکا ہے کہ آدمی اونٹ کی طرح ایک ہی سانس میں پانی پی جائے بلکہ دو دو تین تین وقفہ سے پینے کی ہدایت کی ہے[4] آپ کا قاعدہ تھا کہ پینے کے دوران برتن سے منہ ہٹا کر تین بار سانس لیتے تھے۔ آپ نے برتن میں سانس لینے سے منع فرمایا ہے[5] سانس لے کر پانی پینے کا فائدہ آپ نے یہ بتایا ہے کہ یہ پیاس کو مٹاتا ہے، گوارائی پیدا کرتا ہے۔ اور طبیعت کو سیراب کرتا ہے[6] پانی میں پھونکیں مارنے سے بھی آپ نے روکا ہے۔ اگر تنکا وغیرہ ہو تو تھوڑا سا پانی انڈیل کر اسے گرا دو[7] ورنہ کسی اور چیز کی مدد سے اُسے نکالا جا سکتا ہے۔

اگر مجلس میں سب کو مشروب پلانا ہو تو دائیں طرف سے ابتداء کی جائے۔ اس سے بلند و پست کا امتیاز مٹ جاتا ہے۔ ایک دفعہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کوئی آدمی پانی ملا ہوا دودھ لایا۔ آپ کے دائیں طرف ایک اعرابی بیٹھے تھے اور بائیں طرف حضرت ابوبکرؓ۔ آپ نے کچھ دودھ پیا اور پھر پیالہ اعرابی کو دیا اور فرمایا کہ اَلْاَیْمَنُ فَالْاَیْمَنُ (دائیں طرف والا

---

[1] ترمذی۔ ابواب الاطعمہ [2] ایضاً [3] مسلم جلد ۲ آداب الطعام والشراب

[4] ترمذی ابواب الاشربہ [5]، [6] مسلم ۲،۱۱۲ باب کراہتہ التنفس فی نفس الاناء ... الخ

[7] موطا باب النھی عن الشراب فی الفضۃ۔ ترمذی ابواب الاشربہ۔

زیادہ حق دار ہے)۔ ایک دفعہ آپؐ کے پینے کے لئے کوئی شے لائی گئی۔ آپؐ کے دائیں طرف ایک لڑکا بیٹھا تھا۔ اور بائیں طرف چند بزرگوار صحابہ رضؓ تھے۔ آپؐ نے لڑکے سے کہا کہ کیا تو مجھے اجازت دیتا ہے کہ یہ مشروب ان بزرگوں کو دوں۔ اس نے عرض کیا، جناب! آپؐ کی عنایت سے جو چیز قسمت میں آئے میں اس میں کسی اور کے لئے ایثار نہیں کر سکتا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیالہ اسی کو دے دیا[1]

جس آدمی کو دیگر وں کو پانی پلانا ہو اُسے چاہیے کہ خود سب سے بعد میں پیئے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے الفاظ ہیں: سَاقِیُ الْقَوْمِ اٰخِرُهُمْ شُرْبًا (لوگوں کو پلانے والا پینے میں سب سے آخر میں ہوتا ہے)[2]

J. Sawan Shah
A.A. College
Jamia Islamia
via Arif Wala
Montgomery

---

[1] مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۱۲، ۱۱۳ باب استحباب ادارۃ الماء ...... الخ

[2] مسلم کتاب الصلوٰۃ جلد ۲ صفحہ ۱۴۰ باب قضاء صلوٰۃ الفائتۃ ...... الخ

آدابِ لباس

قرآنِ حکیم میں لباس کے مندرجہ ذیل مقاصد بتائے گئے ہیں۔

(۱) ستر پوشی۔
(۲) موسم کی سختی سے بچاؤ۔
(۳) دشمن سے حفاظت۔
(۴) زینت۔

آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جوتے کا یہ فائدہ بتایا ہے کہ جوتا پہننے والا گویا گھوڑے پر سوار ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ راحت سے رہتا ہے اور کئی ایذاؤں سے محفوظ رہتا ہے۔

لباس کے بارے میں اسلام نے جو احکام و آداب بتلائے ہیں وہ انہی مقاصد کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ قرآن حکیم میں بتایا گیا ہے کہ بہترین لباس، لباس تقوےٰ ہے۔ اس لئے اسلام ہم سے یہ توقع رکھتا ہے کہ لباس کے مقاصد تقوےٰ کے احساس کے محکوم رہیں۔ اگر لباس ایسا ہو کہ شرم و حیا کی حفاظت کے بجائے عریانی اور بے حیائی کی دعوت دے تو یہ لباس غیر اسلامی اور انسانیت سوز لباس ہوگا۔

اسلام کھانے پینے کی طرح لباس کے معاملہ میں بھی اسراف سے روکتا ہے اور میانہ روی کا حکم دیتا ہے۔

لباس کو مقصود بالذات نہیں بنانا چاہیے۔ تکلف اور تفاخر کی بے اعتدالیاں لباس کے اصل مقصد کو ضائع کر دیتی ہیں۔ اس ضمن میں اسلام کی مندرجۂ ذیل ہدایات ہیں:

(۱) لباس ایسا ہو کہ نہ تو ہاتھ پاؤں کے ہلانے کو مانع ہو اور نہ ستر پوشی میں کوتاہ۔ ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بات سے روکا ہے کہ چادر یوں لپیٹ کر اوڑھی جائے کہ ہاتھ نماز یا کسی اور کام کے لئے نکل نہ سکیں یا (تہمد پوش) آدمی گوڑ مار کر بیٹھے تو اس طرح کہ ستر عریاں ہو جائے[1]

(۲) لباس زینت بخش ہو: قرآن شریف میں وارد ہے: خُذُوا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (ہر نماز کے وقت زینت سے رہو) نماز کا حکم پانچ وقت ہے۔ اس لئے سارا دن زینت سے رہنا لازم ٹھہرا۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ اللہ تعالے اس بات کو چاہتا ہے کہ اس کی نعمت کی علامات اس کے بندے سے ظاہر ہوں۔ ایک صاحب آپؐ کے پاس گھٹیا لباس میں آئے۔ آپؐ نے پوچھا، کیا تمھارے پاس مال ہے؟ اس نے جواب دیا، ہاں اللہ تعالیٰ نے مجھے اونٹ گھوڑے بکریاں اور غلام دیئے ہیں۔ فرمایا، جب اللہ تعالے نے تجھے مال دیا ہے تو اس مال کے اور اللہ تعالے کی نعمت کے اثرات تجھ پر نظر آنے چاہییں[2]

حضرت عمرؓ کا بھی اس ضمن میں ایک قول ہے کہ جب خدا نے تمھیں کشائش دی ہے تو اپنے پر کشائش ظاہر کرو اور پورا لباس پہنو[3]

---

[1] نحل - ۸۱ [2] ترمذی کتاب اللباس [3] ابو داؤد کتاب اللباس باب فی فسل الخر فی الخلقان [4] موطا باب ماجاء فی لبس الثیاب للجمال بہا۔

ایک سفر میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر ایک خادم پر پڑی جس کے بدن پر پھٹا ہوا لباس تھا۔ آپؐ نے ایک ساتھی سے پوچھا کہ کیا اس کے پاس اور لباس نہیں۔ جواب ملا، ہے۔ آپؐ نے خادم کو حکم دیا کہ اچھے کپڑے پہنو[1]
آپؐ کا ارشاد ہے کہ تم اپنے بھائیوں کے پاس جاتے ہو تو اپنا سامانِ سفر اور پوشاک درست کرو تاکہ تم معزز نظر آؤ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو فحش اور تفحش (بد ذوقی) ناپسند ہے[2]

یاد رہے کہ زینت کا مدعا زیادہ زرق برق کا لباس نہیں بلکہ زینت سے مراد یہ ہے کہ لباس صاف ستھرا ہو اور ایسا ہو کہ مردانہ شان کے شایاں ہو۔ ایک طرف تو وہ بدنما لباس جس سے قامت کی بے ربطی ہوتی ہو زینت کے منافی ہے اور دوسری طرف وہ لباس اسراف کے تحت آتا ہے جس سے تن آسانی، تکبّر اور انسائیت کی جھلک نظر آئے۔ اسی لئے سوتی کپڑے چاہے قیمتی ہوں پہنے جا سکتے ہیں۔ ریشمی لباس کی اجازت اشد مجبوری کے سوا نہیں۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فقط ایک جوتا پہننے سے منع فرمایا ہے کیونکہ یہ بد زیبی اور بد مذاقی ہے۔ آپؐ کا حکم ہے کہ (سوائے ناچاری کے) دونوں جوتے پہنو یا دونوں اتار دو[3]

(۳) لباس فقط ضرورت بھر ہو۔ جہاں تک ممکن ہو فالتو لباس سے احتراز کیا جائے کیونکہ یہ اسراف ہے۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس نے مقدرت کے باوجود محض تواضع کے خیال سے کوئی (فالتو) لباس

---

[1] موطا باب ما جاء فی لبس الثیاب للجمال بہا [2] ریاض الصالحین بحوالہ ابوداؤد۔
[3] مسلم کتاب اللباس والزینۃ۔

چھوڑا اللہ تعالےٰ قیامت کے دن اسے سب لوگوں کے سامنے بلا کر اختیار دے گا کہ ایمان کا جو لباس چاہے چن لے[1]

(۴) لباس کا پہلا ستر پوش ہو:۔ ایک دفعہ حفصہؓ بنت عبدالرحمان حضرت عائشہ رضؓ کے پاس آئیں۔ حفصہؓ باریک اوڑھنی پہنے ہوئے تھیں۔ جناب عائشہ رضؓ نے اسے چاک کر دیا اور حفصہؓ کو موٹی اوڑھنی پہنائی[2] عورت کو اپنی ذات کی نمائش کرنے سے سخت امتناع ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول ہے کہ وہ عورتیں جو کپڑوں میں بھی عریاں ہیں، غیر مردوں کی طرف مائل ہیں اور انھیں دعوتِ میلان دیتی ہیں۔ وہ جنت میں نہیں داخل ہوں گی اور نہ اس کی بو ہی پائیں گی، حالانکہ جنت کی خوشبو پانچ سو برس کی مسافت سے آگے آئے گی[3] نیم پوشاک عورت کی جنسیت کو اور نمایاں کرتی ہے۔ اس لئے رمز شناس فطرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دنیا میں کتنی ہی ایسی ملبوس عورتیں ہیں جو قیامت کے دن ننگی ہوں گی[4] مراد یہ ہے کہ وہ پوشش کا حق بجا نہیں لاتیں۔ نیم عریانی مکمل عریانی سے بھی بڑھ کر قاتلِ اخلاق ہے۔ اس لئے اسلام اسے کسی حالت میں روا نہیں رکھتا۔

(۵) سادگی:۔ لباس میں ہمیشہ سادگی ملحوظ رہے۔ لباس میں تکلف اور بے جا آرائش مردوں کے شایاں نہیں۔ جو قومیں لباس کے زیب و زینت میں حد سے گزر جاتی ہیں ان سے مردانگی کا جوہر رخصت ہو جاتا ہے۔ اسی رمز کے پیشِ نظر ہادیِ اکبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ لباسِ فاخرہ ترکِ ایمان کا ایک حصہ ہے[5] آپؐ کی زندگی بتاتی ہے کہ لباس میں آپ تکلف نہیں فرماتے تھے۔

---

[1] ریاض الصالحین بحوالہ ترمذی [2] موطا۔ ماجاء فی لبس الثیاب للجمال بہا [3] ایضاً [4] ریاض الصالحین باب فضل الجوع ..... الخ حدیث ۲۷ بحوالہ ابوداؤد۔

آپؐ کا عام لباس قمیص، تہمد اور چادر ہوتا تھا۔ آپؐ کی وفات کے وقت آپؐ کا لباس فقط ایک پیوند کی بھدی چادر اور ایک موٹا تہمد تھا[1] جوتے سیدھے سادے آج کل کے چپل کی طرح ہوتے تھے۔ گدا چمڑے کا تھا جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی[2]

یہی سادگی امہات المومنین کی زندگی پر بھی چھائی ہوئی تھی اور عامۃ المسلمین بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اصحاب صفہ کے لباس کی یہ صورت تھی کہ ایک ہی بڑا کپڑا ہوتا تھا جسے گردن سے باندھ کر بدن سے لپیٹ لیتے تھے کبھی آدھی پنڈلی اور کبھی ٹخنوں تک لٹک رہا ہوتا تھا۔ اسے ہاتھ سے سنبھالتے رہتے تھے کہ ستر نہ کھلے[3] غریبی کے ہاتھوں وہ اچھا لباس نہیں خرید سکتے تھے۔

تکلف اور غرور سے اسلام سختی سے روکتا ہے۔ عرب میں دستور تھا کہ امراء اپنی شان دکھلانے کے لئے تہمد کو اتنا لمبا رکھتے تھے کہ زمین پر گھسٹتی آتی تھی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس کو حرام بتایا ہے اور فرمایا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالےٰ ان لوگوں پر نظر نہیں ڈالے گا جو اپنی پوشاک گھسیٹ کر چلتے ہیں[4] آپ نے بتایا ہے کہ ایک شخص غرور سے اپنی ازار لٹکائے چلا جاتا تھا۔ وہ زمین میں دھنس گیا۔ قیامت تک دھنستا چلا جائے گا۔

لباس میں بے جا تکلف نقصان کا موجب ہوتا ہے اس لئے آں حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے منع فرما دیا۔ ایک دفعہ آپؐ کسی غزدہ پر باہر تشریف

---

[1] مسلم کتاب اللباس والزینۃ ترمذی ابواب اللباس [2] مسلم کتاب اللباس والزینۃ ترمذی ابواب اللباس [3] ریاض الصالحین فضل الزہد والفقر بحوالہ بخاری۔

[4] ترمذی و مسلم کتاب اللباس موطا ابواب اللباس [5] بخاری کتاب بدء الخلق۔

لے گئے ہ۔ حضرتِ عائشہ رضؓ نے اس دوران چھت پر کپڑا لگا دیا۔ آپؐ واپس تشریف لائے تو بہت ناراض ہوئے۔ کپڑا پھاڑ دیا اور فرمایا اللہ تعالےٰ نے ہمیں یہ نہیں کہا کہ جب میں تمھیں رزق دوں تو اینٹ پتھر کو کپڑے پہنا دیں[1]

وضع :۔ اگرچہ اسلام میں کسی خاص لباس کا حکم نہیں لیکن یہ ضروری ہے کہ مردوں اور عورتوں کے لباس میں فرق ہو۔ مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے کی مشابہت کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اس حکم کے تحت لباس بھی آجاتا ہے۔

آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو مرد عورتوں کا اور جو عورتیں مردوں کا تشبہ کریں ان پر لعنت ہے[2]

زیوروں کی اجازت عورتوں کو ہے۔ لیکن مردوں کے لئے ممنوع ہیں۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک شخص کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی دیکھی۔ آپؐ نے اُتار کر پھینک دی اور اسے انگارے سے تشبیہ دی[3]

زیور کی طرح ریشمی لباس بھی مرد کو منع ہے۔ ایک دفعہ مدینہ میں ایک ریشمی حُلّہ بکنے آیا۔ حضرت عمرؓ نے آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے عرض کیا کہ آپؐ اسے خرید لیں اور جمعہ کے دن اور وفود کی آمد پر پہنیں۔ آپؐ نے فرمایا اس کو وہ شخص پہنے گا جو آخرت میں بے نصیب ہو۔ کچھ عرصہ بعد آپؐ کے پاس کہیں سے چند ریشمی حُلّے آئے۔ ان میں سے ایک آپؐ نے جناب عمرؓ کو دیا۔ انھوں نے عرض کیا کہ جناب! ریشمی حُلّہ کے بارے میں آپؐ جو کچھ فرما چکے ہیں اس کے پیشِ نظر مجھے کیوں عطا فرماتے ہیں۔ جواب دیا کہ میں نے تمھیں

---

[1] ابو داؤد کتاب اللباس [2] ایضاً [3] مسلم کتاب اللباس والزینۃ۔

پہننے کو نہیں دیا اسے بیچ کر حاجت میں لاؤ۔ ایک حُلّہ آپ نے حضرت اسامہؓ کو بھی بھیجا تھا۔ وہ پہن کر آپؐ کے سامنے آئے تو آپؐ نے ناخوش نظروں سے دیکھا۔ انھوں نے عرض کی کہ آپؐ ہی نے تو ارسال فرمایا تھا۔ فرمایا، میں نے پہننے کو نہیں بھیجا تھا بلکہ اس لئے کہ اسے پھاڑ کر عورتوں کے لئے اوڑھنیاں بنا دو۔[1]
حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے صرف کناروں پر چار چار انگل کے برابر ریشمی حاشیہ لگانے کی اجازت دی ہے۔ آپؐ کا ایک جُبّہ تھا جس کی جیبوں، آستینوں اور دامن پر ریشم کا کنارہ تھا۔[2]

---

[1] مسلم کتاب اللباس والزینۃ۔ یہ حدیث متعدد طُرق سے مروی ہے جن کا ماحصل اوپر دیا گیا ہے۔ [2] ابوداؤد باب الرخصۃ فی العلم وخط التحریر۔

عائلی زندگی

(کنبہ)

کُنبہ

مفہوم کنبہ یا گھر کا مفہوم اگرچہ کافی پھیلایا جا سکتا ہے اور اس میں غلام اور خادم بھی شامل سمجھے جا سکتے ہیں لیکن بنیادی طور پر کنبہ میاں، بیوی اور اولاد پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس لئے خانگی زندگی کے نظریہ پر جب بحث کی جاتی ہے تو اس کے عناصر زوجین (میاں بیوی) اور اولاد ہی سمجھے جاتے ہیں۔

نصب العین خانہ داری کا نہایت بلند اور وسیع نصب العین ہے ہادیِ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے نصف دین قرار دیا ہے[1]

خانگی زندگی کے مختصراً مندرجہ ذیل مقاصد ہیں:-

(۱) بقائے ملت

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نکاح کی بنیادی غرض بقائے ملت بتائی ہے۔ اس بارہ میں آپؐ سے متعدد احادیث مروی ہیں۔

پیدائشی خلقت کے لحاظ سے انسان کے بچے سے بڑھ کر کسی حیوان کا بچہ ضعیف اور محتاج نہیں ہوتا۔ اسے کئی برس خور و پرداخت کی ضرورت ہوتی ہے۔

---

[1] کنز العمال جلد ۸

یہ نہایت مشکل اور ہمت آزما کام ہے۔ اس مہم کا بیڑہ والدین ہی اٹھا سکتے ہیں اور اس کی کامیابی ایک منظم گھر ہی سے وابستہ ہو سکتی ہے۔

والدین کے سوا کون ہے جس کی جان اولاد کی جان میں ہو۔ والدین بچے کی پرورش میں پوری زندگی کا سرمایہ لگا دیتے ہیں۔ دن کا چین اور راتوں کا سکون اس پر قربان کر دیتے ہیں۔ اسے معمولی دکھ بھی ہو تو اپنی ساری خوشیاں بھول جاتے ہیں۔ بیمار پڑ جائے تو رات رات بھر بیدار اور بے خواب رہتے ہیں۔ اس کا چہرہ پژمردہ ہو تو ان کی ساری کائنات پر غم کے بادل چھا جاتے ہیں۔ وہ مسکرا اٹھے تو ان کی زندگی کی فضا منور ہو جاتی ہے۔

جس تندہی اور جاں سپاری سے والدین بچے کی حفاظت اور نگہ داشت کرتے ہیں وہ انہی کا حصہ ہے۔ گھر گویا ایک مضبوط قلعہ ہے جس میں قوم کے نونہال بیرونی حوادث سے مامون ہو کر پروان چڑھتے ہیں۔ والدین اس قلعہ کے نگران اور پاسبان ہیں۔

(۲) اوّلین تربیت گاہ:

گھر بچے کی اوّلین تربیت گاہ ہے۔ کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے اور گفتگو کے جو انداز بچپن میں سیکھتا ہے ان کی بنیاد بہت پختہ ہوتی ہے۔ بچپن میں مزاج اور حرکات و سکنات پر جو رنگ چڑھ جاتا ہے وہ عمر بھر ساتھ دیتا ہے اس کا بدلنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر خاندان کی اپنی روایات ہوتی ہیں۔ اس کے افراد زندگی کے کسی شعبہ میں ہوں ان پر ان روایات کی جھلک ہمیشہ باقی رہتی ہے۔

مسلمان والدین اپنی طرف سے حتی الوسع بچے کی نیک تربیت کرتے ہیں۔ اس کے دل میں ایمان کا جذبہ بٹھاتے ہیں۔ اسلام سے اس کی محبت پیدا

کرتے ہیں اور اسے زندگی کے خوش تما اطوار اور آداب سکھاتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے کہ گھر والوں کو نماز پڑھنے کا حکم دے اور اس پر پختہ رہ۔

قوم کی بقا کا راز اس کے حسنِ عمل میں ہے۔ حسن عمل تبھی پیدا ہو سکتا ہے کہ تربیت عمدہ ہو۔ اچھی تربیت مکتب اور مدرسہ میں بھی مل سکتی ہے لیکن گھریلو ماحول اخلاق سے بیگانہ ہو تو اُستاد یا معلم کی کوئی کوشش کارگر نہیں ہو سکتی۔ تربیت کی بنیاد گھر ہی میں رکھی جا سکتی ہے۔

گھر کی زندگی انسان کو دنیا کی وسیع تر زندگی کی ذمہ داریوں کے قابل بناتی ہے۔ گھر چھوٹے پیمانے پر ایک ریاست ہے جس میں میاں صدر کی حیثیت میں اور بیوی مشیر کے طور سے کام کرتی ہے۔ ان کے بچے اس ننھی منی سی ریاست کے باشندے ہوتے ہیں۔ یہاں کے قواعد اور پابندیوں کے خوگر ہو کر وہ اس قابل ہو جاتے ہیں کہ ریاستی قواعد اور قوانین کو خوشی سے قبول کر سکیں۔

(۳) اخلاقی طہارت:

اہلی زندگی اختیار کرنے کے بعد مرد اور عورت کئی فتنوں سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ عورت تو گویا اخلاقی قلعہ میں محفوظ ہو جاتی ہے۔ لہٰذا نکاح کے لئے ایک لفظ احصان بھی ہے۔ احصان کے معنی ہیں: قلعہ نشین کرنا، محفوظ کرنا۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اے جوانو! تم میں سے جو آدمی مہر و نفقہ کی استطاعت رکھتا ہے وہ نکاح کرلے۔ کیونکہ اس سے نگاہ پاک رہتی ہے اور اخلاق کی حفاظت ہوتی ہے جو شخص نکاح کی استطاعت نہ رکھتا ہو اُسے چاہیے کہ روزے رکھے[1] آپؐ کی ایک اور حدیث ہے کہ جب

---

[1] مسلم کتاب النکاح۔

کوئی مسلمان نکاح کرتا ہے تو شیطان چیخ اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کا بُرا ہو۔ اس نے مجھ سے دو تہائی دین بچا لیا [1]

نیک خاوند اور نیک بیوی ایک دوسرے کا اخلاق سنوارنے میں بہت اہم کردار انجام دیتے ہیں۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بات کی ہدایت فرمائی ہے کہ عورت کے انتخاب میں سب سے زیادہ ترجیح اس کی دینداری کو دو۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ دنیا کی افضل ترین متاع نیک عورت ہے [2]

والدین نیک ہوں تو اولاد پر بھی نیک اثر پڑتا ہے۔ بچے حسن سیرت اور حسن اخلاق سے آراستہ ہوتے ہیں۔ ایسے گھر کا اثر ماحول پہ بھی پڑتا ہے اور تبلیغ کے ایک مرکز کا کام دیتا ہے۔

(۴) آسائش اور راحت:

سورۃ الروم میں ارشاد ہے:

وَمِنْ اٰیٰتِہٖۤ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْۤا اِلَیْھَا

(اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمہاری ہی نوع سے تمہارے لئے جوڑے پیدا کئے تاکہ تم ان سے سکون پاؤ)

نیک میاں بیوی اور نیک اولاد کو قرآن حکیم نے آنکھوں کی ٹھنڈک بتایا ہے اگر صالح اور منظم گھر ہو تو میاں بیوی کے لئے آسائش اور راحت کی آغوش ہوتا ہے۔ میاں بیوی کا باہمی حسن سلوک جو قرار و سکون مہیا کرتا ہے وہ ڈھیروں دولت سے بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ جب والدین کو راحت

---

[1] کنز العمال (اکمال) جلد ۸۔ [2] کنز العمال کتاب النکاح۔

اور سکون نصیب ہو تو یقیناً بچوں کی تربیت بھی نہایت خوش گوار ماحول میں ہوگی۔ جس بدنصیب گھر میں میاں بیوی کے درمیان فساد رہتا ہو وہاں بچوں کی تربیت بھی ناقص رہ جاتی ہے۔

ماں کی گود گلاب کی پتی سے بھی زیادہ راحت بخش ہوتی ہے۔ ماں کی محبت بچے کے ذہن و بدن میں زندگی کی برقی رو پیدا کرتی ہے جس کے بغیر صحیح نشو و نما مشکل ہے۔ یہ محبت تبسم کی موج بن کر نظر آئے یا آنسو کی صورت ڈھلک جائے ہمیشہ نئی زندگی کا پیغام دیتی ہے۔

بچہ ماں باپ کے لئے جنت کا مہکتا ہوا پودا ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اولاد کی بُو جنت کی بُو ہے[۱]۔ والدین اس پودے کو بہت محنت سے سینچتے ہیں اور اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ وہ اس کے لئے ہزار دُکھ اُٹھاتے ہیں لیکن یہ جوں جوں بڑھتا ہے اسے دیکھ کر زندگی کے سارے رنج بھول جاتے ہیں۔

انسان کا گھر زندگی بھر اس کی مشکلات اور مصائب میں پناہ گزثابت ہوتا ہے۔ آدمی بیمار پڑ جائے تو گھر میں نہایت شفقت سے اُس کی خبر گیری اور تیمارداری ہوتی ہے۔ اس پر غم آئے تو گھر کے سب افراد اس کے شریک حال ہوتے ہیں اور اس کے دل کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں۔

یوں تو زندگی بھر اس بات کی ضرورت رہتی ہے کہ کٹھن وقت کے لئے کوئی گوشۂ امن میسر رہے لیکن بڑھاپے میں یہ ضرورت نہایت شدت کے ساتھ آموجود ہوتی ہے۔ بڑھاپا طاری ہو جائے تو ایسی امن گہ کے بغیر

---

[۱] کنز العمال جلد ۸

کیوں کر گزر ہو سکتا ہے جہاں ضعف کے غلبہ یا بیماری کے وقت فوراً تیمار دار اور خدمت گزار موجود ہوں، جو دل کی چاہ سے بغیر کسی طمع یا ظاہر داری کے خدمت کریں۔ یہ امن گاہ گھر کے سوا اور کہاں مل سکتی ہے؟

(۵) ذمہ داری کا درس:

گھریلو زندگی کے فرائض انسان میں ذمہ داری کا احساس خوب اجاگر کرتے ہیں۔ خانگی زندگی کے تقاضے ایک حساس اور غیور مرد کو زیادہ محنت اور جاں فشانی پر مجبور کرتے ہیں۔ اگر وہ برسرکار ہو تو اور مستعد ہو جاتا ہے اگر بے کار ہو تو کہیں نہ کہیں سر ٹکراتا پھرتا ہے اور رزق کے نئے نئے وسائل تلاش کرتا ہے نتیجہ یہ کہ قوم کی محنت کاری، وسائل اور سرمایہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کا نام لے کر محنت و مشقت اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی مدد کو پہنچتا ہے۔ سورۂ نور (آیت۔ ۳۲) میں ارشاد ہے کہ بن بیاہوں کو اور ان غلاموں اور لونڈیوں کو جو نکاح کے قابل ہیں نکاح کراؤ۔ اگر وہ محتاج ہیں تو اللہ تعالیٰ اُن کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا۔

اس موضوع پر ہادیٔ اکبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واضح ارشادات ملتے ہیں۔ مثلاً

اِلْتَمِسُوا الرِّزْقَ بِالنِّكَاحِ [1] (نکاح کے ذریعے رزق تلاش کرو)

ایک شخص آپ کے پاس فاقہ کی شکایت لے کر آیا۔ آپؐ نے فرمایا، نکاح کر دے [2]

---

[1] مدارک [2] تفسیر نیشاپوری۔

(۶) قومی دولت:

بچے قوم کا نہایت قیمتی بلکہ حقیقی سرمایہ ہیں۔ بڑے ہوکر قوم کی صفوں کو پُر کرتے ہیں۔ زندگی کے نئے نئے میدان تلاش کرتے ہیں علوم کو نئی شان عطا کرتے ہیں۔ صنعت و حرفت کا دامن پھیلاتے ہیں۔ نئی نئی ایجادوں اور تجارت سے قوم کی دولت میں اضافہ کرتے ہیں۔

(۷) آخرت کا توشہ:

اہلی زندگی کا ذمہ اٹھا لینا ایک بہت بڑی دینی ذمہ داری سنبھالنے کے برابر ہے۔ جو شخص اس سے عہدہ برآ ہوا اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت انعام ہوگا۔ احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ قیامت کے روز کمسن بچے والدین کی شفاعت کریں گے۔

خانگی زندگی کی کامیابی کی شروط

خانگی زندگی جبھی کامیاب ہوسکتی ہے کہ اسے ایک دینی فریضہ سمجھا جائے اور اس ضمن میں مندرجہ ذیل امور کی خاص طور سے نگہداشت کی جائے۔

(۱) کامل اتحاد۔

میاں بیوی میں کامل اتحاد اور تعاون ہونا چاہیے۔ یہ تعاون چونکہ عمر بھر کے لئے مطلوب ہوتا ہے اس لئے پختہ نیت سے ہو۔ اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کے درمیان طبعی محبت پیدا کردی ہے۔ ان کا فرض ہے کہ اس میں فرق نہ آنے دیں۔

(۲) فرائض کی صحیح تقسیم

اگر گھریلو زندگی میں فرائض کی صحیح تقسیم نہ ہو تو نظام میں انتشار پیدا ہو

جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کی تخلیق اس طرح کی ہے کہ مرد بیرونی دنیا کے لئے اور عورت خانگی فرائض کے لئے موزوں ہے۔ جہاں اس تقسیم کو ملحوظ نہ رکھا جائے وہاں نہ میاں بیوی کو راحت ملتی ہے اور نہ اولاد کو سکھ میسر آتا ہے۔ اولاد کی صحیح تربیت نہیں ہو سکتی اور وہ ذہنی اور اعصابی لحاظ سے مریض ہو جاتی ہے۔

(۳) اخلاقی پاکیزگی:

اخلاقی پاکیزگی میاں بیوی کے درمیان اتحاد کو پختہ کرتی ہے اور اولاد سے اُن کی عظمت تسلیم کراتی ہے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو خانگی زندگی کو انتہائی غریبی کے عالم میں بھی ذلت اور افراتفری سے بچاتی ہیں۔

اہلی زندگی اختیار کرنے کی تاکید

اہلی زندگی کا بوجھ اُٹھانا بہت مشکل ہے۔ بعض اشخاص اس تصور ہی سے گھبرا جاتے ہیں اور نکاح سے گریز کرتے ہیں۔ وہ قوم اور ملت کے خیر خواہ نہیں۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بارہ میں تاکیدی ہدایات ارشاد فرمائی ہیں۔ مثلاً

(۱) جو شخص میرے اور داؤدؑ اور سلیمانؑ اور ابراہیمؑ کے دین پر ہے اگر اس کی توفیق ہو تو نکاح کرے۔[۱]

اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نکاح سنتِ انبیاء ہے۔ اس سے فرار کرنا سنتِ انبیاء سے فرار کرنے کے برابر ہے۔

(۲) جس کو میری فطرت سے محبت ہے وہ میری سنت پر چلے اور یہ نکاح ہے۔[۲]

---

[۱] کنز العمال (کمال) جلد ۸ [۲] تفسیر نیشاپوری۔

(۳) مباح چیزوں میں اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں سب سے پسندیدہ
چیز نکاح ہے [۱]
(۴) جو آدمی نکاح کا مقدور رکھتا ہو اور نکاح نہ کرے اس سے
میرا کوئی واسطہ نہیں [۲]
(۵) نکاح سے اجتناب کرنا تحریم حلت یعنی حلال شئے کو حرام
گردانتا ہے [۳]
اسلام میں تحریم حلت فسق کے ہم معنی ہے۔
(۶) میرا مسجد کو جانا اور گھر کی طرف قدم اٹھانا ثواب میں برابر
ہے [۴]

خانگی فرائض سے عہدہ برآ ہونے کی تاکید

اسلام میں خانگی فرائض بجا لانے کی بہت تاکید ہے۔ اس بارے میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چند ارشادات درج ذیل ہیں :۔
(۱) جب بندہ اپنے گھر والوں کے کسی کام سے نکلتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ہر قدم کے عوض ایک درجہ لکھتا ہے اور جب وہ فارغ ہو چکتا ہے تو اس کی مغفرت کر دیتا ہے [۵]
(۲) انسان کے اعمال کے پلڑے میں جو چیز سب سے پہلے رکھی

---

[۱] مدارک [۲] تفسیر نیشاپوری [۳] کنز العمال (واکمال) جلد ۸۔
[۵] کنز الاعمال جلد ۸۔

جائے گی۔ اس ڈالنے پر کیا ہوا خرچ ہوگا۔[1]

(۳) ایک دینار تو راہ خدا میں خرچ کرے، ایک غلام آزاد کرنے میں، ایک مسکین کو دے اور ایک اپنے گھر والوں پر خرچ کرے ان میں سے سب سے زیادہ اجر اس دینار کا ہوگا جسے تو اپنے گھر والوں پر خرچ کرے۔[2]

(۴) تو خیرات کی ابتدا سب سے پہلے اپنے عیال سے کر۔[3]

(۵) وہ بیوہ عورت جو اپنے بچوں کی پرورش کی تکلیف اٹھاتی ہے قیامت کے روز اس طرح میرے قریب ہوگی جیسے یہ دو انگلیاں

(۶) بہترین صدقہ وہ ہے جو اس بیٹی پر کرنا ہے جسے خاوند نے طلاق دی اور وہ تیرے گھر واپس آگئی اور اس کا کوئی ذریعہ معاش نہ ہو

ایک دفعہ جہاد کے متعلق چرچا ہو رہا تھا لوگ مجلسوں میں اس پر گفتگو کیا کرتے تھے کہ جہاد سے بھی بہتر کوئی عمل ہے یا نہیں لوگوں کا خیال تھا کہ اس سے بہتر کوئی نہیں۔ مشہور عالم عبداللہ بن مبارک جب ان مجلسوں میں پہنچے تو انہوں نے فرمایا کہ اس سے بہتر ایک عمل ہے اور وہ یہ کہ آدمی اہل و عیال کو صلاحیت سے رکھے۔[illegible]

---

[1] کنز العمال جلد ۸ [illegible] ریاض الصالحین باب النفقۃ علی العیال [illegible] مشکاۃ باب الشفقۃ [illegible] ترجمہ کیمیائے سعادت [illegible] مشکاۃ باب الصد

حقوقِ اولاد

سے محبت میں اعتدال

اولاد کی محبت انسان کی فطرت میں ودیعت ہے۔ اس جذبہ
ر شدت ہے کہ اس کو اعتدال میں رکھنا از بس مشکل ہے۔ اولاد
کے ہاتھوں والدین زندگی بھر کٹھن امتحان میں مبتلا رہتے ہیں چنانچہ
کا بھی ارشاد ہے:

اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ۔

تمہارے اموال اور تمہاری اولاد تمہارے لئے ایک آزمائش

تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے انسان کو اپنا سب سے
اس کی راہ میں قربان کرنا پڑتا ہے۔ اولاد بھی انسان کی عزیز ترین
اس لئے بعض قدیم مذاہب نے انسان کو یہ راہ دکھائی کہ اپنی اولاد
اور بتوں کی بھینٹ چڑھا دے۔ یہ دستور عرب میں بھی تھا حضرت
علیہ وآلہ وسلم کے والد عبداللہ کو بھی ان کے باپ نے بتوں
نا چاہا تھا مگر پھر ان کی جان کے عوض سو اونٹوں کا نذرانہ دے

اولاد کی محبت کا اظہار نسی غیر معتدل یا حدود فراموش صورت

میں نہیں ہونے دیتا۔ نہ تو یہ حکم دیتا ہے کہ اولاد چونکہ تمھاری محبوب
دولت ہے اس لئے اس کو خدا کی خاطر ذبح کر دو۔ اور نہ یہ اجازت
کہ بس اولاد کے ہی ہو رہو اور اس کے آرام و آرائش اور ترقی و بہبو
سامان پیدا کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز رستہ اختیار کرو۔ اسلام ا
اور میانہ روی کا رستہ بتاتا ہے۔

والدین کے فرائض

اولاد کے بارے میں والدین کے
مختصراً درج ذیل ہیں :-

(۱) پرورش :

طلوع اسلام سے قبل عربوں میں کہیں کہیں کمسن اولاد کے قتل
تھا۔ کبھی تو دیوتاؤں کو نذرانہ چڑھانے کے لئے ایسا کرتے تھے ا
افلاس کے ہاتھوں مجبور ہو کر ان سے پیچھا چھڑاتے تھے۔ لڑکیوں
کی محرک عام طور پر یہ ننگ ہوتی تھی کہ کوئی شخص ان کا داماد
اسلام نے ان سب مظالم کا قلع قمع کیا۔ اولاد کی قربانی قانوناً
جو لوگ فاقہ کے خوف سے بچوں کو ہلاک کرتے تھے انھیں قرآ
بتایا کہ تمھارا اور ان کا رزق رساں اللہ تعالٰے ہے اس لئے افلا
سے ان کی جانیں نہ لو[1] مقتول بچیوں کی مظلومیت کا قرآن حکیم نے
نقشہ کھینچا ہے کہ آنکھیں بے اختیار اشکبار ہو جاتی ہیں[2] دین ا
بالخصوص لڑکیوں کی حیثیت کو انتہائی پستیوں سے اٹھا کر عزت
بام رفیع پر پہنچا دیا ہے۔

---

[1] انعام - ۱۵۲ [2] التکویر۔

اولاد کی پرورش کے ضمن میں قرآنِ حکیم نے یہ قانون بنا دیا ہے کہ بچہ کی رضاعت دو برس تک لازما ہو۔ ماں مر جائے یا طلاق سے کر الگ ہو جائے تو باپ دو برس تک رضاعت کا سامان کرے۔ رضاعت کی اہمیت اسلام نے اس قدر بڑھا دی کہ حرمت میں اس کا رشتہ حقیقی رشتہ کے برابر قرار دیا۔

لڑکی خلقتاً ضعیف ہوتی ہے۔ عہدِ جاہلیت میں مصنوعی غیرت کی چکی میں بھی یہی پستی تھی اس سے اس کی پرورش کے بارے میں اسلام خصوصی تاکید کرتا ہے۔ رحمۃ للعالمینؐ کا ارشاد ہے کہ

لڑکی کی پرورش والدین اور دوزخ کے درمیان پردہ ہے[1]

جو شخص دو لڑکیوں کو پال کر جوان کر دے تو حضور نے دو انگلیوں کو اٹھا کر فرمایا کہ اس کا اور میرا مرتبہ یوں ہوگا[2]

جس کی دو یا تین بیٹیاں یا بہنیں ہوں اور وہ ان کے ساتھ حسنِ سلوک رکھے تو وہ جنت میں داخل ہوگا[3]

ایک عورت حضرت عائشہؓ کے پاس آئی۔ اس کے ساتھ دو لڑکیاں تھیں۔ حضرت عائشہؓ نے سوال کیا۔ ان کے پاس فقط ایک کھجور تھی، وہی دے دی۔ اس عورت نے کھجور کو دو ٹکڑے کر کے بچیوں پر بانٹ دیا اور چلی گئی۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر تشریف لائے تو جناب عائشہؓ نے یہ واقعہ بیان کیا۔ آپؐ نے فرمایا جو شخص بچیوں کی آزمائش میں ڈالا گیا اور اس نے ان سے اچھا سلوک کیا تو وہ اس کے اور دوزخ کے درمیان پردہ

---

[1] ترمذی [2] مسلم، ترمذی [3] ترمذی۔

ہوں گی[1]

والدین کی طبعی محبت اولاد کی پرورش کے لئے بظاہر کافی محرک نظر آتی ہے۔ لیکن اسلام اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اسے ایک دینی فریضہ قرار دے کر اس میں مزید قوت پیدا کرتا ہے تاکہ اولاد کی پرورش میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتی مثال اس باب میں مکمل راہنمائی کرتی ہے۔ آپؐ کو اولاد سے بے پایاں محبت تھی۔ آپؐ کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ تشریف لاتیں تو آپؐ فرطِ محبت سے کھڑے ہو جاتے اور اپنی جگہ ان کو دیتے۔ ایک دفعہ اپنی نواسی کو عالم نزع میں دیکھا تو آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ ایک صحابیؓ پاس تھے، انھوں نے پوچھا، حضورؐ! یہ کیا؟ فرمایا، یہ خدا کا رحم ہے جو وہ بندوں کے دل میں ڈال دیتا ہے[2] ایک دفعہ ایک بدو سردار اقرع بن حابس آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے۔ آپؐ نے جناب حسنؓ کا بوسہ لیا۔ اقرع نے کہا، کیا آپؐ بچوں سے پیار کرتے ہیں؟ میرے دس بچے ہیں اور میں ایک کا منہ بھی نہیں چومتا۔ آپؐ نے جواب دیا، اگر اللہ نے تمھارے دل سے رحمت نکال لی ہے تو میں کیا کروں؟ جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں ہوتا[3] آپؐ کا ارشاد ہے کہ جو آدمی چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا اور بڑوں کی توقیر نہیں کرتا، اس کا شمار ہم میں نہیں[4] حسنینؓ کے بارے میں آپؐ کی یہ دعا ہے کہ اے اللہ یہ مجھے عزیز ہیں تو بھی انھیں عزیز جان اور جو ان سے

---

[1] بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الولد و الادب المفرد از بخاری۔
[2] ترمذی [3] بخاری کتاب الادب و ترمذی کتاب البر و الصلہ۔
[4]۔ ترمذی ابواب البر و الصلہ۔

محبت رکھتے ہیں ان سے محبت رکھ [1]

ایک صحابی رض کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میں نے آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حالتِ نماز میں دیکھا۔ آپ کی نواسی اُمامہ رض آپ کے کندھے پر تھیں آپ جس وقت رکوع اور سجدہ میں جاتے تو انھیں زمین پر بٹھا دیتے اور جب کھڑے ہوتے تو پھر کندھے پر اٹھا لیتے [2]

اسلام اولاد کی محبت پر بہت تاکید کرتا ہے لیکن ساتھ ہی اس امر کو بھی نظر انداز نہیں ہونے دیتا کہ یہ محبت دین کے تابع رہنی چاہیے۔ والدین کے لئے اولاد کی بہت اہمیت ہے مگر جیسا کہ سورۃ الکوثر سے ظاہر ہے اولاد سبھی کچھ نہیں۔ انسان کو اولاد کی محبت میں دینی تقاضوں کو نہیں بھولنا چاہیے۔ حضرتِ نوح ع کا بیٹا کافر اور نافرمان تھا۔ جب طوفان آیا تو وہ بھی اس میں گھر گیا۔ حضرتِ نوح ع نے اسے پانی میں ڈبکیاں کھاتا دیکھا تو محبت نے جوش مارا اور اس کے لئے خدا سے دعا کی۔ جواب ملا کہ تیرا اس سے تعلق نہیں۔ اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ دینی تقاضوں کو اولاد پر مقدم رکھنا چاہیے۔ جنگِ بدر میں جو قیدی پکڑے گئے ان میں آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحب زادی حضرتِ زینب رض کے شوہر ابو العاص بھی تھے جو اس وقت مشرک تھے۔ سب قیدیوں سے زرِ فدیہ طلب کیا گیا اور ابو العاص کو بھی اتنی ہی رقم پیش کرنے کا حکم ہوا۔ ایک دفعہ حضرتِ فاطمہ رض نے حضور ص سے عرض کی کہ غنیمت کے قیدیوں سے مجھے ایک کنیز عطا فرمائیے۔ آپ نے انکار فرمادیا۔

(۲) تعلیم و تربیت : اسلام نے اولاد کی تعلیم و تربیت پر بہت زور

---

[1] ترمذی ابواب المناقب [2] صحیح مسلم جلد ۲ صت۲

دیا ہے۔ اولاد کا والدین پر حق ہے کہ وہ انھیں عمدہ اور صالح تربیت دیں۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ

اے لوگو! اپنے کو اور گھر والوں کو آگ سے بچاؤ[1]

یعنی خود بھی نیکی کرو اور گھر کے افراد کو بھی نیکی سکھاؤ۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

کوئی باپ اپنے بچے کو حسن ادب سے بہتر عطیہ نہیں دے سکتا[2]

قیامت کے دن آدمی کے ساتھ سب سے پہلے جھگڑنے والے اس کے عیال ہوں گے۔ وہ اللہ تعالے سے کہیں گے کہ اے اللہ! تو اس سے ہماری داد دے۔ ہم ناواقف تھے اور اس نے ہمیں حرام کھلایا۔ ہمیں جو کچھ سکھانا فرض تھا اس نے نہ سکھایا اور ہم جاہل رہ گئے[3]

اولاد کو پرورش اور تربیت کر کے کمائی کے قابل کرنا بہت بڑی دینی اور قومی خدمت ہے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے:

اگر بچہ مسلم والدین پر خرچ کرے تو صرف بچے ہی کو نہیں بلکہ والدین کو بھی ثواب ملتا ہے[4]

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ایک تو والدین کو اس بات کا ثواب ملے گا کہ انھوں نے بچے کو نیک تربیت دی جس کے نتیجے میں وہ والدین کی خدمت سے مشرف ہو رہا ہے۔ دوسرا ثواب اس کارنامہ کا ہوگا کہ والدین نے اسے دولت کمانے کا سلیقہ سکھایا۔ گویا یہ والدین ہی کی کمائی ہے۔

---

[1] سورۂ تحریم۔ [2] ترمذی ابواب السیر۔ [3] معدجعہ کیلئے ساعت۔ باب عدم نکاح [4] کنز العمال۔

حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نیک اولاد صدقہ جاریہ ہے جب تک وہ نیکی کریں اور والدین کے لئے دعا گو ہوں والدین کی روح کو ثواب پہنچتا ہے حدیث ہے کہ بعض آدمی دیکھیں گے کہ جنت میں ان کا درجہ بلند تر ہو گیا وہ اللہ تعالیٰ سے اس کا سبب پوچھیں گے جواب ملے گا کہ تمھاری اولاد نے تمھارے لئے جو استغفار کیا یہ اس کی وجہ ہے[۱]

ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی اولاد کو جس انداز سے تعلیم و تربیت دی وہ انسانیت کے لئے ایک بہترین نمونہ ہے۔ اسی حسنِ تربیت کا فیض تھا کہ حضرتِ عائشہ رض ایسی زیرک اور ذہین و فطین ہستی نے بھی اعتراف کیا کہ جناب فاطمۃ الزہرا رض سب عورتوں سے بڑھ کر دانا ہیں۔ جناب عائشہ رض کا قول ہے کہ طرزِ کلام، اسلوب گفتگو، خضوع و خشوع، حسنِ خلق اور وقار و متانت میں ان رض سے بڑھ کر آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشابہ کوئی نہ تھا[۲] حضرت علی رض بھی آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دامنِ تربیت میں پروان چڑھے تھے۔ ان کی زندگی، عالمِ انسانیت کے لئے ہمیشہ ایک ایمان افروز درس رہے گی۔ یہی کیفیت جناب حسن رض و حسین رض کی پاکیزہ زندگیوں کی ہے۔

(۲) اولاد کے درمیان عدل :

والدین کا فرض ہے کہ اولاد کے درمیان مکمل مساوات رکھیں۔ اسلام کی نظر میں لڑکے اور لڑکی یا چھوٹے بڑے کی کوئی ظالمانہ تمیز نہیں۔ تورات اٹھا کر دیکھئے تو اس میں پہلوٹے کی ترجیح کا حکم ملے گا۔ یورپ کے جن ممالک میں تورات کا زور ہے وہاں آج تک یہ قانون ہے کہ بڑے بیٹے کو جائداد میں زیادہ

---

[۱] کنز العمال جلد ۸۔ [۲] ترمذی الادب المفرد از بخاری۔

ہے۔ اسلام اس عدم توازن کو مٹاتا ہے۔ آج تمام دنیا میں اسلام ہی ایک مذہب ہے جو لڑکی کو والدین کے ترکہ میں شریک ٹھہراتا ہے۔

ایک دفعہ ایک صحابی رضؓ نے اپنے ایک بیٹے کو غلام ہبہ کیا اور آں حضور اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آکر چاہا کہ اس معاملہ پر آپؐ کی گواہی جائے آپؐ نے پوچھا، کیا دیگر بچوں کو بھی ایک ایک غلام دیا ہے؟ عرض نہیں۔ فرمایا تو میں اس ظلم کا شاہد نہیں بننا چاہتا[۱]

ترمذی ابواب الاحکام مسلم کتاب الہبات۔ بخاری کتاب الہبہ بخاری میں الفاظ ذرسے مختلف ہیں)

حقوقِ والدین

والدین کے اولاد پر اس قدر بے کراں احسانات ہوتے ہیں کہ اولاد ان کی خدمت میں تمام زندگی بھی کھپا دے تو حق ادا نہیں ہو سکتا۔ والدین جب اپنے بچوں کے دُکھ بھرتے ہیں تو ساتھ ہی بڑی اُمنگوں سے ان کی درازی عمر کے لئے بھی دعا کرتے ہیں۔ لیکن جب والدین کا بڑھاپا اپنے جلو میں ناتوانیوں اور بیماریوں کی قطارے کرتا ہے تو بے شک اکثر اولاد ان کی خدمت کی انجام دہی کو عین سعادت سمجھتی ہے مگر کتنے بچے اور کتنی بچیاں ہیں جو صدق دل کے ساتھ ان کی لمبی عمر کے لئے دُعا گو ہوتے ہیں۔ نبی کریمؐ کا ارشاد ہے کہ

والدین کا حق کبھی نہیں چکایا جا سکتا۔ ہاں ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ والدین کسی کے غلام ہوں اور انھیں خرید کر آزاد کر دیا جائے۔[1]

حضرت عیسےٰ نے کلام کا آغاز ان الفاظ سے کیا کہ مجھے اللہ تعالےٰ نے نماز و زکوٰۃ اور والدہ سے حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔ (مریم)

والدین کی بے لوث محبت اور ان کا جانی اور مالی ایثار اس وقت سے بچّہ

---

[1] مسلم۔ کتاب العتق۔

کے لئے وقف ہوجاتا ہے جب وہ ابھی شکم مادر میں ہوتا ہے - اس کے بعد زندگی بھر جب تک والدین کے دم میں دم ہوتا ہے وہ بچہ کے آرام و آسائش اور تربیت و ترقی میں کوشاں اور سرگرداں رہتے ہیں - اولاد کی خوشی ان کی خوشی اور اولاد کا غم ان کا غم ہوتا ہے اس لئے ان کے احسانات کا اندازہ انسانی قدرت سے باہر ہے - ان احسانات کا کمترین حق یہ ہے کہ اولاد اپنا جان و مال ان کے لئے وقف کر دے -

والدین کے حقوق کا اعتراف سب مذاہب نے کیا ہے مگر یہ خصوصیت اسلام ہی کو حاصل ہے کہ جہاں محبت کے قدرتی سوتے بہت جوش زن ہوں وہاں ان کے حدِ اعتدال سے نکلنے پر بندشیں لگادی ہیں - تورات یہ کہتی ہے کہ جو شخص اپنے ماں باپ پر لعنت کرے اُس کو مار ڈالا جائے - اسلام اس افراط کی طرف تو نہیں جاتا مگر یہ ضرور کہتا ہے کہ جو آدمی اپنے باپ سے انکار کرے وہ دوزخی ہے آں حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس شخص نے کسی غیر کو اپنا باپ بنایا اور وہ جانتا ہے کہ یہ میرا باپ نہیں تو اُس پر جنّت حرام ہو گی [۱] باپ اگر بیٹے کو قتل کر ڈالے تو اسے چاہے کوئی دیگر سزا دی جائے لیکن اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا - یعنی اسے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا - کون باپ ہے جو جان بوجھ کر بیٹے کا خون گرائے گا اور اگر کوئی ایسا سنگدل ہو بھی تو شک کا فائدہ اٹھا کر قصاص سے بچ جائے گا.

والدین کے حقوق

(۱) اہمیت اور وسعت:

والدین کے حقوق بہت اہم اور وسیع ہیں -

---

[۱] ترمذی ابواب الدیات

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں کئی جگہ اپنے حق کے ساتھ والدین کے حق کا ذکر کیا ہے۔

جناب ہادیِ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز کے بعد خدمتِ والدین کا درجہ بتایا ہے اور اس کے بعد جہاد کا۔ (ریاض الصالحین)

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک شخص نے آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ میرے پاس مال ہے اور صاحب اولاد ہوں اور میرا باپ میرے مال کی حاجت رکھتا ہے۔ حضور نے فرمایا، تم بھی اپنے باپ کا مال ہو اور تمہاری متاع بھی[1]

والدین کو حق ہے کہ حسب ضرورت اولاد کے مال سے خرچ لیں۔ بعض اہلِ علم کا تو فتویٰ ہے کہ بیٹے کے مال پر باپ کا مکمل حق ہوتا ہے[2] بہرحال اس بات پر اتفاق ہے کہ والدین نادار ہوں تو اولاد پر اُن کا خرچ اٹھانا فرض ہے۔

والدین کا تعلق اور سب تعلقات پر بھاری ہے یہاں تک کہ اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ بیوی کا وجود اپنے اور والدین کے درمیان دیوار بن رہا ہو اور اصلاح کی کوئی تدبیر نہ بنتی ہو تو بعض صورتوں میں بیوی کو طلاق دینے کا حکم ہے۔ حضرتِ عمرؓ کے فرزند عبداللہ کی ایک بہت چہیتی بیوی تھی۔ حضرتِ عمرؓ اس کو اچھا نہیں جانتے تھے اس لئے بیٹے کو طلاق کا حکم دیا۔ بیٹے نے انکار کیا اور اس کا ذکر جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا۔ آپؐ نے فرمایا، اے عبداللہ اپنی بیوی کو طلاق دے دو[3]

---

[1] ابو داؤد۔ [2] ترمذی ابواب الاحکام [3] ترمذی کتاب الطلاق

والدین غیر مسلم ہوں تو جب بھی ان کے حقوق میں کمی نہیں آتی۔ ہاں جیساکہ قرآن حکیم میں ارشاد ہے امورِ دین میں ان کی متابعت نہ کی جائے[۱] ان کو اسلام کی تبلیغ ہوتی رہے۔ کیونکہ یہی ان کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

(۲) والدہ کا مقام:

ایک دفعہ ایک صحابی۔[۲] آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور پوچھا کہ میری بھلائی کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ فرمایا، تمہاری ماں۔ سائل نے پوچھا، پھر؟ حضور نے فرمایا، تمہاری ماں۔ اس نے کہا، اس کے بعد؟ فرمایا، تمہاری ماں۔ اس نے پوچھا، اس کے بعد؟ فرمایا تمہارا باپ اور اس کے بعد درجہ بدرجہ قرابت دار[۳]

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ماں کے حقوق باپ کے حقوق سے فزوں تر ہیں کیونکہ اولاد کی پرورش میں جو جانفشانی پیش آتی ہے اس کا اکثر حصہ والدہ کے حصہ میں آتا ہے۔

(۳) محبت و احترام

والدین بہت محبت اور احترام کے مستحق ہیں۔ اس بارہ میں سورۂ بنی اسرائیل[۴] میں جو ہدایات آئی ہیں وہ مختصراً یہ ہیں:

والدین کے سامنے رحمت آمیز عجز اختیار کرو۔

ان سے مؤدبانہ گفتگو کرو۔

انھیں مت ڈانٹو۔

ان کے بڑھاپے میں انھیں حرفِ افسوس تک نہ کہو۔

---

۱ بخاری کتاب الہبہ ۲ ترمذی ابواب البر والصلہ مسلم۔ بخاری۔ الادب ۳ رکوع ۳۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی والدہ ماجدہ آپؐ کے بچپن میں وفات پا گئی تھیں۔ آپؐ کی کنیز اُمّ ایمن رضؓ نے آپؐ کی مادرانہ خدمت کی۔ حضورؐ جب انھیں دیکھتے تو اُمّی کہہ کر پکارتے اور فرماتے کہ یہ میرے گھرانے کا بقیہ ہیں۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ میری والدہ کے بعد اُمّ ایمن رضؓ ہی میری والدہ ہیں۔ ایک بار حضرتِ ایمن رضؓ نے جناب رسالت مآب کو دیکھا کہ آپؐ پانی پی رہے ہیں۔ انھوں نے آنحضورؐ سے کہا کہ مجھے پانی پلائیے۔ حضرتِ عائشہ رضؓ بولیں، کیا تم حضورؐ کو ایسا کہتی ہو۔ اُمّ ایمن رضؓ نے کہا، تم نے مجھ سے بڑھ کر حضورؐ کی خدمت نہیں کی۔ حضورؐ نے فرمایا، یہ سچ کہتی ہیں۔ آپؐ پانی لائے اور اُمّ ایمن رضؓ کو پلایا۔[1]

ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضاعی والدہ حضرتِ حلیمہ تشریف لائیں۔ حضورؐ نے اُن کے بیٹھنے کو اپنی چادر بچھا دی۔

حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص اپنے والدین پر شفقت کی نظر ڈالتا ہے اس کے لئے ایک مقبول حج لکھا جاتا ہے۔

والدین کے احترام کے ضمن میں یہ بھی لازم ہے کہ آدمی دنیا میں ایسا طرزِ عمل اختیار کرے کہ اس کے والدین کا اہلِ دنیا احترام کریں۔ اس لئے اُسے چاہیے کہ نیکوکار ہو، دوسروں کے والدین کی تعظیم کرے اور ان کی گستاخی نہ کرے۔ ایک دن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ والدین کو گالی دینا گناہِ کبیرہ ہے۔ صحابہؓ نے پوچھا، جناب! کیا کوئی شخص اپنے والدین کو بھی گالی دیتا ہے؟ فرمایا، جب وہ کسی دوسرے شخص کے باپ کو گالی دے

---

[1] البدایہ والنہایہ جلد ص ۲۱۹ و ۲۲۶۔

اور وہ جواب میں اس کے باپ کو گالی دے یہ کسی کی ماں کو گالی دے اور وہ بدلہ میں اس کی ماں کو گالی دے۔[1]

(۴) تعمیلِ حکم :

سوائے اس صورت کے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی ہوتی ہو والدین کے حکم کی تعمیل میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم ہے کہ اگر تمہارے والدین تمہیں اہل اور دنیا سے نکل جانے کا حکم دیں تو جب بھی ان کی نافرمانی نہ کرو۔[2]

(۵) خدمت :

بعض حالات میں والدین کی خدمت جہاد سے بھی بالاتر ہوتی ہے ۔ ایک شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور عرض کی کہ میں جہاد پر آپؐ کی بیعت کرتا ہوں ۔ حضورؐ نے پوچھا ، کیا تمہارے والدین میں سے کوئی زندہ ہے ؟ اس نے کہا ، ہاں ! دونوں ۔ فرمایا تو واپس جاؤ اور ان کی خدمت میں جدوجہد کرو۔[3]

ایک بار ہادیِ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص صبح دم سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں والدین کا مطیع ہوا اس کے سامنے جنت کے دو دروازے کشادہ ہو جاتے ہیں اور (والدین میں سے) فقط ایک زندہ ہو تو ایک دروازہ کھلتا ہے اور جس شخص نے اس حال میں آنکھ کھولی کہ والدین کے حق میں اللہ تعالیٰ کا نافرمان ہے تو اس پر دوزخ کے دو دروازے وا ہو گئے ا

---

[1] ترمذی کتاب البر والصلہ ۔ بخاری ابن ماجہ

[2] البدایہ والنہایہ جلد ۵ صفحہ ۳۲۵ ۔ [3] ریاض الصالحین بحوالہ صحیحین ۔

اگر (والدین میں سے) فقط ایک زندہ ہو تو ایک دروازہ۔ اگر ان میں سے ایک بھی ان پر ناراض ہو تو اللہ تعالےٰ اس سے راضی نہیں ہو گا۔ آپؐ سے پوچھا گیا کہ اگر وہ اس پر ظلم کریں تو بھی؟ فرمایا، ہاں۔ چاہے وہ ظلم کریں[1]

آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ وہ شخص بڑا ہے جس کو بوڑھے والدین نے جنت میں داخل نہیں کیا۔[2] مراد یہ ہے کہ اسے ان کی خدمت کا موقع ملا اور اس نے اس موقع سے کام نہ لیا اور جنت کھو دی۔ ایک دفعہ آپؐ نے فرمایا کہ خوار ہوا، خوار ہوا، خوار ہوا وہ شخص جس نے ماں باپ دونوں کا یا ان میں سے ایک کا بڑھاپا دیکھا اور جنت میں داخل نہ ہوا۔[3] اس سے مراد یہ ہے کہ ان کی خدمت نہ کی اور دوزخ کا حق دار ہوا۔[4]

ایک شخص نے آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ ماں باپ کا اولاد پر کیا حق ہے؟ آپؐ نے فرمایا، وہ تمہارے جنت و دوزخ ہیں[5] مطلب یہ کہ اگر تم ان کی رضا حاصل کر لو تو جنت میں جاؤ گے اور اگر رضا سے محروم رہ گئے تو دوزخ میں داخل ہو گے۔ آپؐ کا قول ہے کہ خدا کی رضا والد کی رضا میں مضمر ہے۔ اور خدا کی ناراضی والد کی ناراضی میں پوشیدہ ہے۔[6]

اللہ تعالےٰ کے ہاں والدین کی خدمت کو جو مقبولیت حاصل ہے اس کا اندازہ دلانے کے لئے آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دفعہ یہ حکایت بیان کی کہ تین شخص سفر پر گئے۔ رات کو ایک غار میں بسیرا کیا۔ ایک پتھر لڑھکا اور اس نے غار کا دہانہ بند کر دیا۔ اس کا ہٹانا محال تھا۔ مسافر

---

[1] ادب المفرد از بخاری [2] ترمذی۔ الواب البر [illegible]
[3] ریاض الصالحین بحوالہ مسلم۔ [4] ابن ماجہ [5] ترمذی [illegible]

نے سوچا کہ اس کے دفعیہ کا ایک ہی چارہ ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنے نیک ترین عمل کے واسطے سے خدا کے حضور التجا کریں۔ ان میں سے ایک نے کہا، اے خداوندا میرے والدین عمر رسیدہ تھے۔ میں ان سے پہلے نہ اپنے بیوی بچوں کو اور نہ لونڈی غلاموں کو خوراک دیتا تھا۔ ایک دن مجھے کسی سبب سے گھر آنے میں تاخیر ہو گئی۔ واپس آیا تو دیکھا کہ ماں باپ سو چکے ہیں۔ میں نے دودھ دوہا۔ مجھے گوارا نہ ہوا کہ ان سے قبل اپنے گھر والوں یا لونڈی غلاموں کو کھلاؤں۔ میں دودھ کا پیالہ ہاتھ میں لے کر ان کے سرہانے کھڑا ہو گیا کہ وہ جاگیں تو پئیں۔ اسی انتظار میں رات گزر گئی۔ پو پھٹی تو ان کی آنکھ کھلی اور انھوں نے دودھ پیا۔ اے اللہ اگر میں نے یہ کام تیری رضا کے لئے کیا تھا تو اس پتھر کی مصیبت کو دور کر دے۔ پتھر کچھ سرک گیا (اس کے بعد مزید بیان ہے کہ کس طرح باقی دو کی دعاؤں سے پتھر ہٹ گیا)[1]

والدین کی نافرمانی کو حدیث میں کبیرہ گناہوں میں شمار کیا گیا ہے[2] اور یہ بتایا گیا ہے کہ والدین کی نافرمانی کی عقوبت انسان کو اس زندگی ہی میں گھیر لیتی ہے[3]

(۶) والدین کی ناراضی سے بچنا:

انسان کو والدین کی ناراضی سے بچنا چاہیے۔ آں حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا

---

[1] بخاری کتاب الاجارہ [2] ترمذی ابواب البر والصلہ۔ بخاری کتاب الشہادت کتاب الادب [3] بیہقی کتاب الایمان۔

ارشاد ہے کہ تین دُعائیں بلاشُبہ قبول ہوتی ہیں۔ مظلوم کی دُعا، مسافر کی دُعا۔ اور والد کی دُعا بیٹے پر [۱] یہ حدیث بتاتی ہے کہ والدین کی دعا ہو یا بد دُعا وہ اپنا اثر ضرور دکھاتی ہے۔

۱۷) والدین کے اقارب سے سلوک:

جناب ہادیِ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے والدین ہی کی محبت اور خدمت گزاری پر تاکید نہیں کی بلکہ ان کے اقارب کی محبت اور خدمت گزاری کی بھی تاکید فرمائی ہے۔ ایک دفعہ آپؐ نے حضرتِ عباس رضؓ کے بارہ میں فرمایا کہ جس نے میرے چچا کو ایذاء دی اس نے مجھے ایذاء دی۔ چچا باپ کے مثل ہوتا ہے [۲] ایک بار آپؐ نے حضرتِ عباس رضؓ کی زکوٰۃ اپنے پاس سے دی اور فرمایا کہ چچا بھی تو باپ کے مثل ہوتا ہے [۳]

ایک دن ایک شخص آپؐ کے پاس حاضر ہوا اور عرض کی کہ مجھ سے ایک بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے، کیا اس سے توبہ کی کوئی صورت ہے؟ آپؐ نے پوچھا، کیا تمھاری ماں زندہ ہے؟ بولا نہیں۔ پھر پوچھا، کیا تمھاری خالہ ہے؟ جواب دیا، ہاں۔ آپؐ نے فرمایا، تو اس سے نیکی کرو [۴]

---

[۱] ترمذی ابواب الدعوات۔

[۲] ترمذی ابواب الدعوات۔

[۳] مسلم کتاب الزکوٰۃ باب فی تقدیم الزکاۃ [۴] ترمذی ابواب البر والصلہ۔

(۸) والد کے دوستوں اور والدہ کی سہیلیوں سے سلوک :

والد کے دوستوں کو چچا کے برابر اور والدہ کی سہیلیوں کو خالہ کے برابر سمجھنا چاہیے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بہترین نیکی یہ ہے کہ والد کے تعلقات کو زندہ رکھا جائے۔[۱]

(۹) والدین کی موت کے بعد :

والدین کی خدمت گزاری کا حق ان کی زندگی کے ساتھ ختم نہیں ہوتا بلکہ بعد میں بھی جاری رہتا ہے۔

اولاد کی نیکی کا ثواب والدین کو بھی پہنچتا ہے اس لئے والدین کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ انسان نیک ہو کر رہے تاکہ جنت میں اس کے والدین کے درجے بڑھیں۔

ایک شخص آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور عرض کی کہ کیا والدین کا حق ان کی وفات کے بعد بھی ادا کرنے کو رہ جاتا ہے آپؐ نے فرمایا، ہاں۔ ان کے لئے نماز پڑھ اور استغفار کر۔ ان کے وعدوں کو پورا کر، ان کے قرابت داروں سے بھلائی کر اور ان کے دوستوں کی تعظیم کر۔[۲]

---

[۱] ریاض الصالحین باب فضل بر اصدقاء
[۲] جمع الفوائد جلد ۲۔

ثمرات

جو شخص صدق دل سے والدین کی خدمت کرتا ہے اس کی دنیا اور آخرت دونوں سنور جاتے ہیں۔ دنیا میں وہ کامیاب اور سرخرو ہوتا ہے اور آخرت میں جنت کا حق دار ہو جاتا ہے۔ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ باپ جنت کا درمیانہ دروازہ ہے۔ تو چاہے تو اسے ضائع کر دے اور چاہے تو محفوظ رکھے[1]

---

[1] ریاض الصالحین۔

زوجین

مفہوم زوج کے معنی ہیں جوڑ۔ مذکر و مؤنث یعنی میاں بیوی ہر دو کے لئے مشتعل ہے۔ اس کی جمع ازواج ہے۔ زوجین کے معنی ہیں دو زوج یعنی میاں بیوی۔

رشتۂ زوجیت کی اہمیت والدین اور اولاد کے بعد قوی ترین رشتہ زوجین کا ہے۔ ویسے ایک لحاظ سے اس رشتہ کو سب رشتوں پر تقدم حاصل ہے کیونکہ یہ رشتہ باقی رشتوں کی اصل ہے۔

دیکھا جائے تو زوجین کا رشتہ ساری کائنات کی روح رواں ہے۔ کائنات کا تمام کارخانہ جوڑوں کی بنیاد پر چل رہا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَمِنْ کُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ [۱]

(اللہ ہر چیز کے بنائے ہم نے جوڑے)

نکاح اہلی زندگی کا سرآغاز ہے۔ اسی سے انسانی نوع کا سلسلہ چلتا ہے۔ یہ وہ عنوان ہے جس کے بغیر اولادِ آدم کی بدنی اور روحانی تسکین کی داستان

---

[۱] الذاریات

پریشان ہو کر رہ جاتی۔ اللہ تعالٰی نے سورۂ بقرہ میں ازواج کو اپنی رحمت کی نشانی بتایا ہے:

وَمِنْ اٰیٰتِہٖۤ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا۔

(اور یہ اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہیں میں سے ازواج کو پیدا کیا)

اسی سورت میں ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

ھُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّھُنَّ۔

(تمہاری بیویاں تمہارے لئے پوشاک ہیں اور تم ان کے لئے)

پوشاک کا لفظ یہاں کئی معنی رکھتا ہے مثلاً:

(۱) جس طرح بدن اور پوشاک کا بہت قریبی تعلق ہے اس طرح میاں بیوی کا بھی قریبی تعلق ہے[۱]

(۲) جس طرح انسان کا پوشاک کے بغیر گزارا نہیں، اس طرح میاں بیوی کا بھی ایک دوسرے کے بغیر گزارا مشکل ہے۔

(۳) جس طرح پوشاک موسم کی سختی کو روکتی ہے اسی طرح میاں بیوی بھی مصائب کے مقابلہ میں ایک دوسرے کی ڈھال ہیں۔

(۴) پوشاک عزت و آبرو کی محافظ ہے۔ عریانی اور بے حیائی سے بچاتی ہے۔ میاں بیوی بھی ایک دوسرے کی عزت و آبرو کے محافظ ہیں۔ ایک دوسرے کو عریانی اور بے حیائی سے بچاتے ہیں اور لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل نہیں ہونے دیتے۔

---

[۱] تفسیر عثمانی۔

(۵) صاف اور بدن زیب پوشاک سے انسان کو فرحت حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح نیک اور متدین میاں بیوی ہوں تو ان کو ایک دوسرے سے فرحت اور تسکین ملتی ہے۔[1]

سورۃ الروم میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے زوجین کی تخلیق اس لئے کی کہ ایک دوسرے سے سکون پائیں اور اللہ تعالیٰ ان میں محبت اور رحمت پیدا کر دی۔

میاں بیوی کو ایک دوسرے سے زندگی بھر نباہ کرنے میں کوشاں رہنا چاہیے۔ اس نباہ میں محبت اور جاں نثاری ہو۔ اچانک ایک دوسرے سے بھڑک کر تعلقات قطع کر لینا درست نہیں۔ اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے کہ عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک رکھو۔ اگر تم نے انھیں پسند نہیں کیا ہے تو ہو سکتا ہے کہ تم ایک شے کو ناپسند کرو اور اللہ تعالےٰ نے اس میں خیر کثیر رکھ دے۔[2] اس آیت میں ناپسندیدہ عورتوں کے ساتھ بھی صبر و تحمل اور فراخ دلی کے ساتھ زندگی گزارنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

میاں بیوی ایک دوسرے کی ناگواریوں کو سہیں تو ان کے لئے بڑا درجہ ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص اپنی بیوی کی سخت کلامی پر صبر کرے اس کو حضرت ایوب علیہ السلام کا سا ثواب ملے گا اور جو عورت اپنے شوہر کی بدخوئی پر تحمل کرے اسے حضرت آسیہ[3] زوجۂ فرعون

---

[1] لباس کے مذکورۃ الذکر چار فوائد کا ذکر سورۂ اعراف آیت ۲۶۰ میں ہے۔

[2] پارہ ۴ رکوع ۱۴

[3] حضرت آسیہ اگرچہ فرعون کی بیوی تھیں لیکن مومن تھیں۔

کا سا جوڑ ملے گا۔[1]

زوجین کے مراتب

اللہ تعالیٰ نے احترام کے لحاظ سے مرد اور عورت دونوں کا درجہ برابر رکھا ہے۔ ان کو ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کا حق نہیں۔ نہ خاوند کو اس بات کی اجازت ہے کہ بیوی کو بیٹھے بٹھائے پیٹنا شروع کر دے اور نہ بیوی کو اس پر ہاتھ اٹھانے کی اجازت ہے۔ دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کا احترام ہونا چاہیے۔

عورت اور مرد کی مساوات احترام انسانیت کے نقطۂ نظر سے ہے۔ انتظامی لحاظ سے مساوات ناممکن ہے۔ گھر کا سربراہ ان دونوں میں سے فقط ایک ہی ہو سکتا ہے ورنہ عین ممکن ہے کہ گھر فتنہ و فساد کا اکھاڑہ بن جائے۔ اللہ تعالیٰ نے انتظامی امور کی سربراہی مرد کو دی ہے۔ قرآن حکیم میں بتایا گیا ہے کہ مرد عورتوں پر قوام (نظام قائم کرنے والے یعنی سربراہ) ہیں سورۃ بقرہ میں ارشاد ہے:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۗ

(عورتوں کا بھی حق ہے جیسا کہ مردوں کو حق ہے اور مردوں کو عورتوں پر فوقیت حاصل ہے)

اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ زمام کار اگرچہ مرد کے ہاتھ میں ہے۔

---

[1] ترجمہ کیمیائے سعادت باب دوم نکاح

لیکن اسے عورت کی حق تلفی کی اجازت نہیں۔

عورت صنفِ نازک ہے۔ جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے آبگینہ سے تشبیہ دی ہے[1] اس لئے اس سے جابرانہ سلوک کرنا درست نہیں۔

زوجین میں خاوند کا درجہ بلند ہے اور والدین میں ماں کا درجہ بالا ہے۔ اس لئے احترام اور شرف کے نقطۂ نظر سے میاں بیوی میں برتری کا پہلو ڈھونڈنا بے کار ہے۔

حقوق و فرائض

حدیث میں زن و شوہر کے فرائض کی مختصر تعیین یوں آئی ہے کہ:

خاوند بیوی کا محافظ اور نگہبان ہے۔ اس بارے میں اس سے پرسش ہوگی۔ بیوی اپنے خاوند کے گھر کی نگران ہے اور اس امر میں وہ جواب دہ ہوگی[2]

مرد کا کام خانہ داری کا ساز و برگ مہیا کرنا ہے۔ گھر کے سربراہ کی حیثیت میں اس کے کندھے پر بہت گراں بار ذمہ داریاں ہیں۔ اس کو کمائی کا سارا بوجھ خود اٹھانا چاہیے۔ عورت کا کام یہ ہے کہ وہ اس کمائی کو خانگی ضرورت میں ٹھکانے سے خرچ کرے اور بال بچوں کی پرورش کرے۔

میاں بیوی دونوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ایک دوسرے سے مکمل تعاون کریں۔ ہر لمحہ کے مونس و ہمدرد اور جاں نثار ہوں۔ گھر کے راز محفوظ رکھیں اور ایک دوسرے کی آبرو کے پاسبان ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا

---

[1] بخاری کتاب الادب

[2] بخاری باب

ارشاد ہے کہ قیامت کے دن بدترین شخص وہ ہوگا۔ جو بیوی کا شریک راز ہوا اور اُس نے بیوی کا راز کھول دیا[1] زن و شوہر کا حسن سلوک اسلام کے نزدیک کس قدر لابدی ہے' اس کا اندازہ اس امر سے ہوگا کہ طرفین صلح و صلاح کی خاطر اگر بے ضرر جھوٹ بھی بول دیں تو اسلام اسے روا جانتا ہے[2]

اب ہم زوجین کے حقوق کو مختصر طور سے الگ الگ دیکھتے ہیں:

خاوند کے حقوق:

خاوند کے حقوق کی ہمہ گیری جناب سرورِ انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان سے بخوبی روشن ہو جاتی ہے کہ اگر غیر اللہ کے آگے سجدہ جائز ہوتا تو میں حکم دیتا کہ بیوی اپنے خاوند کو سجدہ کرے[3] آپؐ کا ارشاد ہے کہ اگر بیوی اس عالم میں مرے کہ اس کا خاوند اس سے خوشنود ہو تو وہ جنت میں جائے گی[4] جب کوئی بیوی اپنے خاوند کو ایذا پہنچاتی ہے تو خاوند کی شریک جنت ہونے والی حور کہتی ہے، تجھے موت آئے اسے دکھ نہ دے یہ تو ہمارا مہمان ہے۔ عین ممکن ہے کہ تم سے جُدا ہو کر جلد ہمارے پاس آجائے[5]

خاوند کی عزت و ناموس بہت حد تک بیوی کی مٹھی میں ہوتی ہے۔ بیوی کو لازم ہے کہ شوہر کی غیبت کی حفاظت کرے۔ اس کا دل خاوند کی محبت سے معمور ہونا چاہیے۔ اسلام میں ویسے فقط تین دن کے سوگ کی اجازت ہے مگر خاوند کے انتقال پر بیوی کا سوگ چار ماہ اور دس دن ہے[6]

---

[1] مسلم کتاب الطلاق باب تحریم افشاء سر المرأۃ [2] ریاض الصالحین [3] ترمذی باب الرضاع [4] ایضاً [5] ایضاً [6] مسلم باب وجوب الاحداد فی عدۃ الوفاۃ، بخاری کتاب الجنائز۔

اسلام بیوی سے کامل وفاداری کا تقاضا کرتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ عورت شوہر کی اجازت کے بغیر (نفلی) روزہ بھی نہیں رکھ سکتی اور نہ اسے یہ حق پہنچتا ہے کہ خاوند کے بغیر اجازت کسی کو اس کے گھر میں آنے دے۔[1]

بیوی کے حقوق:

اسلام سے قبل عورت کے حقوق جس بے دردی سے پامال ہو رہے تھے آج اس کا تصور بھی مشکل ہے۔ میاں کی وراثت سے سوائے داغِ حسرت کے اور کچھ میسر نہیں آتا تھا۔ آئے دن کی زندگی میں اس کا مقام غلامانہ تھا حد یہ تھی کہ جوئے کے داؤ پر چڑھادی جاتی تھی۔ باپ کے مرنے کے بعد بیٹا اپنی سوتیلی ماؤں کو موروثی مال جان کر زوجیت میں لے لیتا تھا۔ اسلام نے اس ظلم کو مٹایا اور عورت کو وہ حقوق عطا کیے جو آج بھی کسی دیگر مذہب میں اسے نصیب نہیں۔ سالارِ انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صنفِ نازک کے حقوق کا اس قدر خیال تھا کہ حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا کہ عورتوں کے بارے میں خدا کا خوف رکھو کیونکہ تم نے انھیں امانِ الٰہی کی شرط سے عقد میں لیا ہے۔[2]

آپ کا اعلان ہے: اِخِیَارُکُمْ خِیَارُکُمْ لِنِسَائِھِمْ[3]

(تم میں سے بہترین وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے حق میں بہترین ہیں)

ارشادِ نبوی ہے کہ میں تمھیں دو ضعیفوں یعنی یتیم اور بیوی کے حقوق کے بارے میں احتیاط دلاتا ہوں۔[4] آپ نے فرمایا ہے کہ عورت کی پیدائش پسلی سے

---

[1] ریاض الصالحین باب حق الزوج علی المرأۃ بحوالہ صحیحین۔
[2] مسلم کتاب الحج باب حجۃ النبی [3] ترمذی باب الرضاع
[4] ریاض الصالحین باب فضل نفقۃ المسلمین۔ بحوالہ نسائی۔

ہوئی ہے۔ تم اسے سیدھا نہیں کر سکتے۔ (ہاں) اگر چاہو تو اس کی کجی کے باوصف اس سے فائدہ اُٹھا سکتے ہو اور اگر تم اسے سیدھا کرنا چاہو تو اسے توڑ دو گے[1] مراد یہ ہے کہ عورت کے معاملہ میں کامل احتیاط اور صبر و حوصلہ سے کام لو اگر جبر سے اس کا مزاج بدلنا چاہو گے تو نوبت طلاق تک پہنچ جائے گی۔ اس ضمن میں آپ کا ایک اور قول یہ ہے کہ مومن (خاوند) کو مومنہ (بیوی) سے بغض نہیں رکھنا چاہیے۔ اگر اس کی ایک خو خاوند کو ناپسند ہے تو دوسری پسند بھی ہو گی[2]

ایک صحابی رضؓ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ ایک عورت کا حق شوہر پر کیا ہے۔ فرمایا، خود بھی کھاؤ اور اسے بھی کھلاؤ، خود پہنو تو اسے بھی لباس دو۔ اس کے چہرے پہ نہ مارو، اس کی بُرائی نہ مانگو اور نہ حدودِ خانہ کے سوا اس سے علیحدگی اختیار کرو[3] (یعنی جب بر سبیلِ سزا عارضی طور پہ علیحدہ کرنا ہو تو فقط گھر کی چار دیواری میں جُدا کرو)

گھر کے اخراجات کا تمام بوجھ مرد پر ہے۔ بیوی کو حق حاصل ہے کہ خاوند کا مال اپنے جائز اخراجات میں اٹھائے۔ خاوند بہت تنگی کرے تو بقدرِ ضرورت چوری بھی کر سکتی ہے[4] اور اگر خاوند اس پر خرچ کے سب دروازے بند کر دے تو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتی ہے جہاں سے اس کو نان و نفقہ — یعنی رہنے سہنے اور کھانے پینے کے اخراجات — کی ڈگری ملے گی۔ اخراجات کے عدم ادا کی بناء پر اگر بیوی طلاق کا مطالبہ کرے تو عدالت اس پر غور کرے گی۔

---

[1] مسلم کتاب النکاح باب الوصیۃ بالنساء۔ [2] مسلم کتاب النکاح باب الوصیۃ بالنساء۔

[3] ریاض الصالحین باب الوصیۃ بالنساء بحوالہ ابوداؤد۔

[4] بخاری کتاب البیوع۔

طلاق کی صورت میں خاوند کو بیوی کا مہر ادا کرنا ہوگا۔ اگر بیوی معاف کر دے تو اور بات ہے۔

یاد رہے کہ بیوی کے مال پر خاوند کا کوئی حق نہیں۔ اس کے مرنے کے بعد وارث ہو سکتا ہے۔ ہاں بیوی اپنی خوشی سے صدقہ کے طور سے اس پر خرچ کرے تو اس کی مرضی ہے[۱]

اگر کوئی شیر خوار بچہ ہو اور طلاق کے بعد ماں اس کو دودھ پلائے تو اس کا معاوضہ بچے کا باپ اسے ادا کرے گا۔ ورنہ ماں پر رضاعت کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی[۲]

خاوند کی وفات پر بیوی کو اس کی وراثت کا معین حصہ ملتا ہے یعنی اولاد ہو تو آٹھواں ورنہ چوتھا حصہ۔

حریم نبوی کے جو واقعات ہم تک پہنچے ہیں وہ زن و شوہر کے باہمی تعلقات کے بارے میں اکمل و احسن نمونہ ہیں۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب حضرت خدیجہ رضؓ سے شادی کی تو آپ کی عمر صرف پچیس برس تھی اور جناب خدیجہ رضؓ کی چالیس برس۔ اس کے باوجود حضرت خدیجہ رضؓ کے ساتھ ان کی زندگی بھر آپ کے تعلقات قابل رشک طور سے خوشگوار رہے۔ ان کی وفات کے بعد حضرت خدیجہ رضؓ کو یاد کرتے تو بعض دفعہ آبدیدہ ہو جاتے چنانچہ حضرت عائشہ رضؓ کا ارشاد ہے کہ مجھے کسی عورت پر کبھی ایسا رشک نہیں آیا جیسا جناب خدیجہ رضؓ پر حالانکہ مجھے ان کا

---

[۱] مسلم کتاب النکاح باب الوصیۃ بالنساء
[۲] البقرہ۔ ۲۳۳۔

دیدار بھی نصیب نہیں ہوا[1] حضورؐ اُن کی سہیلیوں کی بہت قدر کرتے تھے جب کبھی بکری ذبح کرتے تو ان کے گھروں میں بھجواتے تھے[2] بعد میں آپؐ کے نکاح میں تقریباً نو ازواج رہیں۔ تاہم عدل و مساوات کے لحاظ سے آپؐ کا گھر ایک جنت تھا۔ گھر کی گزران بہت سادہ تھی۔ بارہا فاقے گزر جاتے تھے مگر ہر سختی میں سب برابر کے شریک تھے۔ اس بات کی ایک مثال بھی نہیں ملتی کہ آپؐ نے کسی بیوی پر سختی کی ہو، تھپڑ مارنے یا پیٹنے کا تو گمان بھی نہیں ہو سکتا۔

ایک دن حضرتِ ابوبکرؓ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے۔ دروازے پر پہنچے تو سُنا کہ حضرتِ عائشہؓ حضورؐ کے ساتھ بلند آواز سے باتیں کر رہی ہیں۔ اجازت لے کر گھر میں داخل ہوئے اور حضرتِ عائشہؓ سے کہا۔ کیا تم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے چلّا کر بولتی تھیں؟ ہاتھ اٹھا کر تھپڑ مارنا چاہا۔ آپؐ بیچ میں آگئے اور حضرتِ عائشہؓ کو بچا لیا۔ حضرتِ ابوبکرؓ غصّے سے بھرے ہوئے باہر چلے گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرتِ عائشہؓ سے فرمایا، دیکھا میں نے تمھیں اس آدمی سے کیسے بچا لیا[3]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ازواج کی اس قسم کی نازک مزاجیاں خندہ جبینی سے برداشت کرتے تھے۔ لیکن کیا مجال کہ دین کے معاملہ میں ان کی خاطر سرِ مُو تجاوز کر جائیں۔ جب سارا عرب زیرِ نگیں آگیا تو اُمہات المومنین رضی نے آپؐ سے تقاضا کیا کہ اب اخراجات میں کشائش عطا ہونی چاہیے۔ آپؐ نے انکار فرما کر کہا

---

[1] ریاض الصالحین باب فضل برّ صدقاء الوالدین ..... بحوالہ صحیحین بخاری مناقب اصحاب الرسول صلعم [2] ریاض الصالحین باب فضل برّ اصدقاء الوالدین... بحوالہ صحیحین [3] جمع الفوائد باب الزوج علی الزوجہ۔

ملت کے دیگر افراد پر تمھیں ترجیح نہیں دے سکتا۔ جیسی زندگی سخت کوشی کی پہلے تھی اب بھی رہے گی۔ بات بڑھی اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کئی روز تک گھر میں ان سے علیحدہ ہو کر رہے۔ بالآخر وحی نازل ہوئی جس کے حکم کے بموجب آپؐ نے ازواج کو اختیار دے دیا کہ چاہیں تو سابقہ گزران قبول کریں ورنہ طلاق لے کر جدا ہو جائیں۔ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن یہ نوبت دیکھ کر ہار مان گئیں اور حسب سابق قناعت پر رضامند ہو بیٹھیں ۔

نظامِ تعلیم

مسجد و مکتب

اسلامی نظامِ تعلیم

علم کا حصول اسلام میں واجب ہے ۔ جو آدمی بنیادی اور ضروری مسائل
اگاہی حاصل نہیں کرتا وہ بہت بڑی کوتاہی کا مرتکب ہوتا ہے ۔ اگر اس سے
ی میں کوئی جرم سرزد ہو جائے تو اسے عذر پیش کرنے کا حق نہیں کہ مجھ سے یہ
بے خبری میں ہوا ہے ۔

اسلام نے علم کی تحصیل پر لفظی تاکید کر کے اور اسے بہت بڑی فضیلت
ردے کر یونہی نہیں چھوڑ دیا بلکہ اس کے لئے ایک عملی نظام وضع کیا ہے
ظام قرآنِ حکیم کے نزول کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا قرآنِ حکیم ابتدا ہی سے
اب کی صورت میں لکھا اور پڑھا گیا۔

اسلام سے قبل عرب کے لوگوں نے کتاب کی صورت بھی شاذ و نادر ہی دیکھی
ی لیکن قرآنِ حکیم کے نزول نے ہر مسلمان کو خواندگی سکھا دی ۔ قرآنِ حکیم کی تلاوت
ں اس قدر فضیلت ہے کہ یہ ملتِ اسلامیہ کا شعار یعنی امتیازی علامت قرار
ئی ۔ آج تک دیہات میں بھی یہ حال ہے کہ جو بالغ مرد یا عورت قرآن شریف
پڑھ سکے اسے حرماں نصیب سمجھا جاتا ہے ۔

ایک وقت وہ تھا کہ مکہ کے بھرے پرے شہر میں کل سترہ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے
تھے اور پھر ایک وقت وہ آیا کہ عورتوں نے بھی قرآنِ حکیم لکھنا اور پڑھنا
شروع کیا اور لونڈیاں اور غلام بھی صاحبِ قلم ہو گئے ۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
جب ہجرت کے سفر پر روانہ ہوئے تو ایک کافر سُراقہ بن جعشم تعاقب

میں آیا لیکن پھر نادم ہو کر امان کا طالب ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ حضرت ابو بکرؓ کے علاوہ ان کے آزاد کردہ غلام عامر بن فہیرہ بھی تھے۔ آپؐ نے عامرؓ کو حکم دیا اور انھوں نے امان نامہ لکھا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس سفر میں بھی قلم و دوات کا سامان ساتھ تھا کیوں نہ ہو جب کہ قرآن حکیم کی پہلی وحی ہی میں قلم کی تعریف نازل ہوئی۔

بدر کی جنگ میں قریش کے بعض اشخاص اسیر ہوئے۔ ان میں سے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے ان سے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دو تو تم آزاد ہو۔ آپؐ نے مسجد النبی میں ایک مکتب قائم کیا جس کو صُفّہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مدینہ میں کئی مسجدیں تھیں جن میں بچوں کو تعلیم دی جاتی تھی۔ نتیجہ یہ کہ مسلمانوں میں شاید ہی کوئی آدمی ہو جو لکھنا نہیں تو کم از کم پڑھنا نہ جانتا تھا۔ یہ ایک ایسا علمی کارنامہ ہے کہ دنیا اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتی۔ قرآن حکیم کی تلاوت کے بدولت ہر مسلمان نے لازماً تعلیم حاصل کر لی جو شاید کروڑوں روپیہ کی لاگت سے بھی حاصل نہ ہو سکتی۔

آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مبارک میں مرد تو مرد عورتیں بھی لکھ پڑھ لیتی تھیں۔ بعض صحابیات نے قرآن حکیم کے علاوہ حدیث کی کتابیں بھی قلمبند کر لیں۔

علم خاندانی میراث نہیں

اسلام علم کی متاع کو کسی خاص گروہ، طبقہ یا خاندان کے لئے مختص نہیں کرتا۔ ہر شخص اپنی اہلیت اور ظرف کے بموجب یہ سرمایہ اکٹھا کر سکتا ہے۔ اسلام میں نہ تو شودروں کی طرح کوئی ایسا طبقہ ناپاک قرار دیا گیا ہے

علم کے قریب ہی نہ جائے اور نہ برہمنوں کی طرح کوئی ایسا خاندان نامزد کیا گیا ہے جو علم کے کسی شعبے کا واحد اجارہ دار ہو۔

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دیا جائے۔ جب یہ نعرہ بلند کیا جاتا ہے کہ اسلام میں برہمنیت نہیں اور علم دین کو کسی طبقہ میں محدود نہیں کیا جا سکتا تو بعض اصحاب اسے غلط معنی پہناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ علماء کی جماعت کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ ان اصحاب کی غلط فہمی ہے۔ برہمنیت کے عدم وجوہ سے مراد یہ ہے کہ علم کوئی موروثی یا خاندانی چیز نہیں۔ اس کا یہ مدعا ہرگز نہیں کہ کسی فن میں اس کے عالم یا ماہر کو سند نہ مانا جائے۔ اگر کوئی مریض ڈاکٹر کے علاج کے دوران وفات پا جائے تو کسی عامی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ڈاکٹر کی جگہ چھین کر خود ڈاکٹر بن بیٹھے۔ اسی طرح اگر علمائے دین سے بھی کوئی غلطی ہو جائے تو محض اس غلطی کی بنا پر کوئی شخص ان کے مرتبہ کا حق دار نہیں ہو جاتا جب تک ان کے برابر مستند علم حاصل نہ کرے۔ اگر ناقص العلم آدمی اصحاب کمال سے برابری کا دعوےٰ کرے، تو علم کے سب شعبوں کو نقصان پہنچے گا۔

اسلام کا پہلا مکتب۔ صُفّہ

اسلام کی تاریخ میں سب سے پہلا مکتب صُفّہ ہے جسے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے خود قائم فرمایا۔ صُفّہ کے لغوی معنی سائبان کے ہیں۔ جب قبلہ بجائے کعبہ کے بیت المقدس قرار پایا تو مسجد النبی کے پہلے چھت کے نیچے طلبا کی سکونت گاہ بنی۔ اس چھت کو صفہ کہتے تھے اور یہاں کے مکین طلبا کو اصحاب صُفّہ۔ صُفّہ رہائشی مکتب تھا۔ یہ اسلام کی پہلی یونیورسٹی ہے بلکہ اس وقت

مسلمانوں کی سب سے بڑی یونیورسٹی تھی۔ اس مکتب سے عصرِ حاضر کے مدرسے مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس کا عالم ہی اور تھا۔ یہاں علم اور فقر دونوں کی قولی اور عملی تعلیم دی جاتی تھی۔ اصحاب صُفّہ کا اکثر وقت معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبتِ مبارک میں گزرتا تھا۔ یہ اصحاب حضورؐ کے فیوض سے ہر وقت بہرہ مند ہوتے تھے۔ ان کی تعلیم قرآنِ حکیم، تفسیر، حدیث اور فقہ تک محدود نہ تھی بلکہ وہ جو کچھ پڑھتے تھے اس کی عملی تربیت بھی حاصل کرتے تھے۔

صُفّہ کی یونیورسٹی میں داخلہ کے لئے زر و سیم اور سامانِ دولت کی حاجت نہ تھی۔ فقر ہی اصحاب صُفّہ کا سب سرمایہ تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ گداگری کرتے تھے یا دیگروں کے دستِ کرم کے منتظر رہتے تھے۔ ان حضرات سے جہاں تک ہو سکتا محنت مزدوری کرتے اور جو اجرت ملتی اس سے زندگی کی بنیادی ضرورتیں مہیا کرتے تھے۔ ان ضرورتوں کی فہرست یہ ہے؛ رُوکھی سُوکھی روٹی اور پھٹا پرانا لباس۔ لباس بالعموم ایک چادر یا ٹاٹ وغیرہ پر مشتمل ہوتا تھا جو ٹخنوں تک بدن کو ڈھانپے رکھتا تھا۔ بارہا فاقے گزر جاتے۔ بعض دفعہ بھوک سے اس قدر نڈھال ہوتے کہ عین حالتِ نماز میں گر جاتے تھے۔ ناواقف لوگ اُن کی ہیئت کو دیکھ کر گمان کرتے کہ دیوانے ہیں۔ یہ نیک نہاد بندے بے شک ظاہر بین نگاہ کے لئے دیوانے تھے۔ لیکن سچ پوچھو تو علم و حکمت کے مخزن تھے۔ جو آدمی خود کو اپنے نصب العین میں گم کر دے وہ بعض لحاظ سے دیوانہ نظر آتا ہے۔ اصحاب صُفّہؓ نے خود کو علم کے شوق میں محو کر رکھا تھا اس لئے مجذوب نظر آتے تھے۔ لیکن انھوں نے علم و حکمت کے دائرے کو دُور دُور پھیلایا۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

انھیں نومسلم قبیلوں میں تعلیم مسائل کے لئے روانہ فرمایا کرتے تھے۔ اسلام نیا نیا پھیل رہا تھا اور عرب کے چپے چپے میں اسلام کے دشمن پر تولے بیٹھے تھے۔ اصحابِ صُفّہ کی جان خطرہ میں رہتی تھی تاہم یہ اللہ کے بندے سر ہتھیلی پر رکھ کر فرائض ادا کرتے تھے۔ ان مہمات میں کئی اصحابِ صُفّہ شہادت کا جام نوش کر گئے۔

اصحابِ صُفّہ صرف راہِ علم کے جادہ پیما نہ تھے بلکہ میدانِ جہاد کے غازی بھی تھے۔ غزوات اور مہمات میں حصّہ لیتے تھے اور سپاہیانہ جوہر دکھلاتے تھے۔

خلافتِ راشدہ

خلافتِ راشدہ کا دور آیا تو تعلیم و تدریس میں اور وسعت ہوئی۔ بچوں کو قرآنِ حکیم، کتابت، اخلاقی اشعار اور امثالِ عرب وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ معلمین کے لئے حکومت کی طرف سے تنخواہیں مقرر تھیں۔ بچوں ہی کی تعلیم پر توجہ نہ تھی، تعلیم بالغاں کا بھی اہتمام تھا۔ فقہ کی تعلیم کے لئے ہر صوبہ میں تنخواہ دار فقہا اور معلّم روانہ کیے گئے جو مسجدوں میں بیٹھ کر درس دیتے تھے۔ ایک ایک فقیہ کے پاس ہزاروں کا مجمع ہوتا تھا۔

جو لوگ تجارت اور کاروبار کرتے تھے حضرتِ عمرؓ انھیں مجبور کرتے تھے کہ اپنے کاروباری شعبہ کے بارے میں فقہی مسائل سیکھیں۔ اگر دکانداروں اور تاجروں میں ضروری فقہی معلومات کی کمی دیکھتے تو ان کی کوڑوں سے تواضع کرکے علم حاصل کرنے کے لئے اساتذہ کے پاس بھیجتے تھے اگر کاروباری اصحاب فقہی مسائل سے آگاہ نہ ہوں تو عین ممکن ہے کہ وہ ناجائز ذرائع سے کمائی کریں۔

خلافت راشدہ کے بعد

بعد کے ادوار میں حکومت سے زیادہ خود علماء نے ترویج علم کی طرف توجہ دی۔ کئی علماء نے اپنی زندگیاں اس مقدس مقصد کے لئے مفت وقف کر دیں۔ بعض فرمانرواؤں اور امراء نے بھی ذاتی دلچسپی لی۔ حضرتِ معاویہ رضؓ نے شاہی کتب خانہ قائم کیا۔ ولید اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے بھی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ نادار طلبہ اور ان علماء کے لئے جنھوں نے منظور فرمایا وظائف جاری کئے۔ ہارون الرشید کو تحصیلِ علم کا اس قدر شوق تھا کہ بغداد سے چل کر مدینہ میں امام مالک کے پاس حدیث سننے آیا۔ ایک درس میں شامل ہونے جاتا تو کھجور کے ایک تنے پر بیٹھ کر عام طلبہ کے ہمراہ حدیث لکھتا تھا۔ عباسی خلفاء نے علم کے پودے کو جان عزیز کی طرح سینچا۔ دارالحکومت بغداد میں دنیا بھر سے علماء اکٹھے کیے۔ بغداد میں تقریباً بیس مدرسے ایسے تھے جو محلات کی وسعت اور شان رکھتے تھے۔

تعلیم کی اشاعت میں اصحاب ثروت نے بھی دلچسپی لی اور ذاتی خرچ سے بہت وسیع مدرسے بنائے۔ ان کے ساتھ اتنے بڑے بڑے وقف قائم کیے جن سے لاکھوں کی آمدن ہوتی تھی۔ طلبہ کی رہائش اور خوراک کا بھی انتظام ہوتا تھا۔ شفاخانے بھی ملحق تھے۔ ہزاروں کتابیں موجود تھیں۔ مستند اور شہرت یافتہ علماء کو ان مدرسوں کی نظامِ تعلیم سونپی جاتی تھی۔ طلبہ دور دراز کے سفر طے کر کے ان مدرسوں میں آتے تھے۔

ملتِ اسلامیہ میں علم کا نظام اس کے فرزندوں کی ذاتی کاوشوں ہی سے قائم رہا ہے۔ اس نظام کو زندہ اور مستحکم رکھنے کے لئے فقط علمی رُوح کی

ضرورت تھی جس سے اسلامی دنیا کا کوئی گوشہ خالی نہ تھا۔ لیکن اب جب کہ حکومت کے فرائض کا دائرہ بہت پھیل گیا ہے نظام تعلیم بھی حکومت کے فرائض میں شامل ہو گیا ہے لیکن یہ نظام جبھی صحیح معنی میں کامیاب ہو سکتا ہے کہ ملت اسلامیہ کا ہر فرد اس کا خیر خواہ ہو اور اسے خوب سے خوب تر دیکھنے کے لئے بے قرار ہو۔

اسلامی تعلیم کا نصب العین

کوئی کوشش اس وقت تک بار آور نہیں ہو سکتی جب تک اس کا نصب العین متعین نہ ہو۔ بغیر کسی مقصد کے جو کام بھی شروع کیا جائے وہ عبث ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ طلبہ کے سامنے اسلامی تعلیم کا نصب العین واضح کر دیا جائے۔

اسلامی تعلیم کا نصب العین بہت وسیع ہے۔ اس کا مقصود صرف حروف و الفاظ سے آشنا ہونا نہیں بلکہ دین کی خدمت ہے یعنی پوری اسلامی زندگی کی تعمیر۔ اسلامی تعلیم فرد کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ دین کی حفاظت و اشاعت کی عظیم مہم میں حصہ لے سکے۔

دینی زندگی کے دو پہلو ہیں یعنی روحانی اور دنیوی۔ عملی طور سے روحانیت کو دنیا داری سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اسلامی نقطۂ نگاہ سے روحانیت وہی ہے جو دنیا داری میں جاری و ساری ہو لیکن نظری نقطۂ نگاہ سے ہم ان پر الگ الگ بحث کر سکتے ہیں۔

روحانیت:

اسلامی تعلیم روحانی اور اخلاقی طور سے کامل تربیت دیتی ہے۔ یہ مقصود

محض کتابوں سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے شخصی نظیر اور تربیت کی بھی برابر کی ضرورت ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ معلم اخلاقی اوصاف سے مالامال ہو۔ اگر معلم اخلاقی جوہر سے خالی ہو تو شاگردوں کے اخلاق کو بگاڑ دیتا ہے اور علم کی قدر و منزلت کو بھی گرا دیتا ہے۔

دُنیاداری:

دنیا کا کاروبار نہایت وسیع اور پیچیدہ ہے اس کے لئے متعدد علوم مدون کئے گیے ہیں مثلاً سائنس، ریاضی، انجینیرُی وغیرہ۔ اگرچہ ہم ان کو دنیوی علوم کا نام دیتے ہیں لیکن اگر ان علوم کو دینی خدمت کے جذبہ سے حاصل کیا جائے اور ان سے محض تن پروری مقصود نہ ہو تو یہ بھی اللہ تعالےٰ کی نگاہ میں بہت مقبول ہوتے ہیں۔ البتہ ایسے علوم سے پرہیز کرنا چاہیے جو دین یا ملک کو الٹا نقصان دیں۔

اسلام مفید علوم و فنون کا بہت حامی ہے۔ اہلِ اسلام نے متعدد علوم کی بنا رکھی اور اس کو ملک و ملت کی خدمت کا کام لیا۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ آدمی ان علوم میں اتنا نہ کھو جائے کہ روحانیت کو بھول بیٹھے اور دین سے غافل ہو جائے۔

طالب علم کے اوصاف

طالب علم کو مندرجہ ذیل اوصاف پیدا کرنے چاہییں:

(۱) خوفِ خدا:

حدیث شریف ہے:

رَأْسُ الْحِكْمَةِ مَخَافَةُ اللّٰهِ

(حکمت کا سرچشمہ اللہ کا خوف ہے)

جس علم کا آغاز خوفِ خدا سے نہیں ہوتا وہ رحمانی نہیں شیطانی علم ہے۔ اس کا اسلام سے واسطہ نہیں۔

(۲) پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت:

مسلمان اس وقت تک سچا مسلمان نہیں ہوتا جب تک وہ محبوب خدا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت سے سرشار نہ ہو اور حضور کو اپنی جان اور اپنے والدین سے بھی عزیز تر نہ جانے۔

(۳) دین و شریعت کی پابندی:

ایمان کا تقاضا ہے کہ انسان اپنی سب خواہشوں کو دین و شریعت کے تابع کر دے اور اللہ تعالےٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کرے۔ ان تعلیمات پر عمل کرنے کے لئے اسلامی مکاتیب تربیت گاہ کا کام دیتے ہیں۔

(۴) قوم سے محبت:

مکتبی زندگی کے دوران طالب علم کے ذہن میں قوم کی محبت بخوبی راسخ ہو جانی چاہیے۔ طالب علم پر یہ نکتہ خوب عیاں ہو جائے کہ فرد کی زندگی قومی حیات سے وابستہ ہے۔ صحیح مسلمان وہ ہے جو دین کے ساتھ ساتھ قوم و وطن سے بھی محبت رکھتا ہے اور اس کے نفع و ضرر کو اپنا نفع و ضرر سمجھتا ہے۔

(۵) حکومت کی اطاعت:

اسلامی حکومت کی اطاعت پر اسلام میں بہت تاکید ہے۔ حکومت کے مسائل کو سمجھنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اس لئے حکومت کے ہر حکم پر وضاحت طلب کرنا ممنوع ہے۔ حکومت سے حتی الوسع تعاون کیا جائے۔

حکومت سے تعاون کا جذبہ طلبہ کے ذہن میں راسخ نہیں ہوگا تو ملک دشمن عناصر اُن کے ناپختہ اذہان پر اثر ڈال کر ان کو مظاہروں اور ہنگاموں کی راہ پر چلادیں گے جس سے ملک وملت کی سالمیت پر زد پڑے گی۔

(۶) اسلامی ثقافت:

اسلام اپنے پیروؤں کے لئے زندگی کا ایک خاص سلیقہ مقرر کرتا ہے جسے آج کل ثقافت کہتے ہیں۔ اسلامی ثقافت اسلام کی امتیازی شان کی مظہر ہے۔ مسلمان کو اپنی ثقافت پر ناز ہے۔ سادگی اور پاکیزگی ثقافت کی رُوح ہے۔ یہ اسے نشست و برخاست اور رہن سہن کے ایسے اسلوب سکھاتی ہے جو کسی خاص طبقہ سے مخصوص نہیں ہوتے بلکہ امیر و غریب اور حاکم و محکوم سب انھیں اپنا سکتے ہیں۔ مختلف گروہوں کے درمیان غیریت پیدا نہیں ہونے پاتی اور وہ آپس میں بغیر کسی تکلّف یا رکاوٹ کے میل جول رکھ سکتے ہیں۔ یہ ثقافت، مساوات، ہمدردی اور سادگی کے دم سے قائم رہتی ہے۔ اسلامی تعلیم ہمیں بتاتی ہے کہ سب مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ ان میں ہمدردی ہونی چاہیے۔ وہ دولت کو فضول اور بے کار سامانِ عیش پر ضائع نہ کریں۔ اسے اپنے بھائیوں کے فائدہ میں خرچ کریں۔

اسلامی ثقافت عیش پرستی اور سہل کوشی سے بچاتی ہے اور زندگی کی مشقت سے عہدہ برآ ہونے کے قابل کرتی ہے جو طالب علم مدرسہ کی زندگی میں عیش کوش اور راحت پسند ہوجائیں وہ قوم کے لئے بوجھ بن جاتے ہیں۔

مسجد و مکتب

اسلام میں علم چونکہ ایک مذہبی فریضہ ہے اس لئے اس میں مکتب کے ساتھ مسجد کا تعاون لازم ہے ورنہ اس کو وہ تقدس حاصل نہ ہو سکے گا جس کا وہ مستحق ہے۔ بلکہ تعلیمی نقطۂ نگاہ سے مسجد کو مکتب پر اوّلیت حاصل ہے۔ شروع میں مسجدیں ہی درس گاہوں کا کام دیتی تھیں۔ جب مکتب کہیں کہیں علیحدہ ہوئے تو ان میں بھی مسجدوں کی سی شان تقدس پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ۔

مسجد

مفہوم مسجد کے لغوی معنی ہیں سجدہ گاہ۔ لغت کی رُو سے ہر وہ جگہ مسجد ہے جہاں ایک مسلمان بندہ اللہ تعالےٰ کے حضور میں سجدہ ادا کرتا ہے۔ ہر پاکیزہ جگہ مسلمان کی سجدہ گاہ ہو سکتی ہے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہمارے لئے ساری زمین مسجد بنائی ہے[1]

اصطلاح میں مسجد اس جگہ کو کہتے ہیں جو جماعتی نماز کے لئے مستقلاً وقف کردی گئی ہو۔

مسجد میں جیم مکسور ہے۔ اگر جیم مفتوح ہو تو اس کے معنی وہ جگہ ہوں گے جہاں حالتِ سجدہ میں سر رکھا جاتا ہے جو اس وقت ہمارا موضوعِ بحث نہیں۔

مقاصد مسلمان پر پنج وقتہ نماز فرض ہے۔ سوائے مجبوری کے گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں۔ اذان سنتے ہی محلہ کی مسجد میں نماز باجماعت پڑھنے کے لئے مستعد ہو جانے کا حکم ہے۔

مسجد کے امام سے توقع رکھی جاتی ہے کہ علم دین سے واقف ہو۔ وہ

---

[1] مسلم کتاب المساجد جلد ۲ ۱۲۱۴۔

محلہ کے بچوں کو دین کی ابتدائی تعلیم دیتا ہے۔ اہلِ محلّہ کی مذہبی رہنمائی کرتا ہے اور ان کے شرعی مسائل کے حل کرنے کو فتوے صادر کرتا ہے۔ مسجد سے ہر مسلمان کا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ مسجد مسلمان کی زندگی میں مرکزی مقام رکھتی ہے۔

مسجد روحانی بالیدگی، اخلاقی طہارت، بدنی پاکیزگی اور ماحول کی صفائی کی تصویر پیش کرتی ہے۔ مسجد نور کا مسکن ہے۔ اللہ تعالےٰ نے سورۂ نور میں اپنی ذات کو نور سے تشبیہ دی ہے اور بتایا ہے کہ نور کی ارضی جلوہ گاہ مساجد ہیں۔ حضرتِ ابنِ عباسؓ کا قول ہے کہ مسجدیں زمین میں اللہ کے گھر ہیں۔ آسمان والوں تک ان کا نور اس طرح پہنچتا ہے جیسے ستاروں کا نور اہلِ زمین تک (تفسیر خازن) جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالےٰ کے لئے بستیوں میں محبوب ترین جگہ مساجد ہیں[1]

مسجد کا اولین مقصد بے شک پنج وقتہ نماز ہے لیکن اس کے مقاصد اور فوائد کو صرف پنج وقتہ نماز تک محدود نہیں رکھا گیا۔ اس بارہ میں کچھ فقہی اختلاف ضرور ہیں لیکن ہمارے لئے فیصلہ کن چیز اُمتِ اسلامیہ کا وہ متواتر عمل ہے جو صدیوں سے ہم دیکھ رہے ہیں۔ اہلِ اسلام نے اسلام کے کسی دور میں مسجد کو محض نماز تک محدود نہیں رکھا۔ چھوٹے بڑے درس اور ملّی اجتماع ہم آئے دن مسجدوں میں دیکھتے رہے ہیں جن میں وقت کے ائمۂ کرام بنفس نفیس شامل ہوتے تھے۔

مسجد مسلمان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نہایت بنیادی اور اہم

---

[1] مسلم ۲: ۱۳۲

کردار ادا کرتی ہے۔ ہم مندرجۂ ذیل عنوانوں کے تحت اس کا جائزہ لیں گے :۔

(۱) عبادت کی گہرائی :

عبادت اکیلے بھی ہو سکتی ہے لیکن جماعتی طور سے عبادت کرنے کا دل پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ سب افراد ایک دوسرے سے اثراندوز ہوتے ہیں اور عبادت کی محویت فزوں تر ہوتی ہے۔

(۲) مسجد دینی شعار ہے :

مسجد دینِ اسلام کی ایک درخشاں علامت ہے۔ اس کی عمارت میں سادگی کے باوصف ایک پُرزور کشش ہوتی ہے جو ہمارے دلوں کو دین کی طرف کھینچتی ہے۔ مسجد کے ساتھ بہت تقدس وابستہ ہوتا ہے اس کو دیکھتے ہی دل میں احترام اور محبت کے جذبات بیدار ہوتے ہیں۔

قومی یا دینی شعار قوم و ملت کی خودی اور خود آگاہی کو برقرار رکھنے میں بہت حصہ لیتے ہیں۔ ہر قوم اپنے شعار سے محبت کرتی ہے اور اس کی آن پر جان دیتی ہے۔ یہ اس کی ملی بیداری اور غیرت کا ثبوت ہوتا ہے۔ ہر حساس اور غیرت مند مسلمان کو مسجد سے محبت ہوتی ہے وہ اس کی شان کو بلند سے بلند تر دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کی نگاہ جب سرفراز مینار ولی کی طرف جاتی ہے تو اس کا سر بھی فخر کے ساتھ اونچا ہوتا ہے۔ پاکستان میں جب باہر سے سیاح آتے ہیں تو ہم نہایت مسرت سے انھیں شاہی

مسجد کے شان و شکوہ کا نظارہ کراتے ہیں۔

ولید اوّل نے جامع دمشق پر لاکھوں روپیہ خرچ کیا اور اسے سونے چاندی سے لیپ دیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز سادگی پسند تھے۔ خلیفہ ہوئے تو چاہا کہ مسجد کی فاضل زینت اور سونے چاندی کو اتار کر قوم کے مصرف میں لائیں۔ کسی نے بتایا کہ ایک عیسائی زائر اس کو دیکھ کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ آپ نے کہا اگر اس کی شان اغیار کے لئے اس قدر ہیبت انگیز ہے تو اسے اپنے حال پر رہنے دو۔

مسجد سے پنج وقتہ اذان کا غلغلہ انگیز صدا اٹھتی ہے۔ اذان بھی اسلام کا ایک ممتاز شعار ہے۔ یہ سطوتِ اسلام کا مظہر ہے۔ مسلمان کے دل میں تکبیر کا ہر نیا غلغلہ ایمان کا ایک تازہ جوش برپا کرتا ہے۔ ادھر اسلام کے دشمنوں کا یہ حال ہے کہ اذان کی آواز پر تلملا اٹھتے ہیں۔ تاریخ اسلام میں ایسے لمحات کی کمی نہیں جب ہم نے اعداء کی مہیب فوجوں کو صرف تکبیر کے نعروں سے لرزا کر مغلوب کر لیا۔

(۳) مسجد مسلمان کا پہلا مکتب ہے:

جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام میں پہلا مدرسہ قائم کیا۔ یہ مدرسہ مسجد النبی میں قائم ہوا۔ اس کو صُفّہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے آپؐ کی زندگی میں مدینہ میں اور بھی کئی مسجدیں بن گئی تھیں۔ ان سب مسجدوں میں بچوں کو تعلیم دی جاتی تھی۔

مسلمان بچے کو سب سے پہلے جس چیز کی تعلیم دی جاتی ہے وہ قرآنِ شریف ہے۔ ابن خلدون لکھتے ہیں کہ قرآن حکیم کی تعلیم اہلِ اسلام کا شعار ہے۔ اسلام کی تقریباً پہلی تین صدیوں میں مسجد ہی درس گاہ ہوتی تھی۔

جب نئی درس گاہ کی ضرورت ہوتی تو ایک اور مسجد بنا لیتے تھے یعنی عبا
اور تعلیم اسلام میں لازم وملزوم ہیں۔ چوتھی صدی ہجری میں جا کر الگ مد
کا اہتمام ہونے لگا۔

ہر مسجد کے ساتھ عام طور سے کمرے ہوتے ہیں۔ یہ کمرے طلبہ
اقامت گاہوں کا کام دیتے رہے ہیں۔ یہاں جو نادار طلبہ مقیم ہوتے
قوم کی طرف سے اُن کے خرچ کا بھی انتظام ہوتا ہے۔

(۴) اسلامی ثقافت:

مسجد اسلامی ثقافت سے بہرہ مند کرتی ہے۔ اسلامی ثقافت
روح و رواں تین چیزیں ہیں:-

پاکیزگی۔

سادگی۔

مساوات اور ہمدردی۔

ان تینوں چیزوں کی تعلیم کا آغاز اور تکمیل مسجد ہی میں ہوتی ہے۔

پاکیزگی: نماز کے لئے وضوء لازم ہے۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ
نے پاکیزگی کو ایمان کا جزو قرار دیا ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ اگر میں اپنی اُ
پر شاق نہ جانتا تو ہر نماز کے لئے مسواک ضروری قرار دیتا۔

مسجد میں آنے سے پہلے مسلمان اس بات کا اہتمام کر لیتا ہے کہ کپڑے
پاکیزہ ہوں اور جسم پر کوئی غلاظت نہ ہو۔ اس پنج وقتہ اہتمام سے مسلم
کے دل میں پاکیزگی کا جذبہ راسخ ہو جاتا ہے۔

سادگی:

مسجد میں نماز ادا کرنے کے لئے سب تکلفات برطرف کرنے پڑتے

۔ نہ ریشمی لباس اور طلائی انگوٹھی وغیرہ سے بھی احتراز کرنے کا حکم ہے
نماز کا حق ادا نہیں ہوتا۔ مسجد میں اُٹھنا بیٹھنا نہایت سادگی سے ہوتا
۔ اللہ تعالیٰ کے حضور میں ہر ایک کی خواہش ہوتی ہے کہ سادہ لباس
ادہ ہیئت میں جلائے۔

مساوات اور ہمدردی:

مسجد میں ہر طبقہ کے لوگ شانہ بشانہ شریکِ نماز ہوتے ہیں۔ امیر و غریب
کم و محکوم کی کوئی تفریق نہیں ہوتی۔ کسی شخص کو اجازت نہیں کہ اپنی جگہ
امیر آدمی کے لئے خالی کرے۔ مسجد میں اصحابِ رتبہ اور اربابِ دولت
ماغ سے کبر و نخوت کا نشہ اگر مٹ نہ جائے تو کم ضرور ہو جاتا ہے۔

(۵) آداب کی تعلیم:

مسجد میں متفرق آداب بالخصوص معاشرتی آداب کی نہایت مستحکم
ملتی ہے۔ ہر شخص نہایت مؤدب ہو کر مسجد میں داخل ہوتا ہے۔
ر میں بھاگ کر آنے کی اجازت نہیں چاہیے نماز کا وقت نکل رہا ہو۔
ہ اور وقار کے ساتھ آنے کا حکم ہے۔ نماز بذاتِ خود سلیقہ اور
اطواری کی مظہر ہے۔

مسجد کے آداب سے تقدس وابستہ ہوتا ہے۔ اس لئے یہاں جو آداب
جاتے ہیں ان کی عمر بھر حفاظت کی جاتی ہے۔

(۶) پابندیِ اوقات:

نماز باجماعت کے اوقات مقرر ہوتے ہیں۔ کسی رئیس کے لئے انتظار
کیا جاتا۔ آں حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بہترین عمل
مقررہ کی نماز ہے [1]

---

[1] مسلم کتاب الاعمال ...

اذان کی آواز کان میں پڑتے ہی نماز کے لئے مستعد ہو جانا چاہیے اور
وقت پر چل کر جماعت کے ساتھ شامل ہو جانا چاہیے۔ نماز میں پابندیِ وقت
کی انتہائی تاکید ہے۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے، جی
چاہتا ہے کہ اذان کے بعد جاؤں اور جو لوگ گھروں میں بیٹھے ہیں اُن کے گھر
کو آگ لگا دوں۔[1]

(۷) تنظیم:

نماز باجماعت میں بہت تنظیم ہوتی ہے۔ اس کے نظم و ضبط کی مثال پیش
کرنا مشکل ہے۔ شانہ سے شانہ ملا کر نہایت خوش ترتیبی سے صف بندی
ہوتی ہے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ
صفیں سیدھی باندھو ورنہ تمھارے دلوں میں اختلاف پیدا ہو جائے گا۔[2]
آپؐ نے صفوں کی درستی کو نماز کی تکمیل اور اس کا حسن قرار دیا ہے۔[3] حضرت
عمرؓ نے صفیں درست کر لے کے لئے تنخواہ دار ملازم مقرر کیا تھا۔
ساری جماعت دل کی خوشی سے محض اللہ تعالےٰ کی رضا کی خاطر امام
کی اطاعت کرتی ہے۔ قعدہ، قیام، رکوع، سجدہ اور تسلیم وغیرہ میں امام
سے پہل کرنے کی سخت ممانعت ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا
ارشاد ہے کہ تمھیں اس بات کا خوف نہیں کہ جو آدمی امام سے پہلے سر اٹھائے
اللہ تعالےٰ اس کا سر گدھے کا بنا دے۔[4]
نماز میں انتہائی خاموشی اور سکون کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ نماز کے اندر
ہی میں نہیں بلکہ امام کے خطبہ کے دوران بھی بولنا منع ہے۔ اگر کوئی

---

[1] مسلم ج ۲ ص ۱۲۷ [2] متفق علیہ [3] مسلم ج ۲ ص ۳۰، ۳۱ [4] مسلم ۲: ۲۸

آدمی بول اُٹھے تو اُسے بھی اشارہ سے منع کیا جائے۔ جناب ہادیِ برحق علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ جمعہ کے روز امام خطبہ دے رہا ہو اور تو اپنے ساتھی سے کہے کہ چپکا رہ تو تو لغو حرکت کرتا ہے[1] مطلب یہ ہے کہ اسے اشارہ سے خاموش کرو۔

(۸) خود ضبطی:

مسجد میں آداب و قواعد کی جو پابندی کی جاتی ہے وہ کسی قانونی گرفت کے خوف سے نہیں ہوتی بلکہ صرف تقویٰ کے جذبہ سے کی جاتی ہے۔ اس سے خود ضبطی کی تربیت ہوتی ہے۔ انسان میں اپنے جذبات اور میلانات کو قابو رکھنے کی استعداد پیدا ہوتی ہے اور وہ معاشرہ اور حکومت کی پابندیوں کو بھی خوشی سے برداشت کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

(۹) شیرازہ بندی:

مسجد میں آنے والے سب مسلمان ایک ہی نصب العین کے تحت آتے ہیں۔ ان میں یکجہتی اور ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے جو اُخوت کا سنگِ بنیاد ہے نا آشناؤں سے شناسائی ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ اور مسائل سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ تعاون کا جذبہ پنپتا ہے۔ تسبیح کے بکھرے ہوئے دانوں کی شیرازہ بندی ہو جاتی ہے۔ رشتۂ اخوت مضبوط تر ہو جاتا ہے۔

(۱۰) ملی شکوہ:

جماعتی شیرازہ بندی سے اپنے بیگانے ہر ایک کو یہ احساس پیدا ہوتا ہے

---

[1] مسلم کتاب الجمعہ۔ بخاری۔

کہ ملتِ اسلامیہ میں کس قدر اخوت اور ہمدردی ہے۔ اہل اسلام کے ملّی شکوہ کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی ہمت بندھتی ہے اور اغیار مرعوب ہوتے ہیں۔

(۱۱) رُوح و مادہ میں توازن:

مسجد انسان کی کاروباری مصروفیتوں کی یک رُخی کو مٹا کر کاروبار اور عبادت میں ایک صحیح توازن پیدا کرتی ہے۔ دِل ہر وقت دُنیا میں اُلجھا نہیں رہتا بلکہ اللہ تعالےٰ کو بھی یاد کر لیتا ہے۔ اس سے مسلمان کے کاروبار میں نیکی کا عنصر غالب رہتا ہے۔

مکتب

مفہوم مکتب یا مدرسہ تعلیم کی جگہ کو کہتے ہیں۔ بعض اہلِ علم کے خیال میں مکتب ابتدائی درس گاہ اور مدرسہ بڑی درس گاہ کے معنی رکھتا ہے۔ لیکن یہ فرق ضروری نہیں۔ بالخصوص موجودہ دور میں مکتب اور مدرسہ ایک ہی معنی میں مستعمل ہیں۔

اہمیّت قوموں کی تاریخ میں مکتب کو نہایت بلند اور معزز مقام حاصل ہوتا ہے۔ اقوام اپنے ممتاز مکاتب اور اُن کے تعلیمی کارناموں پہ ناز کرتی ہیں۔ اچھے مکاتب کا قوم کی تاریخ پر نہایت گہرا اثر ہوتا ہے۔ وہ قوم کو ایک نئی زندگی اور نئی حرکت عطا کرتے ہیں۔ ان سے جو علماء فارغ ہو کر نکلتے ہیں قوم کی ترقی میں نہایت اہم حصّہ لیتے ہیں اور تاریخ کی لوح پر اپنا نام ثبت کر جاتے ہیں۔

انگلستان کو آکسفورڈ اور کیمبرج اور بعض دیگر مکاتب کا ناز ہے۔ مسلمان مدرسۂ نظامیہ کا ذکر فخر سے کرتے ہیں۔ ان کو جامعۂ ازہر کی ہزار سالہ تاریخ سرمایۂ افتخار ہے۔ دارُالعلوم دیوبند کا نام ساری اسلامی دنیا میں عزّت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ مدرسۂ نظامیہ، جامعۂ ازہر اور دارالعلوم دیوبند وغیرہ نے قوم کی تاریخ پر دیرپا نقش چھوڑے ہیں۔ ہندوستان کی

آزادی میں ہمارے بعض دینی مدرسوں اور کالجوں کے معلّمین اور فارغ التحصیل مجاہدین نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔

مدرسہ سے اس کے فارغ طلبہ کو عمر بھر عقیدت رہتی ہے۔ وہ اپنے مدرسہ کی زندگی اور اساتذہ کا جب کبھی خیال دل میں لاتے ہیں ان کے سینے عقیدت اور محبت کے جذبات سے لبریز ہو جاتے ہیں۔ طالب علمانہ زندگی کی تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے یہ تصویر ہمیشہ دل کے کسی گوشے میں محفوظ پڑی رہتی ہے اور انسان کے خیالات اور احساسات پر اثر ڈالتی رہتی ہے۔ کوئی چیز جس قدر محبوب ہو اسی قدر زیادہ عمیق اثر پیدا کرتی ہے۔ مدرسہ سے انسان کو اس قدر محبّت ہوتی ہے کہ جب کبھی اس کی یاد دل میں آتی ہے جی یہی چاہتا ہے کہ کاش طالب علمی کے دن لوٹ آئیں۔

اگر ہم کسی قوم کی معاشرتی اور سیاسی زندگی کی پوری تصویر کاغذ پر اُتار سکیں تو مختلف مکتبوں اور مدرسوں کے عکس جا بجا نمایاں نظر آئیں گے۔

مکتب انسانی زندگی کے کئی پہلو تعمیر کرتا ہے مثلاً :۔

(۱) علم۔
(۲) اُخوّت۔
(۳) نظم و ضبط۔
(۴) آداب۔
(۵) اُستاد کا اخلاقی اثر۔
(۶) جسمانی تندرستی۔

(۷) گھریلو زندگی کی تربیت۔

ہم ان پر ذیل میں فرداً فرداً نگاہ ڈالیں گے۔

(۱) علم:

علم یوں تو گھر پر بھی استاد کے زیر نگرانی پڑھا جا سکتا ہے اور کتابیں خرید کر ذاتی طور سے ان کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے لیکن جماعت میں بیٹھ کر علم حاصل کرنے کے جو فوائد ہیں وہ انفرادی تعلیم میں نہیں۔ بچّہ کو تنہا بٹھا کر پڑھنے پر مجبور کیا جائے تو وہ اُکتا جاتا ہے اور اس کو پڑھائی سے وحشت ہونے لگتی ہے۔ بچّے طبعاً جماعت پسند ہوتے ہیں۔ بالخصوص ہم عمر بچّوں کی صحبت میں وہ چہک اُٹھتے ہیں اور اُن کے قویٰ جولانی دکھانے لگتے ہیں۔ بچّے کی ذہنی اور بدنی صلاحیتیں اس کے ہم عمر لڑکوں میں پروان چڑھتی ہیں۔ اگر اس کو الگ رکھا جائے تو اس کی زندگی مقیّد ہو جاتی ہے۔ اس کی شخصیت میں وسعت پیدا نہیں ہوتی۔ سلاطین اپنے بچّوں کی تعلیم کا انتظام محل ہی میں خاص اساتذہ کے زیر اہتمام کرتے تھے لیکن کوشش کرتے تھے کہ ان کے ساتھ ہم عمر اور ہم سبق بچّے بھی شامل ہوں چاہے یہ بچّے شاہی خاندان اور امراء و وزراء ہی کے ہوں۔

بچّہ کو جب شروع میں علم پر لگایا جاتا ہے تو اس کی آزادہ رو طبیعت علم کو ایک بہت بڑا بوجھ سمجھتی ہے۔ اگر اس کے کندھے پر یہ عظیم بوجھ رکھ کر اسے تنہا بٹھا دیا جائے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ پہاڑ کے نیچے پِسا جا رہا ہوں۔ لیکن وہ جماعت میں آ کر شریک ہوتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ زندگی کی اس مہم میں وہ اکیلا نہیں۔ اور بھی سینکڑوں لڑکے اس کے شریک کار ہیں۔ یہ سمجھتا ہے کہ اس کے ہم جماعت لڑکے اس کا بوجھ ہلکا کر رہے

ہیں۔ یہ بوجھ صرف خیالی طور سے ہی ہلکا نہیں ہوتا بلکہ واقعۃً ہوتا ہے۔
مثلاً سبق یاد کرنے کے کئی طریقے ہوتے ہیں۔ بارہا ایک بات کو کتاب سے
بار بار پڑھتے ہیں لیکن وہ حافظہ میں نہیں بیٹھتی۔ لیکن اسے دُوسرے کی
زبان سے سُنتے ہیں تو ہمیشہ کے لئے ازبر ہو جاتی ہے۔ طالب علم اپنے
ساتھیوں کی زبان سے جو کچھ سُنتا ہے وہ آسانی سے بغیر کسی کوفت کے
اس کے ذہن میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ مکتب میں طلبہ کے باہم مل کر سبق کا
دَور کرنے کا عام رواج ہے۔ اس دَور کے بیش بہا فوائد ہیں۔ اس سے
طلبہ کی یادداشت اور فہم دونوں پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ طبیعت پر بوجھ نہیں
ہوتا اور سبق میں جی لگتا ہے۔ علم سے رغبت پیدا ہوتی ہے، بلکہ روح میں
سما جاتا ہے۔

قرآن شریف کو آدمی اکیلے بیٹھ کر پڑھے تو بے شک اس کی حلاوت
سے رُوح پرکیف ہوتی ہے۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب ہم دوسرے
کی زبان سے قرآنِ حکیم سُنتے ہیں تو طبیعت پر ایک اور ہی عالم طاری ہو
جاتا ہے۔ جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بارہا کسی صحابی رضؓ
کو حکم دیتے کہ قرآن کی تلاوت کرو اور ان کی زبان سے کلام الٰہی سُن کر
محظُوظ ہوتے۔ ہر سال رمضان کے مُبارک مہینہ میں حضرت جبرئیل تشریف
لاتے اور آں حضُور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ قرآنِ حکیم کا دور کرتے تھے۔
آپؐ کا ارشاد ہے کہ جب بھی کچھ لوگ کسی مسجد میں جمع ہوتے ہیں۔ قرآنِ حکیم
کی تلاوت کرتے ہیں اور ایک دُوسرے کو پڑھاتے ہیں تو ان پر اللہ کی
طرف سے سکُون نازل ہوتا ہے، اللہ کی رحمت انھیں ڈھانپ لیتی
ہے اور فرشتے ان پر سایہ کرتے ہیں اور اللہ تعالےٰ ان کو اپنے مقربین

میں یاد کرتا ہے[1] قرآنِ حکیم کا علم سب سے افضل علم ہے لیکن اس کے علاوہ بھی جو علم اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اختیار کیا جائے دین کا شعبہ ہوتا ہے۔ جب کوئی جماعت اس علم کے لئے یا ہم بیٹھتی ہے تو جیسا کہ گزشتہ سطور میں گزر چکا ہے وہ سکون محسوس کرتی ہے۔ بالخصوص نو عمر اور نو آموز بچوں کو ایک جماعت میں بیٹھ کر پڑھنے سے بہت تسکین ہوتی ہے۔ سبق آسانی سے یاد ہوتا ہے۔ جس کا نتیجہ راحت ہے۔ علم کا بوجھ ہلکا ہوجاتا ہے اور نہ صرف علم سے بلکہ معلّم، مکتب اور ہم جماعتوں سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ جہاں یہ محبّت پیدا ہو جائے وہاں برکت اور کامیابی کا نصیب ہونا لازم ہے۔ جنابِ ہادیِ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ الْجَمَاعَۃِ

(جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے)

(۲) اخوّت:

مکتب ایک نئی برادری کی بنیاد ڈالتا ہے جس میں محبت کا اتنا قوی اثر ہوتا ہے کہ عمر بھر برقرار رہنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ہم جماعت کے ساتھ دائمی اُنس ہوتا ہے۔ ہم جماعتوں کی ایک مستقل برادری قائم ہو جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ایک مکتب کے جس قدر قدیم طلبہ ہوتے ہیں ان کی بھی ایک جماعت بن جاتی ہے۔ جب دو آدمیوں کو اچانک معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک ہی مدرسہ کے تعلیم یافتہ ہیں تو ان میں ایک قلبی ربط قائم ہو جاتا ہے۔ اور وہ ایک دوسرے سے مل کر اتنی خوشی محسوس کرتے

---

[1] ریاض الصالحین بحوالہ مسلم۔

ہیں گویا کوئی گم کردہ متاع ہاتھ آگئی ہو۔ کئی مدرسوں اور کالجوں میں طلبۂ قدیم کی انجمنیں ہیں۔ یہ انجمنیں ایک نہایت وسیع برادری کی ضامن ہوتی ہیں۔ ان کا سال میں عموماً ایک بار اجتماع ہوتا ہے جہاں بچھڑے ہوئے دوست آپس میں مل بیٹھتے ہیں اور مبادلۂ افکار کرتے ہیں۔

اس اخوت کی بناء ہمیشہ مدرسہ کا اشتراک ہی نہیں ہوتا بلکہ بارہا معلّم کا اشتراک بھی ہوتا ہے۔ بعض معلّمین کا علم کی تاریخ اور شاگردوں کی زندگی پر بہت نمایاں اثر ہوتا ہے۔ ان کے شاگرد ان کے دامنِ فیض سے وابستہ ہونے کو سرمایۂ امتیاز سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے استاد کا نام نہایت فخر سے لیتے ہیں اور اپنے اُستاد کے دیگر شاگردوں سے نہایت محبت رکھتے ہیں چاہے انھوں نے ایک ہی مکتب میں اس استاد سے نہ پڑھا ہو۔ پچھلے دنوں اخبارات میں ایک اشتہار دیکھنے کا اتفاق ہوا جس میں مولانا انور شاہ مرحوم کے ایک شاگرد نے اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ میں اُستادِ مکرم کے سب شاگردوں کے حالات مرتب کرنا چاہتا ہوں۔ مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں کا حلقہ دُور دراز تک پھیلا ہوا ہے۔ ان کے شاگرد اپنے کو حسینی کہنے میں بجا طور پر شرف سمجھتے ہیں۔ یہی حال دیگر بلند مرتبہ علماء اور اساتذہ کا بھی ہوتا ہے۔ بلکہ بارہا ان اساتذہ کا علمی اثر شاگردوں کی آئندہ نسلوں میں بھی متوارث ہوجاتا ہے اور اس خاندان کے لوگ اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ہمارے فلاں بزرگ نے فلاں عالم سے فیض پایا تھا۔

مکتب یا معلّم کی قائم کی ہوئی اخوت نہایت وسیع اور مستحکم ہوتی ہے اور پشتوں تک باقی رہتی ہے۔

(۳) نظم و ضبط

مکتب کی زندگی سراپا انضباط ہوتی ہے۔ طالب علم کے دل میں آہستہ آہستہ نظم و ضبط کی روح گھر کرجاتی ہے۔ وہ نظم و ضبط کی سب ضروری جزئیات عمر کے ابتدائی حصہ میں سیکھ لیتا ہے اور زندگی بھر ان سے فائدہ اُٹھاتا ہے۔ ان جزئیات کا احاطہ مشکل ہے۔ ان میں بعض درج ذیل ہیں :—

وقت پر آنا۔ نظام الاوقات کی پابندی کرنا۔
وقت ضائع نہ کرنا۔
روز کا کام روز کرنا۔
جماعت میں سکون سے بیٹھنا۔
ساتھیوں کے حقوق کا خیال رکھنا۔
کسی پر زیادتی نہ کرنا۔
معلم کی اطاعت کرنا۔
بغیر رخصت کے جماعت سے باہر نہ جانا۔
چھٹی لئے بغیر مکتب سے غیر حاضر نہ ہونا۔
کھیل کے میدان میں قواعد کا پابند ہونا۔
وقت پر سونا۔
وقت پر جاگنا۔
اعتدال سے سونا۔
اعتدال سے کھانا۔

(۴) آداب:

مکتب میں انسان شائستہ آداب اور نیک اطوار سیکھتا ہے۔ اساتذہ تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کے سلیقہ پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ آداب مکتب کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں:۔

اساتذہ کی تعظیم کرنا۔ اس تعظیم کا یہ اثر ہوتا ہے کہ عام بزرگوں کی تعظیم بھی اخلاق کا جزو ہو جاتی ہے۔

ادب سے بولنا۔

بدزبانی نہ کرنا۔

صفائی رکھنا۔

سلیقہ کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا۔

کمرہ میں سلیقہ کے ساتھ چلنا نہ کہ بے طور بھاگنا۔

بغیر ضرورت نہ کھانسنا، نہ تھوکنا اور نہ ناک صاف کرنا۔

اپنی پڑھائی میں دھیان رکھنا توجہ اِدھر اُدھر نہ ہٹانا۔

کتابوں اور کاپیوں کو صاف اور سلیقہ سے رکھنا۔

(۵) استاد کا اخلاقی اثر:

اسلام کی نگاہ میں علم ایک مقدس چیز ہے۔ وہی علم صحیح علم ہے جو روحانیت کو بلند کرتا ہے۔ اس لئے معلم کے لئے نیک سیرت اور بلند اخلاق ہونا لازم ہے ورنہ نظام تعلیم میں اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ معلم سے جس روحانی رفعت اور اخلاقی پاکیزگی کی توقع کی جاتی ہے اس کی توقع والدین سے بھی نہیں ہو سکتی۔ والدین کا دائرۂ اثر گھر کی چار دیواری تک ہوتا ہے۔ معلم پوری ملت پر اثر انداز ہونے کا بیڑا

اٹھتا ہے۔ اس لئے اُس کے اخلاق میں چودھویں کے چاند کی طرح نورانیت ہونی چاہیے تاکہ وہ سارے عالم کو اپنے پاکیزہ، جاں فزا اور روح پرور نور سے سیراب کرسکے۔ اسلام نے اخلاق کے ایسے بے نظیر معلّم پیدا کئے ہیں کہ وہ کسی اور مذہب میں ہوتے تو لوگ انھیں دیوتا یا پیغمبر تسلیم کرلے پر آمادہ ہوجاتے۔

اسلامی نقطۂ نگاہ سے معلم میں مندرجۂ ذیل اوصاف کا ہونا لازم ہے:

(ا) خوفِ خُدا:

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کا پاؤں ایک بچّے کے پاؤں پر آگیا۔ بچّے نے چیخ کر کہا، خُدا سے نہیں ڈرتا۔ امام ابو حنیفہؒ غش کھا گئے۔ اسلام اپنے اساتذہ سے اسی قسم کے خوفِ خُدا کا طالب ہے۔

(ب) شریعت کی پابندی:

اسلام میں متعدد ایسے علمائے کرام گزرے ہیں کہ ان کے اقوال ہی نہیں بلکہ اعمال بھی شریعت میں سند کا درجہ رکھتے ہیں۔

(ج) وقار و متانت:

خلیفہ ہارون الرشید نے امام مالکؒ سے درخواست کی کہ میرے پاس حاضر ہوکر مجھے حدیث پڑھائیے۔ امام مالکؒ نے انکار کیا اور فرمایا علم کو پست نہ کرو ورنہ اللہ تعالےٰ تمھیں پست کردے گا۔

(د) قربانی:

اسلام کی آن پر جب بھی آنچ آئی ہے علمائے کرام نے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ وغیرہ نے اس راہ میں جو شدائد اُٹھائے ہیں ان کے ذکر سے زہرہ گداز ہوتا ہے۔

(۵) شفقت:

اُستاد والدین سے بھی بڑھ کر شفیق ہوتا ہے۔ والدین کے دو چار بچے ہوتے ہیں لیکن اُستاد کو سینکڑوں شاگردوں کی نگرانی کرنی ہوتی ہے۔ اس لئے اس کا قلب بہت وسیع ہوتا ہے۔ شاگردوں سے اپنے بچے سے بھی بڑھ کر محبت کرتا ہے۔

قدرتی بات ہے کہ ہر صاحب اخلاق شخص دیگر لوگوں کو بھی نیک اخلاق سے متصف دیکھنا چاہتا ہے۔ معلّم کی انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ طلبہ کی سیرت کو اس حد تک بلند کرے کہ ملتِ اسلامیہ کو ان پر ناز ہو۔ اسلام میں ایسے معلّمین کا شمار نہیں جنھوں نے قوم کے اخلاق پر نہایت نیک اور دیرپا اثر ڈالا ہے۔

(۶) جسمانی تندرستی:

ہر مکتب کا ایک مقررہ نظام الاوقات ہوتا ہے۔ نظام الاوقات بناتے وقت طالب علم کی زندگی کے سب شعبوں کو سامنے رکھا جاتا ہے۔ جسمانی ریاضت کو خصوصیت سے وقت دیا جاتا ہے تاکہ طلبہ کی صحت ٹھیک رہے۔ پہلے زمانے میں زندگی کا ڈھب ہی ایسا تھا کہ طلبہ کی صحت ٹھیک رہتی تھی۔ وہ محنت اور مشقت کی زندگی کرتے تھے اس لئے نظام الاوقات میں جسمانی ریاضت کو خصوصیت سے الگ وقت نہیں دیا جاتا تھا۔ لیکن پھر بھی انھیں، شمشیر بازی اور شاہسواری کی طرف توجہ دلائی جاتی تھی۔ ہمارے اسلاف میں ایسے علماء گزرے ہیں جو میدانِ جہاد میں سپاہیانہ شان سے نکلتے تھے۔ موجودہ دَور میں بھی حضرت سید احمد بریلوی رح اور شاہ اسماعیل رح وغیرہ کی سبق آموز زندگیاں ہمارے سامنے ہیں۔

(۷) گھریلو زندگی کی تربیت :

کئی مکتبوں کے ساتھ اقامت گاہیں ہوتی ہیں یہاں طالب علم کو چھوٹے پیمانے پر گھریلو زندگی کی تربیت حاصل ہوتی ہے۔ ضرورت بھر کا مختصر سامان سنبھالنے، خورد و نوش کا انتظام کرنے، پوشاک اور اس کی دھلائی اور حفاظت وغیرہ کی ذمہ داری سنبھالنے کی اسے زندگی میں پہلی بار تربیت ملتی ہے اور وہ سیکھتا ہے کہ وہ اپنے پاؤں پر کیسے کھڑا ہو۔
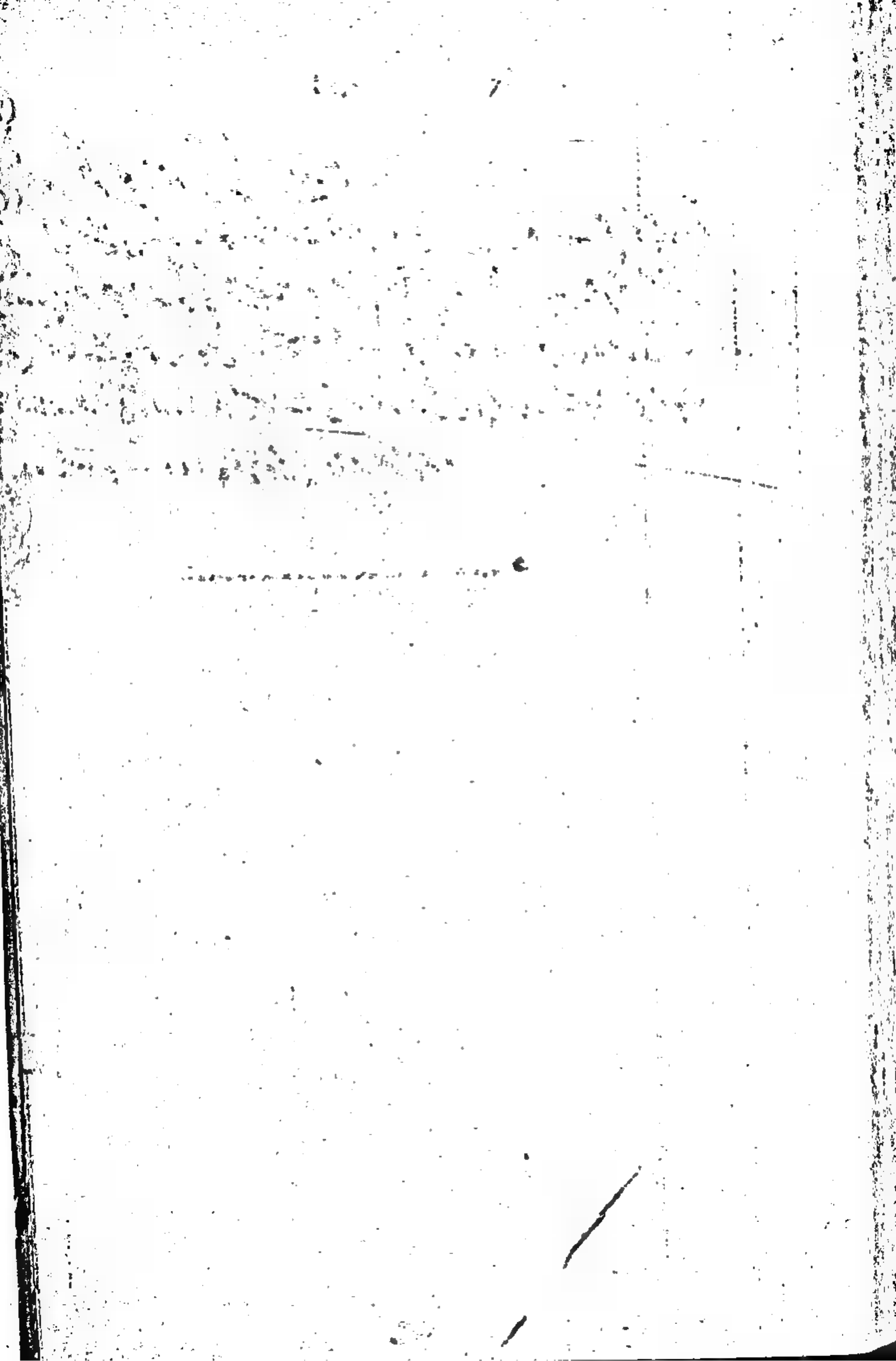
مُعاشرہ

مُعَاشَرَہ

مفہوم مُعاشرہ کے لغوی معنی ہیں آپس میں مل جُل کر زندگی گزارنا۔ اصطلاح میں مُعاشرہ اس اجتماع کا نام ہے جس کے سامنے کوئی مقصد ہو۔ ریوڑ کے گلہ کو معاشرہ نہیں کہا جا سکتا۔

انسانوں کا وہ گروہ یا ہجوم جو بغیر کسی مقصد کے اکٹھا ہو گیا ہو ہم اسے معاشرہ نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً ریوڑ کے گلہ کو معاشرہ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ریوڑ کے جانوروں کے سامنے کوئی اجتماعی مقصد نہیں ہوتا۔

اہمیت معاشرہ کا قیام انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ انسان مدنی الطبع ہے۔ اس کی جبلت اسے مجبور کرتی ہے کہ دیگر انسانوں کے ساتھ مل کر رہے۔ اس جبلت میں انسان کے ساتھ کئی حیوان بھی شریک ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ حیوان محض اندھی جبلت اور طبیعت کی بے اختیار خواہش سے اکٹھے ہوتے ہیں۔ لیکن انسان محض طبعاً ہی ملاپ نہیں کرتا بلکہ اس ملاپ میں اس کے سامنے ایک مقصد اور نصب العین بھی ہوتا ہے۔

اسلام معاشرہ کی اہمیت پر بہت زور دیتا ہے۔ رہبانیت اور غار نشینی کو خلاف فطرت اور ممنوع قرار دیتا ہے۔ اسلام اس حقیقت کو سامنے رکھتا

ہے کہ انسان اپنی صلاحیتوں کو صرف معاشرہ ہی میں رہ کر بروئے کار لا سکتا ہے۔ اگر وہ معاشرہ سے کٹ جائے تو اس کا ذوقِ نمو فنا ہو جاتا ہے اور اس کے لئے روحانی اور مادی دونوں لحاظ سے ترقی کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔

جو چیز انسان کی طبعی خواہشوں اور فطری حوائج میں داخل ہو اس کی اہمیت پر زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کا صحیح اور صالح قیام کس طرح عمل میں لایا جائے۔ اس کے لئے سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ اس سے غرض اور مقصود کیا ہے۔

مقصد معاشرہ کے مقصد کے بارے میں اس وقت دو مختلف اور متضاد نظریے دنیا میں کارفرما ہیں۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ معاشرہ کا مقصد اس کی اجتماعی بہبود ہے۔ دوسرا نظریہ یہ بتاتا ہے کہ معاشرہ محض ایک بناوٹی چیز ہے، اس کا اصل مقصود فرد کی بہبود ہے۔ ایک نظریہ فرد کا طرف دار ہے اور دوسرا معاشرہ کا۔ دونوں نظریوں کے حامی اس وقت نہ صرف زبان و قلم کی جنگ کر رہے ہیں بلکہ جنگ کے لئے بھی پر تول رہے ہیں۔

اسلام ان دونوں نظریوں میں سے کسی کا بھی روادار نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ معاشرہ کا مقصود نہ تو خود معاشرہ ہے اور نہ اس کا مطلوب فرد ہے۔ بلکہ اس کا مقصود اللہ تعالیٰ کی بندگی ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ٥

(اور میں نے جن و انس کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے)

معاشرہ کا مقصود فقط یہ ہے کہ انسان اللہ تعالےٰ کے ارضی خلیفہ کی حیثیت میں اس کے احکام بجالائے۔ معاشرہ ہو یا فرد، اس کی حیثیت محض ثانوی ہے۔ اللہ تعالےٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جو احکام صادر فرمائے ہیں اُن سے فرد اور معاشرہ کے باہمی تعلق کا از خود فیصلہ ہو جاتا ہے۔ ان احکام پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام فرد یا معاشرہ میں سے کسی ایک کو دوسرے پر مطلق ترجیح نہیں دیتا بلکہ دونوں میں اعتدال اور توازن قائم کرتا ہے۔ کبھی فرد معاشرہ پر اپنی زندگی نثار کرتا ہے اور کبھی معاشرہ فرد کے لئے ہر قربانی دینے کو آمادہ ہو جاتا ہے۔

اسلامی معاشرہ کے اوصاف

اسلامی معاشرہ کی مندرجہ ذیل غیر منفک صفات ہیں:

(۱) استحکام۔
(۲) عوامیت۔
(۳) سادگی۔
(۴) وضعداری۔
(۵) ہمدردی۔
(۶) بے کار مشاغل سے اجتناب۔

ذیل میں ہم ان کا فرداً فرداً ایک حد تک تفصیلی جائزہ لیں گے:۔

۱۔ استحکام:

وہی معاشرہ مفید ہو سکتا ہے جو نہایت پختہ ہو۔ اس کے افراد میں قریبی تعلق ہو۔ ایک دوسرے کے نفع و نقصان اور دکھ سکھ میں شریک

ہوں۔ کوئی فرد کسی کی تباہی میں اپنی بربادی کے سامان تلاش نہ کرے۔ بلکہ معاشرہ کے سب افراد کے اذہان میں یہ عقیدہ جاگزیں ہو کہ ایک کا عروج دوسرے کا عروج اور ایک کی پستی دوسرے کی پستی ہے۔

معاشرہ کے استحکام کے لئے اس کی دو لازمی شرطیں ہیں:

وحدتِ فکر۔
وحدتِ عمل۔

جس معاشرہ میں دو چیزیں نہ ہوں وہ انتشار اور پراگندگی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ان کے درمیان مکمل ہم آہنگی ہونی چاہیے

اسلام فکر کی جو وحدت پیش کرتا ہے وہ کوئی اور مذہبی یا سیاسی نظریہ پیش نہیں کرتا۔ اس فکری وحدت کی بنیاد ایمان ہے: اللہ تعالےٰ پر ایمان، فرشتوں پر ایمان، اللہ کی کتابوں پر ایمان، اس کے رسولوں پر ایمان اور یوم آخر پر ایمان، یہ پانچ عقائد ہر سچے مسلمان کے دل میں راسخ ہوتے ہیں۔ ان کی بنیاد پر ہر فرد اپنی ذہنی دنیا تعمیر کرتا ہے۔ چونکہ بنیاد ایک ہے اس لئے اختلاف کا امکان بہت کم ہوگا۔ ادنےٰ اختلاف کی اسلام میں اجازت ہے۔ لیکن جہاں خیالات کی خلیج زیادہ وسیع ہونے لگے وہاں اسلام کی تعلیمات اس کو روکنے کے لئے موجود ہوتی ہیں۔ جس قوم کا ایک خدا، ایک قرآن، ایک نبی، ایک قبلہ اور ایک شریعت ہے اس میں فکر کی دوئی اور انتشار کا پیدا ہونا مشکل ہے۔

اس میں روح و مادہ کا حسین امتزاج رہے گا۔

وحدتِ فکر کے بعد وحدتِ عمل کا درجہ آتا ہے۔ وحدتِ عمل کے لئے سب سے پہلے ارکانِ اسلام بنیاد تیار کرتے ہیں۔ اس بنیاد پر عمل کی عمارت کھڑی کرنے کے لئے اصولی احکام اللہ تعالےٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

ارشاد فرما دیئے ہیں۔ اس لئے اختلاف کی گنجائش کم رہ جاتی ہے۔ البتہ بعض لوگ ان احکام کی خلاف ورزی کے مرتکب ہو کر معاشرہ میں رخنے پیدا کرتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں مجرم ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان کے اعمال کو دیکھ کر خود ان پر تو ہم منافقت کا حکم نہیں لگا سکتے لیکن ان کے اعمال کے بارے میں ضرور کہہ سکتے ہیں کہ یہ منافقانہ اعمال ہیں۔

اسلام اپنے پیروؤں کے فکر و عمل کو بیڑیاں نہیں پہناتا۔ اصول کی پابندی ضرور لگاتا ہے۔ لیکن فروع میں آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ بشرطیکہ فروع اصول کے منافی نہ ہوں۔ معاشرہ میں جو رسم و رواج راہ پا جائے اسلام اس کو منظور کر لیتا ہے بشرطیکہ وہ اسلامی اصول کی روح سے بغاوت نہ کرتا ہو۔

جس طرح قانون شکنی کا انسداد ضروری ہے اسی طرح معاشرہ کی آداب شکنی کا انسداد بھی لابدی ہے۔ معاشرہ، منظم، متحد اور مضبوط ہو تو اس کے قواعد کی خلاف ورزی کی جرأت کرنا مشکل ہے۔ صرف ہم نشینی بند کرنے سے ہی بڑے بڑے سرکش افراد گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔ اگر معاشرہ میں وحدتِ فکر اور وحدتِ عمل نہ ہو تو اس میں اتحاد اور تنظیم تلاش کرنا بے کار ہوگا۔

۲۔ عوامیت:

اسلامی سوسائٹی کے طور طریقے اور ساز و سامان ایسے ہونے چاہییں کہ غرباء ان میں بار پاتے ہوئے جھجک نہ جائیں۔ جس معاشرہ میں دولت مندوں کا بالکل ایک جدا طبقہ قائم ہو جائے اور عوام کو الگ دھکیل دیا جائے اس میں بہت جلد ضعف پیدا ہو جاتا ہے ایک دفعہ مکہ

کے ایک رئیس نے حضرت عمرؓ کی دعوت کی۔ کھانا چُنا گیا تو نوکر الگ کھڑے ہو گئے۔ حضرت عمرؓ بہت ناراض ہوئے اور فرمایا، اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو سمجھے جو نوکروں کو ساتھ بٹھاتے میں عار جانتے ہیں۔ حضرت معاویہؓ کا طریقہ تھا کہ سائلوں کو کھانے کے وقت بُلاتے تھے اور اُنھیں دسترخوان پر بٹھا کر ان کی معروضات سُنتے تھے۔ حضرت عمرؓ اور حضرت معاویہؓ کی پیروی میں اگر نوکروں اور سائلوں کو دسترخوان پر بٹھانا مشکل ہی ہو تو کم از کم اپنی سوسائٹی کو اس قدر پُرتصنع نہ کیا جائے کہ غریب اجنبی کے قدم ہیبت سے لڑکھڑا جائیں۔ احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ کھانے پینے کی وہ مجلس جس کا دروازہ غریبوں پر بند ہو سب سے بڑھ کر شر انگیز مجلس ہوتی ہے۔

اسلام اپنے دولت مند پیرووں سے یہ توقع رکھتا ہے کہ ان کی مجلس ایسی ہو کہ ایک غریب آدمی بھی اسے اپنی مجلس سمجھے۔ یہ مجلس مسلمان تو ایک طرف غیر مسلم کے سامنے بھی دیوار بن کر کھڑی نہ ہو۔ اسلامی معاشرہ کو ہر مذہب و ملت کے فرد کے لئے رحمت کی آغوش ہونا چاہیے۔

۲۔ سادگی :

انسانی فطرت کا ورق بہت سادہ ہے۔ طبع انسانی کی سچی اور دیرپا سازگاری اسی معیشت سے ہوتی ہے جو تکلّف سے ملوث نہ ہو۔ سادہ زندگی نئے نئے مطالبے نہیں کرتی۔ نمائشی اور آرائشی زندگی ہر آن نئے نئے کھلونوں کے لئے مچلتی ہے۔ نئے سے نیا مسئلہ اُٹھاتی ہے۔ انسان فالتو مسئلوں کی فکر میں لگ جاتا ہے اور انسانیت کا اصل

مشکل دل سے اُتر جاتا ہے۔

ہم جوں جوں تکلفات بڑھائیں گے ان کو برقرار رکھنے اور نباہنے کے لئے نئے تکلفات کی ضرورت ہوگی۔ اخراجات روز افزوں ہوں گے۔ پریشانیاں ہجوم کریں گی۔ دولت کی طلب زور پکڑتی رہے گی۔ مزید دولت پیدا ہوگی بھی تو اپنے جلو میں نئی ضرورتوں کو لیتی آئے گی۔ جو ثروت اپنے کندھے پر نئی احتیاجوں کو اُٹھاتی لائے وہ تباہی کی نقیب ہوتی ہے۔

معاشرے کے ہر فرد کو دُوسرے فرد کا خیال رہنا چاہیے۔ مسلمان بھائیوں کے دُکھ کو بھول کر اپنی خوشی میں کھو جانا اسلامی معاشرہ کا آئین نہیں۔ ایسے سامان بے شک ناگزیر ہیں جن سے انسانی ترقی میں مدد ملتی ہے۔ لیکن جب کہ سینکڑوں بھائیوں کو تن ڈھانپنے کو کپڑا نہ ملتا ہو اینٹوں اور پتھروں کو کپڑا پہنا کر اپنی شان بڑھانا اور اسے تمدن کا کمال اور تہذیب کا جزو سمجھنا اسلام کی نگاہ میں حرام ہے۔

۴۔ وضع داری:

اسلامی معاشرہ میں آفاقی رنگ ہوتا ہے تاہم اس کو دیگر معاشروں سے امتیاز حاصل ہے۔ اس کی افادیت پر اسلامیات کی چھاپ ہوتی ہے۔

اسلام کے امتیازی آداب وخصائص ہیں۔ وہ اسلامی معاشرہ کو ایک خاص وضع عطا کرتے ہیں۔ اُٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، گفتگو

اور لباس وغیرہ کے بارے میں اسلام نے خاص ہدایات دی ہیں جن سے کڑی پابندیاں تو عائد نہیں ہوتیں لیکن زندگی میں ایک ایسا اسلوب پیدا ہو جاتا ہے کہ ہر دیکھنے والا شخص مسلمان کو پہچان جاتا ہے۔

ہر قوم کے معاشرتی خصائص ہوتے ہیں جن سے قومی خودی اور خودداری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ ملی حمیت زندہ رہتی ہے اور احساس قومیت مضبوط رہتا ہے۔

قومی وضع داری کا ایک اور بہت عظیم فائدہ یہ ہے کہ ماضی سے تسلسل باقی رہتا ہے۔ اسلام کا نہایت شاندار ماضی ہے۔ اسلام نے معاشرت اور ثقافت میں ساری دنیا کی رہنمائی کی ہے۔ ہمیں اس ماضی سے لاتعلق نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ہم نے اپنے پاکیزہ اور پُرشکوہ ماضی سے رشتہ توڑ لیا تو ہم اپنا مقام ہمیشہ کے لئے گم کر بیٹھیں گے۔

۵۔ ہمدردی:

ہر مسلمان دوسرے مسلمان کو بھائی سمجھتا ہے اور اس سے ہمدردانہ میل ملاپ رکھتا ہے۔ بناوٹی روابط اور منافقانہ سلوک قوم کی زندگی کو گھن کی طرح کھا جاتے ہیں۔ مسلمانوں کو ایک دوسرے سے ہمدردانہ تعاون کرنا چاہیے۔ مشکل میں ایک دوسرے کے کام آئیں اور وقت پڑنے پر ایثار کا ثبوت دیں۔

۶۔ بے کار مشاغل سے اجتناب:

ہر معاشرہ میں ایک بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے افراد فرصت

کے لمحات کو کیسے بسر کریں۔ اس کے لئے لوگوں نے تفریح کے مختلف مشاغل سوچ رکھے ہوتے ہیں۔ اسلام تفریح پر پابندیاں نہیں لگاتا۔ لیکن ایسے مشاغل سے منع کرتا ہے جن میں دین و دنیا کا نقصان ہو۔

فرصت کے مشاغل ایسے ہونے چاہییں کہ طبیعت کو فرحت بھی ہو اور انفرادی یا قومی لحاظ سے فائدہ بھی نمودار ہو۔

اقارب

(رشتہ دار)

اہمیت رشتہ داری فطری چیز ہے:

اسلام ہمیں سب سچے مسلمانوں سے قلبی تعلق رکھنے کا حکم دیتا ہے ۔ لیکن ساتھ ہی فطری محبت کو بھی ملحوظ رکھتا ہے اور قربت کے لحاظ سے درجہ بدرجہ حقوق قائم کرتا ہے ۔ اقارب یعنی رشتہ داروں کے حقوق اوروں پر فائز ہیں۔

رشتہ داروں سے انسان کو طبعی محبت ہوتی ہے۔ اگر کبھی ناراضی پیدا ہو بھی جائے تو اس کو دُور کرنے کا ہمیشہ قوی امکان رہتا ہے۔ اس لئے رشتہ داروں کے ساتھ جو معاشرت قائم ہوتی ہے وہ نہایت مضبوط ہوتی ہے۔

رشتہ داری زندگی کی قوت ہے:

جس جاں نثاری کا ثبوت رشتہ دار دیتے ہیں اس کی توقع اوروں سے مشکل ہے۔ ایک مستحکم برادری والے انسان کا دل بہت مضبوط رہتا ہے۔ اسے علم ہوتا ہے کہ مصیبت کے وقت رشتہ دار ہر ممکن قربانی کریں گے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اپنے بھائی

اور عم زادے کے دم سے (اکیلا) آدمی کثیر ہوتا ہے۔[1] آئے دن کی زندگی میں رشتہ دار اس کا ہاتھ بٹاتے ہیں اور اس کی زندگی کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں۔ رشتہ داروں کی موجودگی میں پریشانیاں حتی الوسع قریب نہیں آتیں۔ انسان کے ذہنی اور بدنی قویٰ محفوظ رہتے ہیں اور عمر میں اضافہ ہوتا ہے۔ فطرت کے نباضِ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قرابت نوازی عمر کو بڑھاتی ہے۔

رشتہ داری سے تعمیری منصوبے کامیاب ہوتے ہیں:

مستحکم رشتہ داری ایک عظیم قوت ہے جس سے بہت بڑے بڑے کام لئے جا سکتے ہیں۔ رشتہ داروں کے سامنے جب کوئی فلاح وبہبود کا منصوبہ آتا ہے تو وہ نہایت ایثار اور تن دہی کے ساتھ اسے انجام پذیر کرتے ہیں۔ خاندان کا سربراہ اس منصوبہ کو ہاتھ میں لے لیتا ہے اگر رقم کی ضرورت ہو تو سب اپنا اپنا حصہ خوشی سے ادا کرتے ہیں۔ اگر چند آدمی ادا نہ کر سکیں تو منصوبہ ملتوی نہیں ہوتا بلکہ صاحبِ مقدور رشتہ دار اُن کا حصہ ادا کر دیتے ہیں اور حساب بعد میں بے باق ہو جاتا ہے۔ چونکہ ہر شخص کو صرف اپنی ہی نہیں اپنے رشتہ داروں کی بھلائی بھی منظور ہوتی ہے اس لئے وہ دل لگا کر کام کرتا ہے۔ مکان بنانے ہوں، کنوئیں کھودنے ہوں، کھیت آباد کرنے ہوں، جہاں رشتہ داروں کا تعاون ہو وہاں توقع سے بڑھ کر کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

> قرابت نوازی، حسنِ خلق اور خوشگوار ہمسائیگی سے بستیاں آباد ہوتی ہیں اور عمریں دراز ہوتی ہیں۔[1] جس نیکی کا سب سے جلد ثواب ملتا ہے۔

---

[1] کنز الاعمال جلد ۸

وہ صلۂ رحم (قرابت) ہے، حتیٰ کہ اس خاندان والے فاجر بھی ہوں تو ان کے اموال نمو پذیر ہوتے ہیں اور ان کی تعداد بڑھتی ہے اور کوئی خاندان ایسا نہیں کہ اس کے اندر اتحاد ہو اور اس کو احتیاج آئے[1]

قرابت رحمتِ خداوندی کا مظہر ہے:

اللہ تعالےٰ نے رشتۂ قرابت میں اپنی رحمت اور برکت ودیعت کر دی ہے۔ اللہ تعالےٰ کی برکتوں کی ایک سبیل یہ مقدس رشتہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان بندوں سے خوش ہوتا ہے جو رشتہ داری کو مٹنے نہیں دیتے۔ وہ ان پر اپنی رحمتوں کا نزول کرتا ہے۔ ان کی زندگی کے سارے رخنے دُور کر دیتا ہے اور ان کے ٹوٹے ہوئے دل جوڑ دیتا ہے۔ جنابِ ہادیِ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

رحم (قرابت) کی اصل رحمٰن ہے۔ جس نے اسے جوڑا اللہ تعالےٰ اس کی شکستگی مٹاتا ہے۔ جس نے اسے شکستہ کیا، اللہ تعالےٰ اسے شکستہ حال کر دیتا ہے[2]

جو آدمی چاہتا ہے کہ اس کی عمر بڑھے، رزق کشادہ ہو، بُری موت سے بچے اور اس کی دعا مقبول ہو اسے چاہیے کہ رشتۂ قرابت کو جوڑے[3]

رشتۂ قرابت کو سالم رکھنے کی تاکید:

قرابت داری ایک فطری چیز ہے۔ اس کے بے شمار فوائد ہیں۔ اس سے

---

[1] کنز العمال جلد ۲ [2] کنز العمال (اکمال) جلد ۲ [3] کنز العمال (اکمال) جلد ۲

قرآن اور حدیث میں قرابت کو بحال رکھنے کی بہت تاکید آئی ہے۔ سُورۃُ الرَّعْدِ میں اللہ تعالیٰ نے عقلمندوں کی ایک صفت یہ بتائی ہے کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے ملانے کا حکم دیا ہے اسے ملاتے ہیں یعنی وہ قرابت کو توڑتے نہیں بلکہ سالم اور قائم رکھتے ہیں۔

ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رشتہ داری کے استحکام کے لئے نہایت تاکیدی ارشادات فرمائے ہیں۔ مثلاً

جو آدمی اللہ تعالیٰ پر اور یومِ آخر پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ رشتۂ قرابت کو پیوستہ رکھے[1]

اللہ تعالیٰ کے نزدیک توحید کے بعد محبوب ترین عمل رشتۂ قرابت کا جوڑنا ہے[2]

قریبی رشتہ داروں کا تو اکثر لوگوں کو خیال رہتا ہی ہے لیکن دُور کے رشتہ داروں کو لوگ دل سے اتار دیتے ہیں۔ حضورؐ نے ان کے بارے میں بھی تاکید فرمائی ہے کہ اپنے انساب یاد رکھو تاکہ تمھاری قرابت داری بحال رہے[3]

اقارب کی دل جوئی کسی حال میں نظر انداز کرنی چاہیے۔ جو آدمی اپنے رشتہ دار سے محبت کی گرمی کم کرتا ہے وہ بہت بڑی کوتاہی کا مرتکب ہوتا ہے۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اپنی قرابت کو تازہ کرتے رہو چاہے سلام کے ذریعے ہی ہو[4] مراد یہ ہے کہ اور کوئی خدمت انجام نہ دے سکو تو بوقت ملاقات سلام کر کے ہی قرابت داری کی یاد زندہ کرتے رہو۔

---

[1] ریاض الصالحین باب اکرام الضیف [2] کنز العمال جلد ۲۔
[3] کنز العمال جلد ۸ [4] ایضاً

بدخواہ رشتہ داروں سے حُسنِ سلوک:

بارہا ایسے رشتہ داروں سے پالا پڑجاتا ہے جن کے دل محبت سے خالی ہو
ہیں۔ ان سے سوائے کینہ کے اور کچھ ظاہر نہیں ہوتا۔ ایسے رشتہ دار بے شک
پریشانی اور ملال کا باعث ہوتے ہیں۔ لیکن یہی لوگ اللہ تعالےٰ کی خوشنودی حاصل
کرنے کا موقع بھی مہیا کر دیتے ہیں۔ ان کی کینہ توزی اور شرانگیزی کا تحمل
کرکے ان کے ساتھ حسن سلوک رکھا جائے تو اس کے عوض بے کنار اجر ملتا ہے
احادیث میں ان کے ساتھ تعلقات جوڑے رکھنے کی نہایت تاکید ہے۔

ایک شخص آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا ا
عرض کی کہ میرے کچھ رشتہ دار ہیں۔ ان میں سے تعلق رکھنا چاہتا ہوں اور و
توڑتے ہیں۔ میں ان سے بھلائی کرتا ہوں اور میرے ساتھ برائی کرتے ہیں
میں ان سے حلم کرتا ہوں اور وہ سختی کرتے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا! اگر تم ویسے
ہی ہو جیسا کہ بتا رہے ہو تو جب تک اس حال پہ رہو گے اللہ تعالےٰ کی طرف
سے ایک فرشتہ تمھاری مدد پر مامور رہے گا۔[۱]

قرابت ختم کرنے کی سزا:

جو آدمی قرابت ختم کرتا ہے وہ اللہ تعالےٰ کے غضب کا حق دار ہوتا ہے
جنابِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:
(۱) قرابت قطع کرنے والے کا عمل قبول نہیں ہوتا۔[۲]

---

[۱] ریاض الصالحین باب بّر الوالدین۔ [۲] کنز العمال جلد ۸۔

(۲) قاطعِ قرابت جنّت میں داخل نہیں ہوگا[1]

ایک روز آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجلس میں فرمایا کہ ہم میں اس وقت جو قاطعِ قرابت ہے وہ اُٹھ جائے۔ ایک نوجوان اُٹھ کر چلا گیا۔ اس کی اپنی خالہ سے کچھ بدمزگی تھی۔ اس کے پاس حاضر ہوا اور مصالحت کر کے واپس آیا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ جن لوگوں میں کوئی قاطعِ قرابت ہو ان پر رحمت نازل نہیں ہوتی[2]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قرابت دار :

جناب ہادیِ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب اسلام کی دعوت کا آغاز کیا تو آپؐ کو اپنے خاندان کے سامنے خصوصیت سے تبلیغ کرنے کا حکم ہوا۔ گرچہ آپؐ کا ایک چچا ابولہب آخر تک آپؐ کا دشمن رہا لیکن دیگر چچاؤں اور ان کی اولاد نے آپؐ کی حفاظت کے لئے جانیں وقف کر دیں حالانکہ ان میں سے سب افراد اس وقت اسلام نہیں لے آئے تھے۔ شعب ابی طالب کے تین سال کے محاصرہ میں آپؐ کے خاندان نے آپؐ کے ہمراہ نہایت سخت مشکلیں اُٹھائیں۔ آپؐ کے خاندان نے آپؐ کے لئے بہت مالی ایثار کئے۔ حضرت ابوطالب نے تو اپنی ساری تجارت محض آپؐ کی حفاظت کے فکر میں ضائع جانے دی۔ اللہ تعالیٰ نے ان قربانیوں کو قبول فرمایا اور مالِ غنیمت میں حضورؐ کے قرابت داروں کا حصہ مقرر کیا۔

جناب ہادیِ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت کی کس قدر عظیم خدمت انجام

---

[1] ایضاً [2] ایضاً۔

دی لیکن کسی سے کوئی اجر سوائے اس کے طلب نہیں کیا کہ میرے قرابت دار
سے محبت رکھنا۔ قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی
(اے نبی کہہ دیجئے کہ میں اس کے عوض اپنے قرابت داروں کے لئے محبت کے سوا
کچھ اجر نہیں چاہتا)۔ اس محبت کا مطالبہ وحی الٰہی سے ہوا یقیناً جناب رسالت
مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے عدیم المثال محبت اور قربانی کا ثبوت دیا
اللہ تعالیٰ نے ان میں سے اسلام لانے والوں کی محبت کو اہل اسلام کے لئے
جزوِ ایمان قرار دیا۔

حقوق | سب رشتہ دار حُسنِ سلوک کے حق دار ہیں:

مسلمانوں کے حُسنِ سلوک کے مستحق ان کے سب رشتہ دار ہیں
چاہے وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم لیکن سب کے حقوق یکساں نہیں
جو حقوق مسلم رشتہ داروں کے ہیں وہ کافر رشتہ داروں کے نہیں ہو سکتے۔ غیر مسلم
رشتہ داروں کو قلبی رفیق نہیں بنایا جا سکتا لیکن ان کو حاجت ہو تو حتی الوسع مدد
کی جائے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک بار اپنے غیر مسلم
رشتہ داروں کے بارے میں فرمایا کہ فلاں لوگ میرے قلبی رفیق نہیں۔ میرا قلبی
رفیق اللہ تعالیٰ ہے اور نیک مسلمان۔ البتہ ان غیر مسلم اقرباء کے ساتھ میرا
خون کا رشتہ ہے۔ میں اسے بھلائی کے ساتھ تازہ رکھوں گا۔[1]

مسلم رشتہ داروں میں فرقِ مدارج،

مسلمان رشتہ داروں کے حقوق میں بھی فرق ہے جس کا تعلق زیادہ قرابت

---

[1] ریاض الصالحین باب بر الوالدین .....

ہے وہ حسنِ سلوک کا زیادہ حق دار ہے۔ ایک دفعہ ایک صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ میں کس سے بھلائی کروں؟ حضورؐ نے فرمایا، اپنی ماں سے اور باپ سے اور بھائی سے اور پھر اس کے بعد درجہ بدرجہ اور رشتہ داروں سے۔ [۱]

وسعت:

رشتہ داروں کے حقوق نہایت وسیع ہیں۔ ان کا شمار ناممکن ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ

(الحشر)

(اور چاہے وہ خود فاقہ سے رہیں وہ انھیں اپنے پر ترجیح دیتے ہیں)

یہ آیت اگرچہ انصار کے بارے میں ہے کہ انھوں نے مہاجرین کے ساتھ کیسی جاں نثارانہ روش اختیار کی لیکن اس سے ہمارے سامنے اخلاق کا ایک عام معیار بھی قائم ہو جاتا ہے۔ ہمیں رشتہ داروں سے حتی الوسع انتہائی قربانی کا سلوک کرنا چاہیے۔ ان کی مادی اور روحانی ہر لحاظ سے مدد مطلوب ہے۔ اگر ان کو کوئی حاجت پیش آجائے تو اسے روا کیا جائے۔ وہ رنج یا پریشانی میں مبتلا ہوں تو ان کی دستگیری کرنی چاہیے۔ اگر وہ پس ماندہ ہوں تو انھیں ترقی کی راہ پر چلایا جائے۔ کوئی آدمی ان کی جان، مال یا آبرو پر حملہ آور ہو تو ان کی حفاظت میں جان پر کھیل جانا چاہیے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

---

[۱] زاد المعاد جلد ۲ ص ۳۵۔

کا ارشاد ہے:-

تم میں بہترین آدمی وہ نیکوکار شخص ہے جو اپنے خاندان کی مدافعت کرتا ہے۔[1]

مالی مدد:

غریب رشتہ داروں کی مالی مدد واجب ہوتی ہے۔ والدین، اولاد، دادا اور پوتا کا نفقہ چاہے وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم واجب ہے۔ ان کے بعد جو اقارب آتے ہیں ان کے نفقہ کے واجب ہونے کے لئے اتحادِ دین ضروری ہے۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں ایک غریب بچہ تھا۔ اس کے چچیرے بھائی اس کو خرچ نہیں دیتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے انھیں قید میں ڈال دیا۔ ایک ایک دفعہ ایک یتیم کا سرپرست حضرت عمرؓ کے پاس حاضر ہوا۔ آپ نے اسے یتیم پر خرچ کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ اگر مجھے اس کا کوئی ایسا رشتہ دار ملتا جس سے اس کا بعید ترین تعلق ہو تو جب بھی میں اُس پر اس کا نفقہ لازم قرار دیتا۔[2]

رشتہ داروں پر خرچ کرنے کا دوہرا ثواب ملتا ہے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ رشتہ دار پر مالی خرچ کرنے کا دوہرا اجر ہے۔ ایک تو صدقہ کا اور دوسرے رشتہ داری کا۔[3]

ایک صحابی حضرت ابو طلحہؓ نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ میری فلاں جائداد اللہ تعالیٰ کی راہ میں وقف ہے۔

---

[1] مشکوٰۃ ابواب البر والصلۃ - [2] زاد المعاد ج ۲

[3] ریاض الصالحین باب بر الوالدین . . . . .

آپؐ اسے جہاں چاہیں خرچ کریں۔ حضورؐ نے فرمایا، یہ بہت کثیر شے ہے میری رائے ہے کہ اسے اقرباء کو دے دو۔ حضرت ابوطلحہؓ نے رشتہ داروں پر بانٹ دی[1]

رُوحانی مدد:

رشتہ داروں کو نیکی کی تبلیغ کی جائے۔ بُرائی سے روکا جائے۔ خدمتِ دین کی طرف مائل کیا جائے۔ اگر وہ گناہ کے ماحول میں گھر جائیں تو اس ماحول کو رفع کرنے میں ان کی مدد کرنی چاہیے۔

اقرباء پرستی کی حد

اقرباء پرستی نہایت قابلِ تعریف جذبہ ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی رشتہ داروں کی خاطر جائز و ناجائز کی تمیز ہی اٹھا دے، ہر غلط بات میں بھی ان کا ساتھ دے اور جب بھی موقع ملے قوم کی دولت اور بلند مناصب ان کے حوالے کردے۔ یہ تعصب ہے جس کی اسلام میں سخت ممانعت ہے۔ ایک دفعہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کسی نے پوچھا کہ کیا اپنے خاندان سے محبت رکھنا تعصب میں داخل ہے؟ حضورؐ نے فرمایا۔ نہیں۔ تعصب یہ ہے کہ تو اپنے خاندان کی بے انصافی میں مدد کرے[2]

جو لوگ کنبہ برداری کو دین پر ترجیح دیتے ہیں انھیں اللہ تعالیٰ عذاب کی دھمکی دیتا ہے (سورۂ توبہ)

رشتہ داری اور خاندان بندی سے اللہ تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ

---

[1] ریاض الصالحین باب برالوالدین ... [2] مشکٰوۃ ابواب البر والصلۃ

رابطہ و محبت کا وسیلہ ہو نہ کہ ایک دوسرے کے خلاف گروہ آرائی کی جائے۔
اسلام میں قبیلہ و خاندان پر فخر کرنے کی اجازت نہیں۔ سورۃ الحجرات میں
اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ ہم نے تمہیں ذاتوں اور قبیلوں میں اس لئے تقسیم کیا
ہے کہ تمہیں ایک دوسرے کی پہچان ہو تم میں سے اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے
زیادہ آبرومند وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

ہمسایہ

مفہوم ہمسائیگی کی حد اپنے مکان سے چاروں طرف چالیس گھر تک ہے[1]
سورۃ النساء سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دائرہ میں خویش و بے گانہ
اور مسلم و غیر مسلم سب شامل ہیں۔

ہمسائگی کے مدارج میں اقربیت کے لحاظ سے فرق ہے۔ آں حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کافر ہمسایہ کا ایک حق، مسلمان کے دو اور قرابت دار کے تین ہیں[2] اگر یہ تفریق نہ ہو تو پھر جس کا گھر جتنا قریب تر ہوگا اس کا حق اسی قدر زیادہ ہوگا۔ حضرتِ عائشہؓ نے ایک دفعہ آں حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے استفسار کیا کہ میرے دو پڑوسی ہوں اور ہدیہ بھیجنا چاہوں تو کس کو بھیجوں۔ فرمایا جس کا گھر قریب تر ہو[3]

اہمیت پڑوس کی اہمیت اخلاقی نقطۂ نگاہ ہی سے نہیں بلکہ معاشرتی ضروریات کے نقطۂ نگاہ سے بھی واضح ہوتی ہے۔ ہم سایہ کے ساتھ ہمدردانہ راہ و رسم ناگزیر ہے۔ وہ ہر وقت کا شریکِ رنج و راحت ہوتا ہے اور اگر بالفرض ایسا نہ ہو تو عین ممکن ہے کہ کسی وقت شر یا مصیبت کا باعث

---

[1] جمع الفوائد [2] اسعد ترجمہ کیمیائے سعادت رکن دوم اصل پنجم [3] بخاری باب حق الجوار فی قرب الابواب۔

بن جائے۔ نفع یا ضرر ان دونوں میں سے کسی ایک چیز کا احتمال ہمسایہ سے ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس کے ساتھ ایسے روابط برپا رکھے جائیں کہ ضرر کا سدِباب ہو اور نفع بہم پہنچ سکے۔ عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ پڑوس کے تخریبی پہلو سے بچ کر اس کے تعمیری پہلو سے فائدہ اٹھایا جائے۔

حقوق

(ا) سرسری جائزہ:

ہمسایہ کے حقوق کا اندازہ مشکل ہے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جبرئیلؑ مجھے ہمسایہ کے بارے میں یہاں تک تاکید کرتے رہے کہ میں سمجھا اسے وارث قرار دینے لگے ہیں[1]

ہمسایہ اگرچہ وارث نہیں ہوتا لیکن اسلامی قانون میں شفعہ کا حق بہت حد تک اسی کو حاصل ہے۔

ہمسایہ سے حسنِ سلوک اور اس کے حقوق کے بجا آوری کے بارہ میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو عمومی ہدایات فرمائی ہیں ان میں سے چند مندرجۂ ذیل ہیں:

تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوگا جب تک وہ اپنے پڑوسی کے لئے بھی وہ چیز عزیز نہ جانے جو اُسے خود عزیز ہے[2]

جو شخص اللہ تعالےٰ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اُسے چاہیے کہ اپنے پڑوسی سے حسنِ سلوک رکھے[3]

اللہ تعالےٰ کے ہاں بہترین ساتھی وہ ہے جو اپنے ساتھیوں کے حق میں

---

[1] بخاری کتاب الادب۔ ترمذی ابواب البر والصلہ [2] مسلم کتاب الایمان

[3] ایضاً۔

بہترین ہے اور بہترین پڑوسی وہ ہے جو اپنے پڑوسیوں کے حق میں بہترین ہے۔[1]

پڑوسی کے حقوق اس قدر گوناگوں ہیں کہ ان کے بجا لانے کے لئے بہت صبر و حوصلہ اور استقامت کی ضرورت ہے۔ جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تمھیں کیا معلوم ہمسایہ کا کیا حق ہے۔ خدا کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے ہمسایہ کے حقوق ادا کرنے کی توفیق اُسے ہی نصیب ہوتی ہے، اللہ تعالےٰ کی رحمت جس کے شاملِ حال ہو۔[1] حضورؐ کی مراد یہ ہے کہ اس گراں بار فریضہ کو اُٹھانا آسان نہیں۔ آدمی اس سے جبھی عہدہ برآ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کی مدد حاصل ہو۔

جو شخص اپنے پڑوسی کا حق ادا نہیں کرتا اگلے جہان میں اس کا پڑوسی اللہ تعالےٰ کے دربار میں اس سے انصاف چاہے گا۔ حدیث ہے کہ قیامت کے روز سب سے پہلے جن کا مقدمہ پیش ہوگا وہ دو ہمسائے ہوں گے۔[3] ارشادِ نبوی ہے کہ قیامت کے دن کتنے ہی پڑوسی اپنے پڑوسیوں کے گلے پڑیں گے اور کہیں گے کہ انھوں نے ہم پر بھلائی کا دروازہ بند کر دیا تھا۔[4]

ہمسایہ کے حقوق کی بجا آوری انسانی اخلاق کی کسوٹی ہے۔ ایک دفعہ صحابہ کرامؓ نے آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا، یا رسول اللہ! ہمیں کیسے معلوم ہو کہ ہمارے اعمال اچھے ہیں یا بُرے۔ فرمایا، جب پڑوسی کو تم اپنی نسبت اچھا کہتے سنو تو سمجھو کہ تمھارے اعمال اچھے ہیں اور جب بُرا

---

[1] ترمذی ابواب البر والصلۃ [2] بخاری کتاب الشفعہ۔ اردو کیمیائے سعادت رکن دوم اصل پنجم [3] اردو ترجمہ کیمیائے سعادت [4] ادب المفرد بخاری صفحہ ۲۵۔

کہتے سنو تو سمجھو کہ تمہارے اعمال برے ہیں [1]

جناب ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں پڑوسی کے مختصراً مندرجۂ ذیل حقوق گنائے ہیں:

تمہاری مدد کا محتاج ہو تو مدد کرو۔

قرض کا حاجت مند ہو تو قرض دو۔

بیمار ہو تو تیمارداری کرو۔

مر جائے تو جنازہ کے ہمراہ جاؤ۔

اس کے رنج و غم کے شریک بنو۔

مکان کی دیوار اتنی بلند نہ کرو کہ اسے رکاوٹ ہو۔

میوہ خریدو اور استطاعت ہو تو اسے بھی بھیجو۔ نہ بھیج سکو تو پوشیدہ رکھو۔ تمہارے بچے میوہ لے کر باہر نہ نکلنے پائیں تاکہ ہمسایہ کے لڑکے رنجیدہ نہ ہوں۔ اپنے باورچی خانہ کے دھوئیں کی اسے تکلیف نہ دو۔ ورنہ اسے کھانا بھیجو [2]

(ب) تجزیہ:

مندرجۂ بالا حقوق کی فہرست کو نگاہ میں رکھا جائے اور قرآن و حدیث پر وسیع نظر ڈالی جائے تو پڑوسی کے حقوق کو ذیل کے عنوانوں کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) مجلسی ادارے۔

(۲) تحائف اور دعوتیں۔

---

[1] سیرت النبی جلد ۶ از سلیمان ندوی بحوالہ ابن ماجہ

[2] اردو ترجمہ کیمیائے سعادت رکن دوم اصل پنجم۔

(۳) تعاون و ایثار۔

(۴) پڑوسی کو ضرر نہ دینا۔

(۵) پڑوسی کے ضرر پر صبر کرنا۔

ذیل میں ان عنوانوں پر ہم قدرے تفصیلی نگاہ ڈالیں گے:۔

(۱) مجلسی ادارے:

محلہ داری کے مجلسی اجتماع کی بنیاد نماز ہے۔ ہر شخص پر واجب ہے کہ وہ محلہ کی مسجد میں با جماعت نماز ادا کرے۔ بغیر عذر کے گھر میں بیٹھ کر نماز پڑھنے کی اجازت نہیں۔ مسجد کی جماعتی نماز کا ایک فائدہ یہ ہے کہ محلہ یا پڑوس کے سب مسلمانوں کو دن میں پانچ بار اکٹھے ہونے کا موقع ملتا ہے۔ ایک دوسرے کے احوال و کوائف اور مجلسی اور انفرادی حوائج سے باخبر ہوتے ہیں تاکہ مل جل کر ایک دوسرے کی تکلیف رفع کر سکیں۔ معاشرہ کو مضبوط کریں اور جماعتی طور پر منزل ترقی کی طرف گامزن ہوں۔

مجلسی اجتماعات کو مسجد تک ہی محدود نہیں کیا جا سکتا۔ محلہ میں ایسے ادارے قائم کیے جائیں جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کریں اور رفاہی کاموں کا بیڑہ اٹھائیں۔

جس طرح گھر کی تنظیم ضروری ہے اسی طرح محلّہ کی تنظیم بھی لازم ہے ورنہ ایک دوسرے کی تعمیری صلاحیتوں سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

(۲) تحائف اور دعوتیں:

محلّہ داری کا دوسرا اہم فریضہ یہ ہے کہ ایک دوسرے کی وقتاً فوقتاً دعوت کی جائے اور تحائف بھیجے جائیں۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

نے تحائف کے باہمی تبادل کو محبت کا ذریعہ قرار دیا ہے۔

آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دفعہ جناب ابوذرؓ سے فرمایا کہ جب تو کچھ پکائے تو شوربا زیادہ بنا اور اس میں سے کچھ اپنے پڑوسیوں کو بھیج[1] آپؐ نے ایک دفعہ مسلمان عورتوں سے خطاب کر کے فرمایا کہ کوئی ہمسائی اپنی ہمسائی کے لئے کوئی ہدیہ حقیر نہ جانے، چاہے یہ بکری کا کھر ہی ہو[2]۔ مراد یہ ہے کہ حسب توفیق گھر میں جو میسر آئے پڑوسن کی خاطر داری کرو۔

ایک دفعہ فاروق اعظمؓ نے دیکھا کہ حضرت جابرؓ کچھ گوشت اٹھائے چلے جاتے ہیں۔ آپؓ نے پوچھا یہ کیا ہے؟ جابرؓ نے جواب دیا کہ اے امیر المومنین گوشت کو بہت جی چاہا تھا۔ اس لئے ایک درہم کا گوشت لایا ہوں۔ فرمایا کیا تم اپنے پڑوسی یا عم زادہ (یعنی عزیز رشتہ دار) کو چھوڑ کر اپنا پیٹ بھرنا چاہتے ہو۔ کیا یہ آیت بھول گئے۔ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا۔ (تم نے دنیوی زندگی ہی میں اپنے مزے لوٹ لئے اور ان کو برت چکے) — یہ خطاب آخرت میں کفار کو ہوگا۔ لیکن اہل اسلام کو بھی اس سے درس لینا چاہیے۔[3]

(۳) تعاون و ایثار

محتاج اور دکھی ہمسایہ کی امداد نہایت ضروری ہے۔ اس سے گریز کرنا منافقانہ حرکت ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ وہ

---

[1] مسلم کتاب البر والصلہ [2] بخاری کتاب الادب، بخاری کتاب الھبہ۔
[3] موطا امام مالک ماجاء فی اکل اللحم۔

شخص مومن نہیں جو خود سیر ہو اور اس کا پڑوسی بھوکا رہے [1] آپ کا فرمان ہے کہ جس شخص نے بھرے ہوئے پیٹ کے ساتھ وفات پائی اور اُس وقت اس کا پڑوسی بھوکا تھا تو سمجھو وہ مجھ پر ایمان نہیں لایا [2]

پڑوسی کی دستگیری سے کسی وقت دریغ نہ کیا جائے چاہے خود نقصان کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔ اس عظیم ذمہ داری کے بجا لانے میں نہایت فراخ دلی، بلند حوصلگی اور ایثار کی ضرورت ہے آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم ہے کہ کوئی شخص اپنی دیوار میں پڑوسی کو کھونٹی گاڑنے سے نہ روکے۔ حضرت ابوہریرہ رض نے یہ حدیث بیان کر کے ان لوگوں کو سخت زجر کیا تھا جن کا عمل اس کے خلاف تھا [3] ظاہر کی نگاہ تو یہی بتائے گی کہ جو شخص دیوار کا مالک ہے اسے حق ہے کہ کسی دوسرے آدمی کو کھونٹی گاڑنے سے منع کرے، مگر اسلام پڑوسی کو اس دیوار پر ہمسائیگی کے واسطے سے کچھ اخلاقی حق ضرور دلواتا ہے۔

اسی نوعیت کا ایک مسئلہ حضرت عمر رض کے عہدِ خلافت میں پیش ہوا۔ دو صحابیوں کا کھیتوں کا پڑوس تھا۔ ان میں سے ایک صاحب ضحاک بن قیس نے دوسرے صحابی محمد بن مسلمہ کے کھیت سے پانی گزار کر اپنے کھیت تک پہنچانا چاہا۔ محمد بن مسلمہ نے انکار کیا۔ قضیہ عدالتِ فاروقی میں پہنچا۔ آپ نے محمد بن مسلمہ سے کہا کہ آپ گزارنے دیں، آپ کے پڑوسی کو بھی فائدہ ہے اور آپ خود بھی اس پانی سے کام لے سکتے ہیں مگر انھوں نے نہ مانا۔ حضرت عمر رض نے پھر اصرار کیا مگر محمد بن مسلمہ اپنی بات پر اڑے رہے۔ آخر جناب عمر رض

---

[1] ادب المفرد بخاری [2] جمع الفوائد [3] بخاری کتاب المظالم

نے کہا کہ خدا کی قسم یہ پانی گزرے گا چاہے تمھارے پیٹ پر سے ہو کر کیوں نہ جائے چنانچہ ان کے کھیت سے نہر گزار دی گئی[1]

(۴) پڑوسی کو ضرر نہ دینا:

پڑوسی کی دل داری کی اسلام میں بہت تاکید ہے۔ ہر ہمسایہ کی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ اس کے ہمسایہ کو دور کے قرینہ سے بھی ناراضی کا موقع نہ ملے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس نے ہمسایہ کے کُتے کو پتھر مارا اس نے ہمسایہ کو دُکھ دیا[2] ایک سابقہ حدیث میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہمسایہ کے لئے رُکاوٹ پیدا ہوتی ہو تو دیوار بلند نہ کی جائے۔ اس کے گھر میں باورچی خانے کا دھواں نہ جانے دیا جائے۔ اور اگر مجبوری ہی ہو تو اس کے گھر کھانا بھیج کر اس کی دل داری کی جائے۔

ایمان کا تقاضا ہے کہ پڑوسی کی ایذا دہی سے پرہیز کی جائے تاجدار انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو آدمی اللہ تعالیٰ پر اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے پڑوسی کو دُکھ نہ دے[3]

ایک بار آپؐ نے تین دفعہ فرمایا کہ خدا کی قسم وہ مومن نہیں، خدا کی قسم وہ مومن نہیں، خدا کی قسم وہ مومن نہیں۔ پوچھا گیا یا رسول اللہ! کون؟ فرمایا، وہ شخص جس کے ضرر سے اس کا پڑوسی مامون نہیں[4]

پڑوسی کو ضرر دینا اس قدر وحشیانہ اور انسانیت سوز حرکت ہے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قیامت کی نشانیوں میں سے

---

[1] موطا جزو چہارم کتاب الاقضیہ [2] اردو ترجمہ کیمیائے سعادت
[3] بخاری کتاب الادب۔ ابوداؤد [4] بخاری کتاب الادب

ایک نشانی یہ بتائی ہے کہ لوگ اپنے پڑوسیوں کو قتل کریں گے[1]

ہمسایہ کی ایذا دہی کی اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت کڑی سزا ہے۔ حدیث شریف ہے کہ چوری حرام ہے مگر دس گھروں کی چوری سے بڑھ کر ہمسایہ کے گھر کی چوری ہے[2]

آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! فلاں عورت کے نماز و روزہ اور خیرات کا بڑا چرچا ہے لیکن اس نے زبان سے پڑوسیوں کو دق کر رکھا ہے۔ فرمایا، یہ آگ میں جائے گی۔ پھر اس نے کہا کہ فلاں عورت کے بارے میں سنتے ہیں کہ نماز روزہ واجبی طور پر ادا کرتی ہے، معمولی کپڑوں کا صدقہ بھی دیتی ہے اور پڑوسیوں کے حق میں بد زبان نہیں۔ فرمایا، وہ جنت میں جائے گی[3]

فتح مصر کے دوران فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے ایک چھاؤنی سے کوچ کا حکم دیا۔ سپاہی خیمے اکھاڑنے لگے تو دیکھا کہ فاتح مصر کے خیمہ پر ایک کبوتری نے آشیانہ بنا کر انڈے دے رکھے ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ کبوتری ہماری ہمسایہ ہے جب تک انڈوں سے بچے نکل کر اڑنے کے قابل نہ ہو جائیں خیمہ کو بحال رہنے دو۔ آپ نے آشیانہ پر ایک محافظ مقرر کیا۔ کچھ دن بعد جب واپس تشریف لائے تو خیمہ کے گرد ایک شہر بسایا جس کا نام فسطاط (خیمہ) رکھا۔ یہ نام آج تک اسلامی ہمسایہ نوازی کی یادگار ہے۔

(۵) پڑوسی کے ضرر پر صبر کرنا:

اسلام پڑوسی پر ستم کرنے ہی کو نہیں روکتا بلکہ حکم دیتا ہے کہ اگر اس سے

---

[1] ادب المفرد ص ۲۶ [2] ادب المفرد بخاری ص ۲۴ [3] جمع الفوائد۔

تکلیف پہنچے تو صبر و تحمل سے کام لو اور حتی الوسع درگزر کرو۔ آغازِ اسلام میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کافر پڑوسی آپؐ کو اس حد تک دِق کرتے کہ آپؐ کے گھر جا کر ہنڈیا میں گندگی ڈال دیتے۔ آپؐ اتنا کہہ کر چپ رہ جاتے، "اے عبد مناف! یہ کیا پڑوس ہے۔"[1]

ایک صحابی آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ہمسایہ کی شکایت لے کر آئے۔ آپؐ نے فرمایا، جاؤ صبر کرو۔ وہ دو تین بار پھر آئے۔ آخر آپؐ نے فرمایا گھر کا سامان رستہ میں ڈال دو۔ (جیسے کوئی گھر سے نکل رہا ہو) صحابیؓ نے ایسا ہی کیا۔ گزرنے والوں نے پوچھا، کیا ماجرا ہے؟ انھوں نے پڑوسی کی بدسلوکی کا ذکر کیا۔ لوگوں نے پڑوسی کو برا بھلا کہا۔ وہ ان صحابیؓ کے پاس آیا اور کہا، اب آپ مکان میں تشریف لے جائیں۔ آئندہ آپ میری کوئی ناگوار حرکت نہیں دیکھیں گے۔[2]

---

[1] البدایہ والنہایہ - ابن کثیر ۔ [2] ابو داؤد - ادب المفرد ص۲۸۔

شہری

مفہوم

ایک ریاست کے رکن کی حیثیت میں اس کا ہر باشندہ شہری کہلاتا ہے۔

شہری کا لفظ یہاں دیہاتی کے مقابل نہیں۔ اس میں شہر اور دیہات کے سب باشندے شامل ہیں۔

اسلامی شہریت میں مسلم و غیر مسلم سب شانہ بہ شانہ شریک ہو سکتے ہیں۔

شہریت کی شروط

یہ ایک نہایت اہم مسئلہ ہے کہ شہریت کی کامیابی کے لئے کن کن امور کی ضرورت ہے۔

اگرچہ ایک مسلمان کے لئے تو سیدھی سادی بات یہ ہے کہ نیک مسلمان بن جانا ہی اچھا شہری ہونے کے لئے کافی ہے لیکن اس مسئلہ کی وضاحت پوری طرح نہیں ہوتی۔ اس کا تفصیلی جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ علم شہریت کے ماہرین اس پر مندرجۂ ذیل عنوانوں کے تحت بحث کرتے ہیں۔

(۱) شہری حقوق۔

(۲) شہری فرائض

(۳) اچھے شہری کے اوصاف۔

حقوق و فرائض کا مفہوم

زندگی گزارنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے زندگی کا ماحول اور سامان مہیا کر دئے ہیں۔ ان پر کسی شخص واحد یا گروہ کا اجارہ نہیں ہو سکتا۔ اس ماحول اور سامان میں سب انسانوں کو اشتراک کا حق ہے۔ یہ اشتراک جبھی قائم رہ سکتا ہے کہ آدمی خود بھی جئے اور دوسروں کو بھی جینے دے۔

جینا اور جینے دینا مل کر زندگی کو ترکیب دیتے ہیں۔ ان دونوں اجزاء میں سے ایک جزو نکال دیا جائے تو زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ جینا اور جینے دینا لازم و ملزوم ہیں۔

جینے دینے کا مفہوم یہی نہیں کہ کسی کی راہ میں رکاوٹ نہ ڈالی جائے بلکہ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ جینے میں مدد دی جائے کیونکہ بنی آدم ایک دوسرے کے اعضاء ہیں۔ جسم کا ایک عضو تعاون سے رہ جائے تو دوسرے اعضاء کا دائرۂ عمل محدود یا ختم ہو جاتا ہے۔ انسانی برادری میں عدم تعاون کا فوری نتیجہ رکاوٹ ہے لہٰذا تعاون فرض ہے۔

جینا حق ہے اور جینے دینا فرض ہے۔ جینے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے انھیں حقوق کہتے ہیں اور جینے دینے کے لئے جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں انھیں فرائض کہتے ہیں۔

دنیا میں کوئی حق ایسا نہیں جس کے ساتھ فرائض وابستہ نہ ہوں۔ حق بے لگام آزادی یا غیر محدود طلب کا نام نہیں۔ حق فرائض میں محصور رہتا ہے مثلاً ہر آدمی کو اپنے مکان میں رہنے کا حق حاصل ہے لیکن اس حق کے ساتھ یہ فرائض لازم ہیں کہ پڑوسیوں کو شور و غل سے پریشان نہ کرے اور گلی میں غلاظت نہ پھینکے۔

۲) فرائض

(۱) حکومت سے تعاون :

ہر مسلمان شہری کا فرض ہے کہ ... حکومت سے تعاون کرے۔
قرآنِ حکیم میں اُولُو الْاَمْرِ (اصحاب حکومت) کی اطاعت کا حکم آیا ہے۔
...حب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میں تمھیں نصیحت کرتا ہوں اللہ تعالیٰ سے تقویٰ رکھنے کی اور حکومت کا حکم سننے اور بجا لانے کی چاہے کوئی غلام تم پر امیر ہو جائے[1] ایک اور روایت میں ہے کہ چاہے وہ حبشی غلام ہو۔

حکومت عوام کی نمائندہ ہوتی ہے۔ اگر عوام اس کا ساتھ نہ دیں تو اس کا وجود قائم نہیں رہ سکتا۔

(۲) دیگر شہریوں کے حقوق کی رعایت لازم ہے۔ اگر اپنے لئے حقوق طلب کیے جائیں اور دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالا جائے تو ابتری پھیل جائے۔ احادیث نبوی سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر مسلمان کو دوسرے مسلمان کے خون، مال اور آبرو کا اسی طرح احترام کرنا چاہیے جیسے ذوالحجہ کے مہینہ، مکہ شہر اور حج کے روز کا احترام ہوتا ہے۔

۱۲) اچھے شہری کے اوصاف

اسلامی ریاست کے ایک اچھے شہری میں مختصراً مندرجہ ذیل اوصاف ہونے چاہییں :-

ریاست کا وفادار ہو۔
اپنے حقوق و فرائض سے آگاہ ہو۔

---

[1] اربعین نودی

حقوق کا پلہ فرائض سے بھاری نہ ہونے دے۔
حکومت سے تعاون کرے۔
قیام امن میں مدد دے۔
دیگر شہریوں سے نیکی میں تعاون کرے۔
خدمتِ خلق کا جذبہ رکھتا ہو۔
روادار اور غیر متعصب ہو۔
کسی کو بالواسطہ یا بلاواسطہ ایذاء نہ دے۔
بخیل نہ ہو۔
تلخ مزاج اور تلخ زبان نہ ہو۔
کسی کی پرائیویٹ زندگی کی ٹوہ نہ لگائے۔

ریاست

مفہوم

ریاست میں دو چیزیں شامل ہوتی ہیں یعنی

(۱) علاقہ

(۲) اس علاقہ کا نظم و نسق

ان دونوں چیزوں کو ملا کر ریاست کہتے ہیں۔

ریاست اور حکومت میں فرق:

حکومت اس ادارہ کا نام ہے جو کسی ریاست کا نظم و نسق چلاتا ہے۔ حکومت ریاست کی خادم ہوتی ہے۔ حکومت کو حسبِ ضرورت بدلا جا سکتا ہے۔

ریاست کی اہمیت

دین کی اشاعت:

دین کے استحکام اور اشاعت کے لئے ریاست کا وجود اگرچہ لابدی نہیں لیکن مفید ضرور ہے۔ آغازِ اسلام میں جب تک اہلِ اسلام مکّہ تک محدود تھے دین کی اشاعت بھی محدود تھی۔ ہجرت کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مدینہ میں ایک آزاد اور خود مختار ریاست قائم فرمائی تو اسلام کی نہایت تیز رفتاری سے اشاعت ہونے لگی۔

تنظیم:

ریاست کے بدولت قوم ایک رشتہ میں منسلک رہتی ہے اور انتشار سے محفوظ رہتی ہے۔ ریاست قوم کو ایک مرکز پر جمع کر کے منظم کرتی ہے۔ حکومت اور اس کے سربراہ کے بغیر قوم کی وحدت پریشان ہو جاتی ہے اور زندگی کے ہر شعبہ میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی حقیقت کے پیش نظر جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب تین آدمی سفر پر نکلیں تو اپنے میں سے ایک کو اپنا امیر کر لیں[1]

حکومت نہ ہو تو قوم میں اجتماعی قوت پیدا نہ ہو سکے، بلائیں اور مصائب اس میں پنجے گاڑ لیں، دشمن کی فوج اسے پامال کر دے اور اس کے لئے دنیا میں کوئی باعزت مقام نہ ہو۔ حکومت قوم کو منظم کر کے ہلاکت کی ہر یورش کا مقابلہ کرتی ہے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

حکومت کا سربراہ ڈھال ہوتا ہے جس کی اوٹ میں (دشمن سے) جنگ کی جاتی ہے اور (مصائب سے) بچاؤ کیا جاتا ہے[2]

قومی ترقی:

حکومت سب ذرائع و وسائل کو ایک تنظیم میں لا کر افراد کی منظم قوت کے ذریعے قوم کو ترقی کی راہ پر چلاتی ہے۔ قومی ترقی کے لئے بعض دفعہ بہت بڑے بڑے منصوبوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ افراد کے بس کے نہیں ہوتے۔ حکومت ہی ان کا بیڑا اٹھا سکتی ہے۔

---

[1] ریاض الصالحین باب استحباب طلب الرفقۃ۔

[2] مشکاۃ کتاب الامارۃ۔

حکومت قائم کرنے کی تاکید:

قرآنِ حکیم اور احادیث میں حکومت قائم کرنے اور امراء کی اطاعت کی بہت تاکید آئی ہے۔ جو آدمی ریاست کا قائل نہ ہو اور عوام کے منتخب کردہ سربراہ حکومت کو بغیر کسی دینی سبب کے نہ مانتا ہو وہ دوزخی ہے۔ جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

(۱) جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی۔ جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔[1]

(۲) اگر تم پر کوئی نکٹا غلام بھی حاکم ہو جائے اور کتاب اللہ کے بموجب حکم چلائے تو اس کی بات سنو اور حکم مانو۔[2]

(۳) جو آدمی اس حال میں مرے کہ اس کے گلے میں کسی امام (یعنی سربراہِ حکومت) کی بیعت نہ ہو تو وہ کفر کی موت مرتا ہے۔[3]

اقتدارِ اعلیٰ

مثالی اقتدارِ اعلیٰ میں مندرجۂ ذیل اوصاف کا ہونا لابدی ہے:

(۱) وحدت:

اقتدارِ اعلیٰ کا صرف ایک مرکز ہو۔ اگر ایک سے زائد مرکز ہوں اور ایک دوسرے سے آزاد ہوں تو ان میں کسی پہ اقتدارِ اعلیٰ کا اطلاق نہیں ہو سکے گا۔ اقتدارِ اعلیٰ کو تقسیم ناپذیر ہونا چاہیے۔ یہی حقیقی وحدت ہے۔

---

[1] مشکوٰۃ کتاب الامارۃ۔ [2] مشکوٰۃ کتاب الامارۃ [3] ایضاً۔

(۲) تعیّن:

یہ بخوبی معلوم ہو کہ اقتدارِ اعلیٰ کس کے پاس ہے۔ بچے سے لے کر بوڑھے تک کو اس کا نام معلوم ہو اور وہ اس کی اطاعت پر دل و جان سے یقین رکھتا ہو۔ قوم کو اس کے بارے میں تذبذب نہ ہو۔

(۳) حقیقت:

اقتدارِ اعلیٰ حقیقی ہو یعنی اس کا وجود برائے نام نہ ہو۔ کوئی اور ہستی اس کو اپنے اشاروں پر رقص کرانے والی نہ ہو۔ ایسا بھی نہ ہو کہ قانون تو اس کے نام سے چلتا ہو لیکن قانون بنانے والا کوئی اور ہو یا کوئی اور قوی تر طاقت اسے قانون بنانے یا بدلنے پر مجبور کرے۔

(۴) حکمت:

اقتدارِ اعلیٰ حکیمانہ بصیرت سے متصف ہو۔ غلطی اور خطا سے مبرا ہو۔ کیونکہ ایک ہی غلطی بعض دفعہ پوری کی پوری ریاست کو فنا کر دیتی ہے۔

(۵) عدل:

اقتدارِ اعلیٰ کو عادل ہونا چاہیے۔ ہوس یا جنبہ داری اس کے فیصلہ کو ملوّث نہ کرے۔

(۶) پائداری:

اقتدارِ اعلیٰ نے اپنے استحکام کا ناقابلِ تردید ثبوت مہیا کر دیا ہو۔ اس کی قوت دلوں پر اس قدر چھا چکی ہو کہ کسی کو اس کی حکومت کا تختہ الٹنے کا خیال تک نہ آئے۔

(۷) زوال ناپذیری:

اقتدارِ اعلیٰ کی پائیداری دائم ہونی چاہیے نہ تو انحطاط قبول کرے، نہ

اس کی حدود کم ہوں، نہ اس کی قوت میں ضعف آسکے اور نہ یہ مِٹ سکے۔
مختصراً ازلی وابدی ہو۔

مندرجۂ بالا اوصاف سوائے اللہ تعالےٰ کے نہ کسی فرد میں ہوسکتے ہیں اور نہ کسی انسانی ادارہ میں۔ اس لئے اسلام اللہ تعالیٰ ہی کے اقتدارِ اعلےٰ کو تسلیم کرتا ہے۔ قرآنِ حکیم بتاتا ہے کہ انسان کی حیثیت اس زمین میں محض ایک نائب کی ہے جو دین و شریعت کے احکام کا نفاذ کرکے حاکمِ اعلیٰ یعنی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرتا ہے۔

خلافتِ ارضی

اللہ تعالےٰ نے انسان کو بحیثیتِ مجموعی زمین پر اپنا نائب بنایا ہے۔ اس نائب کے ذمے سب سے بڑا فریضہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالےٰ کے کلمہ کو دُنیا میں بلند کرے اور اس کے آئین کا نفاذ کرے۔

اللہ تعالےٰ کا قرآنِ حکیم میں ارشاد ہے: مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ۔ (مَیں نے جن و انس کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں) عبادت کے دو گونہ معنی ہیں: ایک یہ کہ تعظیم و تمجید کے جو طریقے اللہ تعالےٰ نے بتلائے ہیں ان پر عمل کیا جائے۔ اسے نماز و دُعا کہہ لیجئے۔ دُوسری عبادت یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کے احکام کی تعمیل کی جائے۔

جن و انس کے علاوہ دیگر اشیاء اللہ تعالےٰ کے حضور میں صلوٰۃ و تسبیح کا ہدیہ خود پیش کرتی رہتی ہیں اور اپنے فرائض اس طرح بجا لاتی ہیں کہ رتی بھر کی کسر نہیں رہتی۔ انسان کی فطرت میں آزادی کا میلان ودیعت ہے۔ اس لئے اس پر کچھ پابندیاں تجویز کردی گئیں اور کچھ قواعد و ضوابط مقرر

کردیئے گئے کہ یہ حدیں نہ پھلانگنے لگے۔

انسان سے اللہ تعالےٰ کی ہدایات اور قواعد کی پابندی کون کرائے گا؟ خود انسان۔ یہ وہ ہستی ہے جو خود حاکم اور خود محکوم ہے۔ انسان اپنا حاکم ہے۔ لیکن حاکم اعلیٰ نہیں۔ حکم اعلیٰ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ انسان اللہ کا نائب حاکم یعنی خلیفہ ہے۔

خلافت الٰہی کی دعویدار وہی قوم ہو سکتی ہے جو اللہ پر ایمان رکھتی ہے، اس کے اقتدار اعلیٰ کو مانتی ہے اور اس کے نازل کردہ احکام پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ جو قوم اللہ تعالےٰ پر ایمان نہیں رکھتی یا اس کے احکام کو تسلیم نہیں کرتی وہ لاکھ زور آور، غالب اور متسلط ہو خلافت الٰہی کے شرف سے محروم ہوتی ہے۔ اگر کسی ملک میں کوئی نائب حاکم طاقت بڑھا کر مرکزی حکومت سے باغی ہو بیٹھے تو اس کے غلبہ و تسلط کے باوجود اہل وطن اسے باغی کہیں گے۔ خدا کے جو بندے خدا سے باغی ہو جائیں وہ خلیفہ نہیں رہتے۔

سورۂ نور (آیت۔۵۵) میں اللہ تعالےٰ نے ان بندوں سے عطائے خلافت کا وعدہ فرمایا ہے جو

(۱) اللہ پر ایمان لائے ہیں۔

(۲) نیک کام کرتے ہیں۔

(۳) اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔

(۴) اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے۔

آیت کے آغاز میں اٰمَنُوا مِنۡکُمۡ کے الفاظ ہیں یعنی تم میں سے وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں۔ مِنۡکُمۡ (تم میں سے) کے الفاظ صاف اور واضح

کر رہے ہیں کہ جن میں مذکورہ اوصاف نہیں وہ خلافت کے مستحق نہیں ہو سکتے۔

خلافت کی اہل قوم کے ساتھ اللہ تعالےٰ کا وعدہ ہے کہ دین اس کے لئے مستحکم کر دیا جائے گا یعنی کم از کم وہ خود دین پر سختی سے عمل پیرا ہوگی۔ دین سے ہٹ کر خلافتِ الٰہی کا قیام نہیں ہو سکتا۔

خلافت کا اہل ہونے کے لئے یہ تو لازم ہے کہ مومن قوم کو اپنے وطن میں پورا تمکن اور استحکام حاصل ہو، اغیار کی طرف سے مامون اور بے خوف ہو لیکن یہ ضروری نہیں کہ ساری دنیا پر چھا جائے۔ حضرتِ داودؑ کو اللہ تعالےٰ نے قرآنِ حکیم میں خلیفہ کہا ہے۔ آپ ساری دنیا کے حکمران نہیں تھے۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مبارک اور خلافتِ راشدہ کے دور میں اسلامی قبضہ ساری دنیا پر نہیں پھیلا تاہم یہ خلافت، خلافتِ الٰہی تھی۔

خلافت، امارت، حکومت

خلافت کے لئے امارت اور امامت کے لفظ بھی آتے ہیں۔ لیکن آخری دو لفظوں میں عمومیت ہے اور بادشاہی کے لئے بھی استعمال ہو سکتے ہیں۔ خلافت کا لفظ خاص ہے اور اصطلاحاً صرف اسی امارت یا امامت کے لئے مستعمل ہوتا ہے جو نبی آخر زمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریق عمل کی پیروی ہو۔

حکومت کا لفظ جدید زمانے میں نہایت وسیع مفہوم کے ساتھ برتا جاتا ہے۔ خلافت، امامت اور امارت سب پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

ہمارے لئے خلافت کی صحیح اور قابلِ تقلید مثال خلافت راشدہ کی ہے۔

ہر دور میں ہر اسلامی حکومت کو اس کی پیروی کرنی چاہیے۔

شوریٰ

خلافت کا حق پوری ملت کو عطا ہوتا ہے۔ اس ملت کے سب افراد نظم و نسق میں حصہ دار ہوتے ہیں۔ وہ باہم مشورہ کرکے اپنی رضا سے کچھ اختیارات ایک دین دار اور اہل شخص کو سونپ کر اسے رئیس اعلیٰ بنا دیتے ہیں۔ یہ شخص اصطلاحاً ساری قوم میں خلیفہ کہلاتا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضرتِ داؤد کو اللہ تعالیٰ نے خلیفہ کہا ہے کیونکہ قوم کی سربراہی ان کے ہاتھ میں تھی۔ وہ چونکہ نبی تھے اس لئے ان کا انتخاب مشورہ سے نہیں ہوا۔ ویسے خلافت کے لئے باہمی مشورہ ضروری ہے۔ قرآن حکیم اسے شوریٰ کا نام دیتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں مسلمانوں کے بارے میں ارشاد ہے: وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ: یعنی وہ اپنے معاملات باہمی مشورہ سے طے کرتے ہیں۔ آج کل اسے عام طور سے جمہوریت کہا جاتا ہے لیکن اسلامی جمہوریت کچھ مختلف ہے۔ کیونکہ اقتدار اعلیٰ نہ قوم کے پاس ہوتا ہے اور نہ خلیفہ کے پاس بلکہ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

ملتِ اسلامیہ میں خلیفہ کے تقرر اور عزل کا حق پوری قوم کو حاصل ہوتا ہے۔ وہ آئے دن کے معاملات میں بھی رائے دینے کا پورا حق رکھتی ہے۔ خلافت کا تقاضا ہے کہ شوریٰ پر مکمل طور سے عمل کیا جائے تاکہ ملت کا ہر فرد خلافت میں حصہ دار ہو جائے۔ انسان بحیثیت مجموعی اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے، سوائے نبی کے کسی انفرادی شخص کو خلیفۃ اللہ کہنا بجا نہیں۔ حضرتِ ابوبکرؓ کو کسی نے خلیفۃ اللہ کہا تو انھوں نے پسند نہیں کیا حضرتِ عمرؓ ثانی کو بھی ایک شخص نے خلیفۃ اللہ کہا تو انھوں نے کہا کہ خلیفۃ اللہ داؤد علیہ السلام تھے یا ان کی طرح کے دیگر پیغمبر۔

خلافت کی روح

ضروری نہیں کہ ہر عہد اور ہر ملک میں شوریٰ

اُمّت

مفہوم

اُمّت کے کئی لغوی معنی ہیں مثلاً:
(۱) زندگی کا طریقہ یا رستہ
(۲) ایک نسل یا پشت۔
(۳) ہر حیوانی نوع مثلاً گائے، بھینس، گھوڑا۔
(۴) خاندان۔
(۵) مُلک
(۶) جماعت چاہے اس میں مختلف مذہبوں کے افراد شامل ہوں۔
(۷) نبی کے پیرو۔
اس وقت ہمارے عنوان کا مفہوم سب سے آخری معنی کے اعتبار سے ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہر نام لیوا آپؐ کی اُمّت میں شامل ہے۔ اس اُمّت کو عام طور سے اُمّتِ محمدیہ یا اُمّتِ مُسلِمہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اُمّتِ مُسلِمہ ایک وسیع اور عالمگیر ادارہ ہے۔ بچّے سے لے کر بوڑھے تک ہر مسلمان اس کا رُکن ہے۔ ہر رُکن کو اس ادارہ میں برابر کی اہمیّت حاصل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک اَن پڑھ اور نادار شخص جو بظاہر بن آنکھ کو حقیر نظر آتا ہے کل جہاد کے موقع پر کوئی ایسی خدمت انجام دے جائے جو بڑے سے بڑے عہدہ دار کے حصّہ میں بھی نہ آئی ہو۔

شرائطِ رُکنیت

دنیا کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک سب مسلمان اُمتِ مسلمہ کے رُکن ہیں۔

اس رُکنیت کے لئے کوئی رسمی فارم بھرنے کی یا چندہ جمع کرنے کی حاجت نہیں۔ اس کا رُکن بننے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ آدمی زبان سے کلمۂ طیبہ کی شہادت ادا کردے۔ اس کے علاوہ ہر وہ بچہ بھی اُمتِ مسلمہ کا فرد ہوتا ہے جو اس اُمت میں پیدا ہو۔ اگرچہ غیر مسلموں کے بچے بھی اس وقت تک مسلمان ہوتے ہیں جب تک ان کے والدین انھیں غیر مسلم نہ بنا دیں لیکن فقہی نقطۂ نگہ سے انھیں اُمت کے افراد شمار نہیں کیا جا سکتا۔

کلمۂ شہادت انسان کو اُمتِ مسلمہ کی رُکنیت میں فوراً داخل کر دیتا ہے بشرطیکہ وہ کسی اسلامی عقیدہ سے انکار نہ کرے۔ ہم کسی کا سینہ چیر کر اس کی نیت کا بھید نہیں کھول سکتے اس لئے اگر کوئی شخص دھوکے کو مسلمان بن جائے تو ہمارے لئے یہ فیصلہ کرنا ناممکن ہے کہ وہ منافق ہے۔ اسے اس وقت تک دائرۂ اسلام سے خارج نہیں سمجھا جا سکتا جب تک وہ اعلاناً اسلام کے کسی بنیادی عقیدہ کا منکر نہ ہو جائے۔ ایسے شخص کے اعمال بہت فاسقانہ بھی ہوں تو زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس کے اعمال منافقوں کے سے ہیں۔ اسے منافق نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی بداعمالیوں سے بیزاری اور لاتعلقی کا اعلان ہو سکتا ہے لیکن اس کی ذات سے بیزاری اور لاتعلقی کا اعلان نہیں ہو سکتا۔ اسے اُمتِ مسلمہ کے حقوق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔

ایک صحابی حضرت مقداد بن الاسود نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ اگر میدانِ جنگ میں کسی کافر سے میرا سامنا ہو جائے اور وہ تلوار کے وار سے میرا ہاتھ کاٹ ڈالے۔ پھر کسی درخت کی اوٹ

میں پناہ لے کر کہہ دے کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں تو کیا اُسے قتل کر سکتا ہوں؟ حضورؐ نے فرمایا، اسے مت مارو۔ مقدادؓ نے عرض کی کہ جناب اُس نے پہلے میرا ہاتھ کاٹا اور پھر اسلام کا اظہار کیا، کیا اسے قتل نہ کروں؟ حضورؐ نے فرمایا، اُسے قتل نہ کر۔ اگر تو نے اُسے قتل کر دیا تو اس کے قتل سے پہلے جو تیری منزلت تھی وہ اس کی ہو جائے گی اور اس کا (کفر کا) درجہ تجھے مل جائے گا۔[1]

حضرت اُسامہ بن زیدؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ہمیں ایک لشکر میں روانہ فرمایا۔ ہم دشمن قبیلہ پر حملہ آور ہوئے۔ میں ایک شخص کے سر پر پہنچا تو اس نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہہ دیا۔ تاہم میں نے اُسے برچھی مار دی۔ لیکن میرے دل میں شبہ بیٹھ گیا۔ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے اس کا ذکر کیا۔ حضورؐ نے فرمایا، کیا اس کے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہنے کے باوصف تو نے اُسے مار دیا۔ میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! اس نے محض اسلحہ کے خوف سے کلمہ پڑھا۔ حضورؐ نے فرمایا، کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا کہ اس کے دل سے آواز اُٹھی تھی یا نہیں۔ حضورؐ یہ فقرہ بار بار دُہراتے رہے۔ میری یہ حالت ہو گئی کہ میں نے چاہا کاش میں آج ہی مسلمان ہوا ہوتا۔[2]

اُمتِ اسلامیہ کی رُکنیت کا دروازہ ہر ایک کے لئے ہر وقت کھلا ہے۔ قومی، نسلی یا جغرافیائی تفریق سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ ہر رُکن اس عالمگیر ادارے کی مساوات سے بہرہ اندوز ہو سکتا ہے۔ اہلیت ہو تو ایک سیاہ فام حبشی بھی خلافت پر فائز ہو سکتا ہے۔

---

[1] و [2] مسلم کتاب الایمان

اُمّت کا کوئی عُہدہ یا منصب مُتوارث نہیں ہوتا۔ علم اور رُوحانیت کو بھی کسی ایک خاندان میں مقیّد نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام میں برہمنوں کی طرح کوئی ایسا خاندان نہیں جو علم یا روحانیت کو اپنے لئے مخصوص کرلے۔ اس اُمّت میں شودروں کی کوئی ناپاک ذات نہیں ہے۔ ہر مومن پاکیزہ ہوتا ہے۔

شِعار اُمّتِ محمّدیّہ کو دیگر اُمّتوں سے مُمیّز کرنے کے لئے اور اس کے ارکان کی باہمی شناخت کے لئے کئی علامات مقرر ہیں۔ ایسی علامت کو شِعار کہتے ہیں۔ شعار کا مقصد صرف نشان دہی نہیں بلکہ مِلّی جمعیت اور شان و شکوہ کا اظہار بھی ہے۔

مسلمان جب ملاقات کرتے ہیں تو السّلام علیکم سے ابتداء ہوتی ہے یہ شعار ہے۔ اسی طرح مسجد بھی شعار ہے۔ الغرض اُمّت کے کئی شعار ہیں جن کو زندہ رکھنا اُمّت کی مرکزیّت اور وحدت کو زندہ رکھنا ہے۔

سیاسی تفریق اُمّتِ مُسلمہ کے افراد مختلف حکومتوں اور سلطنتوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس اختلاف کی وجہ سے اُمّتِ مُسلمہ کے گروہوں میں کچھ سیاسی تفریق رُونما ہو جاتی ہے۔ ہر حکومت کے کچھ الگ قواعد اور قوانین ہوتے ہیں۔ ان قواعد اور قوانین کا فرق اُمّت میں کوئی بُنیادی فرق تو پیدا نہیں کر سکتا لیکن ہر الگ ریاست کے مسلمانوں کی ایک لحاظ سے الگ سیاسی روش قائم ہو جاتی ہے۔ وہ کچھ ایسے معاہدات پر مجبور ہوتے ہیں کہ ہر حال میں دوسری حکومت کے مسلمان بھائی کی فوری مدد کو نہیں پہنچ سکتے سورۂ انفال کے آخری رکوع سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایسی صُورت میں جہاں تک دینی معاملات کا تعلق ہے مدد میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے لیکن باقی امور میں امداد نہیں ہو سکتی۔

حقوق و فرائض

اُمّتِ مُسلمہ کے باہم برادرانہ حقوق ہیں۔ اسے ہم اُخوّت کا جامع نام دیتے ہیں۔ اس پر مکمل بحث آئندہ صفحات میں آئے گی۔

اُمّت کی قوّت جس قدر زیادہ ہو وہ اعداء کی یورش سے اسی قدر مامون رہتی ہے۔ اس کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک تبلیغ اور دوسرے دفاعی تیاری۔ تبلیغ کا مقصد صرف امتِ مُسلمہ کی عددی توسیع نہیں بلکہ اس سے وسیع تر ہے۔ اسی طرح جہاد کا مقصد محض جان کا دفاع نہیں بلکہ نیکی کا دفاع ہے۔ جیساکہ آئندہ صفحات سے ظاہر ہوگا۔
بہرحال اُمّت کے حقوق و فرائض پر تین عنوانوں کے تحت نظر ڈالی جاسکتی ہے۔ جو مندرجۂ ذیل ہیں:

(۱) اُخوّت۔
(۲) تبلیغ۔
(۳) جہاد۔

آئندہ صفحات میں ان عنوانات پر الگ الگ بحث کی جائے گی۔

اُخُوّت

اہمیت

قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے:
اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ
(مسلمان تو بھائی بھائی ہیں)

فرمانِ مصطفویؐ ہے:
کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے وہ اس سے خیانت نہیں کرتا۔ اس سے جھوٹ نہیں بولتا اور نہ وقت پڑنے پر اس سے کنارا کرتا ہے۔ ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کی آبرو، مال اور خون حرام ہے[۱]

حجۃ الوداع کے موقع پر آپؐ نے ایک لاکھ سے زائد صحابہؓ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

اے لوگو! میری بات سنو اور سمجھو۔ جان لو کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ سب اہل اسلام کی ایک برادری ہے۔ کسی شخص پر اس کے بھائی کا مال حلال نہیں جب تک وہ اپنی خوشی سے نہ دے۔ ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو[۲]

---

[۱] ترمذی [۲] طبری ابن ہشام۔ ترمذی ابواب تفسیر القرآن۔

حدیث ہے کہ مسلمان آپس میں ایک عمارت کی مثال ہیں جس کا ایک حصہ دوسرے کو مضبوط کرتا ہے۔ مسلمان باہمی مروت، مرحمت اور شفقت میں ایک جسد کے مانند ہیں۔ ایک عضو بیمار ہو تو کل جسم بے خواب اور بخار آلودہ ہو جاتا ہے۔

اسلامی اخوت کا رشتہ ناقابلِ شکست ہے۔ یہ رشتہ کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ اگر کوئی مسلمان اسے توڑ لینا چاہے تو وہ اسلام سے ہی کٹ جاتا ہے۔ مسلمان کو قطعاً روا نہیں کہ اپنی جماعت کو چھوڑ کر اغیار کے ساتھ قلبی روابط قائم کرے۔ قرآنِ حکیم میں صاف بتایا گیا ہے کہ ایک مسلمان کی موالات (یعنی قلبی محبت اور رفاقت) فقط اللہ تعالیٰ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور جماعتِ مومنین ہی سے ہو سکتی ہے۔ دیگر اقوام سے اسے دنیاوی رسم و راہ رکھنے کی اجازت ہے۔ ان کے ساتھ شرافت اور صداقت سے پیش آنے کا حکم ہے مگر ان سے مسلمان کا سا ربط قائم نہیں ہو سکتا جو ٹوٹ ہی نہ سکے۔ صاحبِ ایمان شخص کے دل کی دنیا فقط اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنین کے لئے وقف رہتی ہے۔ وہ اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ مہر و محبت سے رہتا ہے۔ قرآنِ حکیم کا مسلمانوں کے بارہ میں ارشاد ہے: رُحَمَاءُ بَیْنَہُمْ یعنی وہ ایک دوسرے کے لئے پیکرِ رحم ہوتے ہیں۔

خلوص اخوت کا اصل الاصول خلوص یا نیک نیتی ہے۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک بار صحابۂ کرام سے ارشاد فرمایا کہ دین خلوص کا نام ہے۔ صحابہؓ نے پوچھا کہ خلوص کس کے لئے ہو؟

ف۱ اربعین نووی۔

فرمایا، اللہ تعالےٰ کے لئے، مسلمانوں کے اماموں کے لئے اور اُن کے عوام کے لئے[1]

جذبۂ اخوت کی تقویت

ہر مسلمان کو لازم ہے کہ وہ دیگر مسلمانوں کے ساتھ برادرانہ تعلقات بڑھاتا رہے، ان سے عمدہ سلوک رکھے اور رسم و راہ بڑھائے۔ جناب ہادی برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سلسلہ میں کچھ واضح ہدایات دی ہیں۔ مثلاً ایک حدیث میں مسلمان کو مسلمان کے بارے میں مندرجہ ذیل ارشادات ہیں:

(۱) ملاقات کے وقت سلام کرے۔

(۲) وہ دعوت پر بلائے تو اس کی دعوت قبول کرے۔

(۳) بیمار ہو تو اس کی عیادت کرے۔

ہادی برحق صلی اللہ علیہ وآلہ کا ارشاد ہے کہ

جب کوئی آدمی کسی مریض کی عیادت کرتا ہے یا اپنے کسی بھائی کے پاس اللہ کی خوشنودی کے لئے جاتا ہے تو ایک آواز دینے والا اُسے آواز دیتا ہے کہ تو بھی مرغوب ہے اور تیرا چلنا پھرنا بھی مرغوب ہے۔ تو نے جنت میں اپنا گھر بنالیا[2]

احادیث میں میل ملاپ رکھنے اور تحائف کے لین دین کی بہت تاکید ہے۔

---

[1] ترمذی ابواب الادب

[2] ترمذی ابواب البر والصلۃ

نااتفاقی کی ممانعت

مسلمان کو مسلمان کے ساتھ بگاڑ پیدا کرنے کی اجازت نہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ مسلمان کے لئے حلال نہیں کہ مسلمان بھائی سے تین روز سے بڑھ کر تعلقات منقطع رکھے[1]

جس قوم میں نااتفاقی پیدا ہو جائے وہ ضعف کا شکار ہو جاتی ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے :

وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ (سورۂ انفال)

(اور آپس میں مت جھگڑو ورنہ تم کمزور ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی)

غیر مسلموں سے بارہا تعلقات ٹوٹ جاتے ہیں اور بعض دفعہ جنگ کی نوبت بھی آجاتی ہے لیکن مسلمانوں کو آپس میں جدال و قتال کا خیال تک نہیں آنا چاہیے۔ مسلمان کو گالی دینا فسق اور اس کو قتل کرنا کفر ہے۔[2] آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دیگر مسلمان مامون رہیں۔[3] آپ کی ایک مفصل حدیث میں ہے کہ :

آپس میں حسد نہ کرو، محض دوسرے کے لئے قیمت بڑھانے کو بولی نہ دو، آپس میں بغض نہ رکھو، ایک دوسرے سے منہ نہ موڑو۔ ایک دوسرے کے سودے پر سودا نہ کرو۔ اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی ہو جاؤ۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ نہ اس پر ظلم کرتا

---

[1] بخاری کتاب الادب۔ [2] ترمذی [3] بخاری کتاب الایمان

ہے، نہ اس کا ساتھ چھوڑتا ہے، نہ اس سے جھوٹ بولتا ہے اور نہ اُسے حقیر جانتا ہے۔ آپ نے تین بار سینہ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا، تقویٰ یہاں ہے۔ ایک مرد کو اتنا ہی شر بہت ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر جانے۔ ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کا خون، مال اور آبرو حرام ہے۔[1]

ارشاد نبوی ہے کہ مسلمان کو حلال نہیں کہ وہ آنکھ سے بھی ایسا اشارہ کرے جس سے کسی مسلمان کو رنج پہنچے۔[2]

باہمی حقوق اہل اسلام کے ایک دوسرے پر بے شمار حقوق ہیں۔ ان کی بجا آوری اس خوش قسمت انسان کو ہی نصیب ہوسکتی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے سچا ایمان عطا کیا ہو۔ مختصراً ان حقوق کا مطالعہ مندرجہ ذیل عنوانوں کے تحت کیا جاسکتا ہے۔

(۱) مسلمان کی مکمل خیر خواہی اور اعانت۔
(۲) اپنی ذات پر ترجیح۔
(۳) اس کے حق میں اچھا بولنا۔
(۴) ہر حال میں جماعت سے وابستگی۔

ذیل میں ہم ان عنوانوں پر الگ الگ بحث کریں گے

(۱) مسلمان کی مکمل خیر خواہی اور اعانت:

سرور اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:
تم میں سے کوئی آدمی اس وقت تک (کامل) مومن نہیں ہوتا

---

[1] اربعین نووی [2] اردو ترجمہ کیمیائے سعادت۔

جب تک وہ اپنے (مسلمان) بھائی کے لئے بھی وہ (بھلائی) نہ چاہے جو اپنے لئے چاہتا ہے[1]

ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر مختصراً یہ حق ہے کہ اس کا دل اور اس کی زبان اس کی خیرخواہ ہوں اور ضرورت پڑنے پر ہر جانی اور مالی ایثار کے لئے تیار ہو جائے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مؤمنین سے ان کی جانیں اور ان کے اموال جنت کے عوض خرید لئے ہیں۔ اس سے یہی مراد ہے کہ مؤمن کو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کے بندوں کی خدمت کے لئے ہر وقت آمادہ رہنا چاہیے۔ اسلام بے شک اپنے پیروؤں سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ سب نوعِ انسانی کی بھلائی کے لئے مستعد رہیں لیکن جو مقام اور خصوصیت اپنے مسلمان بھائیوں کے حقوق کی ہے اسے کوئی اور کیونکر پہنچ سکتا ہے۔

ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ اس پر ظلم نہیں کرتا اور نہ اس کا (مشکل) میں ساتھ چھوڑتا ہے۔ جو شخص اپنے بھائی کا مددگار رہے اللہ تعالیٰ اس کا کارساز رہتا ہے۔ جو شخص اپنے بھائی سے ایک دُکھ ہٹائے اللہ تعالیٰ اس کے بدلے قیامت کے دن اس سے ایک کرب دُور کرے گا۔ جو شخص دنیا میں اپنے بھائی کی ستر پوشی کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر بروزِ قیامت پردہ ڈالے گا[2]

ہجرت کے بعد آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہلِ مدینہ کے باہمی حقوق اور ذمہ داریوں کی ایک مختصر مگر بنیادی فہرست مرتب فرمائی

---

[1] اربعین نووی [2] صحیح مسلم

تھی۔ اس میں مسلمانوں کے باہمی تعلقات کا خصوصیت سے ذکر ہے۔ ان کے تعلقات سے متعلق مندرجۂ ذیل فرائض عائد کیے گئے تھے:

(۱) مسلمانوں کے قلبی رفیق صرف مسلمان ہوں گے۔

(۲) ایمان والوں کے دوست و دشمن مشترکہ ہوں گے۔ کوئی مسلمان اسلام کے دشمن سے تنہا مصالحت نہیں کر سکتا۔

(۳) اہل ایمان قرض تلے دبے ہوئے بھائیوں کی مدد کریں گے۔

(۴) اگر مسلمانوں میں سے کوئی شخص ظلم، سرکشی یا بغاوت کا مرتکب ہوگا تو سب پرہیزگار مسلمان اس کے خلاف ایک ہو کر اُٹھیں گے۔

آخری شرط کا تعلق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے ہے۔ مسلمان بھائی سے خیر خواہی صرف اس کے دنیوی معاملات اور زندگی کے دُکھ سُکھ ہی تک ہی محدود نہیں ہو سکتی بلکہ آخرت کی تیاری میں بھی اس کی مدد کرنی چاہیے۔ اسلام نیک بننے اور بنانے کا حکم دیتا ہے۔ بُرائی کی روک تھام اور نیکی کی اشاعت ہو تو اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ جماعت کی خرابیاں اور کمزوریاں دُور ہو جاتی ہیں۔ اور اس کی قوت بڑھتی ہے۔ قرآن حکیم نے ہر مسلمان کے لئے حسب استطاعت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (نیکی کا حکم دینا اور بُرائی سے منع کرنا) ایک ضروری فریضہ قرار دیا ہے۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لوگوں کے درمیان اصلاح کرنا (نفل) نماز، روزہ اور زکوٰۃ سے افضل ہے۔[1]

---

[1] ترمذی ابواب صفۃ القیامۃ

اگر انسان اپنے ہاتھوں مدد کرنے سے قاصر ہو تو کسی اور کو ہی اس کی سفارش کر دے۔ آں حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کوئی صدقہ صدقۂ زبان سے افضل تر نہیں ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا، وہ کس طرح؟ آپؐ نے فرمایا، وہ کوشش جس سے کسی کی جان بچے یا کسی کو تکلیف سے محفوظ رکھے۔[1]

زبانی مدد کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کے آگے مسلمان کی بھلائی کے لئے دُعا کی جائے۔ چونکہ اس دُعا میں خلوص ہوتا ہے اس لئے اس کو شرفِ قبول حاصل ہو جاتا ہے۔ جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کوئی دُعا اتنی سرعت سے قبول نہیں ہوتی جتنی کہ غائبانہ دُعا۔[2]

کسی مسلمان میں کوئی عیب نظر آئے تو اسے نہایت احتیاط سے خلوت میں آگاہ کر دینا چاہیے تاکہ وہ اسے دُور کر دے۔ کسی مسلمان کو یہ روا نہیں کہ اسے کسی خامی سے خبردار کیا جائے تو بُرا مانے۔

(۲) اپنی ذات پر ترجیح:

مسلمان کو اپنے اسلامی بھائیوں کی ہر مدد کے لئے تیار رہنا چاہیے یہاں تک کہ ضرورت پڑے تو اس کے لئے جان بھی لڑا دے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک صحابی کو کسی نے بھُنی ہوئی سری بھیجی صحابی نے کہا، میرا فلاں بھائی زیادہ حاجت مند ہے۔ بہتر ہوگا کہ اس کو بھیج دی جائے۔ جب اس کے پاس پہنچی تو اُس نے آگے ایک

---

[1] اُردو ترجمہ کیمیائے سعادت [2] ترمذی

اور مسلمان بھائی کو بھیج دی اور اس طرح سری کئی ہاتھوں میں پھر کر پہلے مسلمان کے ہاتھ میں آگئی۔[1]

مسلمان بھائی کو اپنی ذات پر ترجیح دینے کی ایک درخشاں مثال مؤاخات کی ہے۔

مسلمانوں میں باہمی ایثار و محبت کی روح پیدا کرنے کے لیے آں حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ان میں وقتاً فوقتاً مؤاخات یعنی بھائی چارا کرا دیتے تھے۔ یعنی دو مسلمانوں سے ارشاد فرما دیتے کہ تم آپس میں بھائی ہو۔ ان میں حقیقی بھائیوں کی طرح حقوق اور واجبات قائم ہو جاتے تھے۔ آپؐ نے مکی زندگی ہی میں اہل اسلام کے درمیان مؤاخات کرا دی تھی لیکن ہجرت کے بعد مؤاخات کی نئے سرے سے ضرورت پیدا ہوئی۔ مہاجرین بے خانماں تھے۔ انھیں امداد کی ضرورت تھی۔ ہجرت کے چند ماہ بعد آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مہاجرین اور انصار کو اکٹھا کیا۔ ایک ایک انصاری اور ایک ایک مہاجر کو بلا کر ان میں مواخات کرا دی۔

انصار نے اپنے مؤاخاتی بھائیوں کے ساتھ نہایت ایثار کا سلوک کیا اور ان کا دل و جان سے ہاتھ بٹایا۔ اس کی وضاحت فقط ایک مثال ہی سے ہو جاتی ہے۔ ایک انصاری سعدؓ بن الربیع نام تھے۔ عبدالرحمٰن بن عوف ان کے بھائی قرار دیے گئے۔ حضرت سعدؓ انھیں گھر لے گئے اور سارا اثاثہ نصفا نصف بانٹ دینا چاہا۔ لیکن حضرت عبدالرحمٰن رضی نے انکار کر دیا۔

---

[1] اردو ترجمہ کیمیائے سعادت رکن دوم۔

انصار نے مہاجرین کو آدھے نخلستان دینے کی پیشکش کی - آں حضور صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے یہ تجویز نہ مانی اور فیصلہ ہوا کہ مہاجرین نصف پیداوار پر انصار کی زمینوں پر کام کریں گے -

جب تک ہجرت جاری رہی مؤاخات کا سلسلہ بھی قائم ہوتا رہا۔ جو اکا دُکا مہاجر آتے یا کوئی صاحب حلقۂ اسلام میں داخل ہوتے انصار ان کو بھائی بنانے کے لئے جھگڑتے اور قرعہ اندازی سے فیصلہ ہوتا -

اسلامی مؤاخات کو حقیقی اخوت پر بھی غلبہ حاصل تھا - آغاز میں مؤاخات کی ایک شرط یہ تھی کہ مؤاخاتی بھائی کے انتقال کے بعد بجائے حقیقی کے مواخاتی بھائی وارث ٹھہرتا تھا۔ تھوڑی مدت بعد جب مہاجرین اپنے پاؤں پر کھڑے ہوگئے اور انھیں زیادہ اعانت کی حاجت نہ رہی تو وراثت کا یہ قاعدہ منسوخ ہوگیا -

(۳) مسلمان بھائی کے حق میں اچھا بولنا:

اگر کسی مجلس میں دیکھے کہ کسی مسلمان کے خلاف ناحق تہمت تراشی ہو رہی ہے تو اس کا واجبی جواب دے - آبرو انسان کی سب سے قیمتی متاع ہے - مسلمان کی آبرو کو ناحق تیروں سے بچانے کی پوری کوشش کرنی چاہیے -

(۴) ہر حال میں جماعت سے وابستگی:

سچے مسلمان کے دل میں یہ پختہ احساس ہوتا ہے کہ وہ جماعت کا ایک مستقل رکن ہے - اس کی زندگی جماعت کی زندگی سے جدا نہیں - وہ ملتِ اسلامیہ کے نفع و ضرر اور مسرت و الم میں برابر کا ساجھی ہے اسے کسی وقت بھی جماعت کی بہبود اور ترقی سے غافل نہیں رہنا چاہیے - اگر قوم وقتی طور

پر زوال کی زد میں بھی آجائے تو اس سے مایوس ہو کر اوروں کی طرف راغب نہ ہو بلکہ اس کے مستقبل کو سنوارنے کے لئے اپنی زندگی وقف کر دے۔ علامہ اقبالؒ نے کہا ہے سہ

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

۱۱) جماعتی خوش حالی اور آبرومندی کا یہی راز ہے کہ اس کے افراد آپس میں وابستہ ہو کر رہیں۔ کوئی شخص اپنی قوم سے دل برداشتہ ہو کر اس کا ساتھ نہ چھوڑے۔ حضرت یونس علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے۔ وہ اپنی ہٹ دھرم قوم سے بددل ہو کر اللہ تعالیٰ کے حکم کا انتظار کئے بغیر شہر سے نکل گئے۔ اللہ تعالیٰ کو حضرت یونسؑ کا یہ اقدام پسند نہ آیا۔ اور تنبیہ کے لئے انھیں مچھلی کے پیٹ میں پہنچا دیا حالانکہ حضرت یونس علیہ السلام کا ناقابلِ اصلاح قوم سے الگ ہو جانا کوئی گناہ کی بات نہ تھی۔ انھوں نے اپنے خیال میں ایک ٹھیک فیصلہ کیا لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ بتانا مقصود تھا کہ آپ قوم کا ساتھ نہ چھوڑتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔

جنابِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا کہ تین چیزوں پر مسلمان کا دل خیانت نہیں کرتا: اطاعتِ الٰہی کا اخلاص، ائمۂ مسلمین سے خلوص اور جماعت سے وابستگی[1]۔

آپؐ کا ایک اور ارشاد ہے کہ جو شخص اپنی جماعت سے بالشت بھر

---

[1] الترغیب والترھیب باب سماع الحدیث۔

بھی جُدا ہوا اور اس حالت میں مرگیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا یعنی کافروں کی سی موت پائی[1]

---

[1] بخاری کتاب الفتن۔

تبلیغ

مفہوم تبلیغ کے لغوی معنی ہیں انتہاء یا آخری ٹھکانے تک پہنچانا۔ محاورہ میں کہتے ہیں: بَلَغَ مِنِّیْ کَلَامُکَ یعنی تیرے کلام نے مجھ پر انتہائی تاثیر کی۔ اسی طرح تَبَالَغَ فِیْہِ الْمَرَضُ کے معنی ہیں: اس کا مرض انتہائی شدت کو پہنچا۔

دینی اصطلاح میں تبلیغ سے مُراد ہے اللہ تعالیٰ کا پیغام وضاحت کے ساتھ بندوں تک پہنچانا۔ قرآن حکیم میں اسے بلاغ بھی کہا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور قرآنی اصطلاح بَلَاغِ مُبِیْن بھی ہے۔ بلاغ اور بلاغِ مُبین بہت حد تک ہم معنی ہیں لیکن بلاغِ مُبین نبی سے مختص ہے کیونکہ وہی اس کا پورا حق ادا کر سکتا ہے۔

قرآن حکیم میں تبلیغ کے لئے ابلاغ کا لفظ بھی آیا ہے (الاعراف)
تبلیغ غیر مسلم کو بھی ہو سکتی ہے اور مسلم کو بھی۔ جہاں غیر مسلم کے کانوں میں اسلام کا پیغام پہنچانا ضروری ہے وہاں مسلمانوں کو بھی برائیوں سے پرہیز کرنے اور نیکی کی طرف زیادہ سے زیادہ میلان بڑھانے کے لئے تبلیغ کی ضرورت رہتی ہے۔

اہمیت مولانا حسین احمد مدنی رح تبلیغ کی اہمیت پر اظہارِ خیال کرتے

ہوئے رقم فرماہیں کہ:

"دنیا کے سب عقلاء کا اس پر اتفاق ہے کہ ہر انسان کا اخلاقی اور انسانی فرض ہے کہ اگر کسی دوسرے انسان کو کسی سخت نقصان سے دوچار ہوتا ہوا دیکھے تو اس کی مدد کرے اور حتی الوسع اس کی دستگیری کرتا ہوا مصائب و آفات کے پنجہ سے نجات دلوائے۔ اس بنا پر گڑھے اور کنوؤں میں گرنے والوں، درندوں اور زہریلے جانوروں کا شکار ہونے والوں، ظالم اور خونخوار حیوانوں کے پنجوں میں پھنسنے والوں، فاقہ، افلاس اور امراض میں مبتلا ہونے والوں وغیرہ کی مدد ہر مذہب میں ضروری خیال کی جاتی ہے۔

جبکہ دنیاوی چند روزہ مصائب اور فنا ہونے والے جسم کی تکالیف سے بچانا انسانی فریضہ شمار کیا جاتا ہے تو اُخروی دائمی مصائب اور ہمیشہ باقی رہنے والی روح کو تکالیف سے بچانا کیا اس سے بدرجہا لازم فریضہ شمار نہیں کیا جائے گا۔ اس لئے ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کی اُخروی زندگی اور روحانی امراض سے شفایابی کی طرف پوری توجہ دے۔"

اسلام صرف روحانی ہی نہیں بلکہ مادی فلاح کا بھی ضامن ہے۔ اس لئے ہر عہد میں اسلامی تبلیغ کی ضرورت رہی ہے۔ آج جب کہ دنیا روحانی تنزل اور مادی پریشانیوں کے پنجے میں گرفتار ہے اس بات کی شدید تر ضرورت ہے کہ اسلام کی صحیح تعلیمات کو دُنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ موجودہ دُنیا کو جس قدر روگ لگے ہوئے ہیں اس کی شفا قرآن حکیم اور سنّتِ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ودلیعت ہے۔ اس ودلیعت کے امانت داروں کو امانت گزاری کا حق ادا کرنا چاہیے۔

آج دُنیا بھر کے سربراہ عالمی برادری کے طلب گار ہیں اور پکار رہے ہیں کہ جب تک عالمگیر پیمانہ پر ایک اخوت قائم نہیں ہوتی، ہمارے دکھوں کا علاج نہیں ہو سکے گا۔ اب یہ ثابت کرنا مسلمانوں کا کام ہے کہ اسلام نے اس برادری کو چودہ صدی پہلے ہی قائم کر کے دکھادیا ہے۔ یہ وہ برادری ہے جس میں کالے اور گورے، شرقی وغربی اور امیر و غریب سب کے لئے برابر کی گنجائش ہے۔

تبلیغ اسلام کی ضرورت صرف اس لئے نہیں کہ اس میں دنیا والوں کا فائدہ ہے بلکہ اس لئے بھی ہے کہ اس میں ہر مسلمان کی بہتری ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے گھر میں صفائی کا پورا اہتمام کرے اور پورے محلہ میں عفونت پھیلی ہو تو وہ کیوں کر بدبو اور وبائی جراثیم سے محفوظ رہ سکے گا۔ اگر اردگرد کی انسانیت برائیوں میں لتھڑی ہو تو اس سے نیک انسان بھی ضرر اٹھائیں گے اس لئے جو آدمی نیکی سے پورا مستفید ہونا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ اپنے ماحول سے برائی دور کر کے نیکی کی اشاعت کرے۔

وَالْعَصْرِ ○ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ○ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ○ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ○ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ○

(زمانے پر غور کرو۔ یقیناً انسان گھاٹے میں ہے مگر وہ لوگ (نہیں) جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے اور انھوں نے ایک دوسرے کو حق کی تلقین کی اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی)

اس سورت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر نیکی کی تبلیغ رک جائے تو قوم گھاٹے میں رہتی ہے۔ نیکی محض ٹھہراؤ کا نام نہیں۔ حرکت کا نام ہے۔ اگر اس میں پھیلاؤ اور وسعت پیدا نہ کی جائے تو یہ سکڑتی ہے اور جلد یا بدیر ختم ہو جاتی ہے۔

اسلام کی نگاہ میں کاملاً اور حقیقتہً نیک وہ ہے جو اوروں کو بھی نیک بنانے کی تڑپ رکھتا ہے۔ جو نیکی اپنے اندر گم ہو اور اس کی روشنی ارد گرد نہ پھیل رہی ہو عین ممکن ہے کہ وہ محض فریب ہو۔ مقید یا لنگڑی لولی نیکی جو انسانیت کی خدمت سے قاصر ہو اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ سب

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

نیکی کی اشاعت سے پہلے ضروری ہے کہ اسے بدی کی یورشوں سے محفوظ کر دیا جائے۔ جب تک برائی کا انسداد نہ ہو نیکی کی اشاعت مشکل ہے۔

اس لئے اسلام میں برائی کو روکنے اور نیکی کو رائج کرنے کا ساتھ ساتھ حکم ہے۔ اسے اَمر بِالمعروف وَنَھی عَنِ المنکر (نیکی کا حکم اور برائی سے ممانعت) کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے تبلیغ کے دو جزو ہیں، نیکی کی اشاعت اور برائی کی رکاوٹ۔

ہر مسلمان اسلام کا مبلغ ہوتا ہے۔ اس کو طاقت بھر اسلام کی تبلیغ کرنی چاہیے۔ جب تک کسی قوم میں برائی کو روکنے والے افراد ہوتے ہیں اس میں پنپنے کی صلاحیت باقی رہتی ہے۔ ملت میں تبلیغ و ارشاد اور تعلیم و تزکیہ کے فرائض انجام دینے والے گروہ کا وجود ضروری ہے۔ قرآنِ حکیم میں ارشاد ہے کہ:

تم میں ایک جماعت ہونی چاہیے جو نیکی کی دعوت دے،
بھلائی کا حکم دے اور برائی سے روکے اور وہی لوگ فلاح
یافتہ ہیں (آل عمران ۱۱۲)
ہادیِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنی اُمت کو فرمان ہے
خُدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے تمھیں اچھائی
کا حکم دینا ہے اور برائی سے روکنا ہے۔ ورنہ عین ممکن ہے
کہ اللہ تعالےٰ تم پر عذاب بھیج دے۔ پھر تم اسے پکاروگے
اور تمھیں کوئی جواب نہیں ملے گا (ریاض الصالحین بحوالہ ترمذی)
ملّت کی ذمہ داریاں اجتماعی ہیں۔ ہم فقط اپنی اصلاح کرکے فرض سے
سبکدوش نہیں ہوسکتے کیونکہ فرد کی ہستی ملّت سے وابستہ ہے۔ وہ
اس کے خیر و شر میں حصّہ دار ہوتا ہے۔
اخلاق میں متعدی تاثیر ہوتی ہے۔ اچھے اخلاق کو دیکھ کر دل میں
نیکی کا رجحان پیدا ہوسکتا ہے اور بُرے اخلاق والوں کے ہاتھوں اور
لوگ بھی برائیوں میں پڑسکتے ہیں۔ اگر برائی کا قوت اور استقامت
سے مقابلہ نہ کیا جائے تو اس کا دائرہ اثر نہایت تیزی سے پھیلنے لگتا
ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث مبارک ہے کہ بنو اسرائیل
میں جب خرابی واقع ہوئی تو یوں کہ جب کوئی اسرائیلی اپنے بھائی کو
گناہ کرتا دیکھتا تو اسے منع کرتا تھا۔ پھر دوسرا دن آتا تو نہ روکتا اس لئے کہ اس کا
ہم نوالہ وہم پیالہ وہم دم ہوتا تھا۔ پس اللہ تعالےٰ نے ان کے دلوں کو خلط ملط
کردیا اور ان کے بارے میں: لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْ اِسْرَآءِيْلَ
سے فَاسِقُوْنَ تک قرآن نازل ہوا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تکیہ سے

ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ یہ آیات پڑھ کر بیٹھ گئے اور صحابہ رضؓ سے فرمایا، تم برائی کے انسداد سے ہرگز نہ رکنا حتیٰ کہ ظالم کا ہاتھ پکڑ لو اور اُسے حق کی طرف جھکا دو۔[1]

سورۃ العصر میں قطعیت سے بتا دیا گیا ہے کہ صرف خود نیک بننے سے اسلام کا تقاضا پورا نہیں ہوتا جب تک دوسروں کو بھی نیک بنانے اور نیکی پر ثابت قدم رکھنے کی کوشش نہ کی جائے۔ بداخلاقی کے وبائی جرائم کو گرد و پیش سے فنا کرنا ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں جس قدر کوشش ہوسکے صرف کرنی چاہیے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث بتاتی ہے کہ اگر کسی آدمی کو برائی کرتے دیکھو تو اول اسے طاقت سے روکنے کی کوشش کرو لیکن ایسا کرنے کی طاقت نہ ہو یا اندیشہ ہو کہ مزید فتنہ پھیلے گا تو زبان سے منع کرو اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو کم از کم دل سے اس کو برا مانو لیکن یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہوگا۔ کامل ترین درجہ ہے کہ مسلمانوں کی جماعت میں اتنی قوت ہو کہ وہ دست و بازو کے زور سے برائی کا دفعیہ کر سکیں۔

تبلیغِ اسلام کا حکم

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تبلیغ پر بہت تاکید فرمائی ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے:

بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

(مجھ سے پیغام سن کر آگے پہنچاؤ، چاہے یہ ایک آیت ہی ہو)

---

[1] ترمذی، ابواب تفسیر القرآن

حجۃ الوداع کے خطبہ میں آپؐ نے ارشاد فرمایا:

اللہ تعالیٰ اس شخص کو شاد کام رکھے جو میری حدیث کو سن کر اشاعت کے لئے از بر کرتا ہے۔ میرے خطبہ کا سننے والا اسے غیر موجود آدمیوں تک پہنچائے۔

آں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام حتی الوسع جنگ سے گریز فرماتے تھے۔ اگر کسی وجہ سے آپؐ جوابی کارروائی پر مجبور ہو جاتے تو آخر دم تک جنگ کو ٹالنے کی کوشش کرتے اور دشمن کو اسلام کی دعوت دیتے تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، جنگِ خیبر میں یہود کے خلاف معرکہ آرائی کے لئے روانہ ہوئے تو جناب ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا، جنابؐ! کیا اس وقت تک تلوار چلاؤں کہ وہ ہماری راہ آجائیں؟ حضورؐ نے فرمایا، علیؓ! وقار و سکون کے ساتھ جا۔ جب ان کے دو بدو ہو تو انھیں اسلام کی دعوت دے اور اللہ کے حقوق بتا۔ اللہ کی قسم شخصِ واحد کا تیرے ہاتھ پر اسلام لانا سرخ اونٹوں سے زیادہ قابلِ قدر ہے۔

جناب ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہر چیز سے زیادہ تبلیغ عزیز ہوتی تھی۔ تبلیغ کی خاطر آپؐ نے نہایت فراخ دلی سے بڑے بڑے دکھ اٹھائے۔

قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ: (پ ۴ ع ۳)

(تم سب امتوں میں بہترین ہو جو بھیجی گئی لوگوں کے لئے۔ تم نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ امتِ مسلمہ کے پیدا کرنے کا مقصد ہی یہ ہے

کہ وہ برائی کو روک کے اور نیکی کی تبلیغ کرے۔

تبلیغ کے طریقے

تبلیغ کے دو طریقے ہیں:

(۱) زبانی ہدایت۔

(۲) اخلاقی کشش۔

زبانی ہدایت: زبانی تبلیغ نہایت صبر و تحمل اور حُسنِ کلام سے ہونی چاہیے جسے مخاطب کیا جائے وہ ضرور نہیں کہ ہدایت کو فوراً قبول کر لے۔ ہر آدمی کو اپنے خیالات اور اعمال سہانے نظر آتے ہیں۔ بارہا وہ تبلیغ کو اپنے عقائد اور نظریات میں دخل اندازی سمجھ کر بھڑک اٹھتا ہے۔ اس لیے انتہائی سکون کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ زبان سے کوئی ایسا کلمہ ادا نہ ہو جائے جو اُلٹا فساد پیدا کرے۔ سُورۃ الانعام (رکوع ۱۸) میں ارشاد ہے:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ :

(اور تم بُرا نہ کہو ان کو جن کی وہ پرستش کرتے ہیں۔ بس، وہ نادانی سے اللہ کو بُرا کہنے لگیں گے۔ یوں ہم نے ہر فرقہ کی نظر میں اس کے اعمال مزین کر دیئے ہیں۔)

دوسرے مذاہب کے پیرووں کو ان کے معبودوں اور پیشواؤں کے بارہ میں گستاخانہ الفاظ استعمال کر کے رنجیدہ کرنا روا نہیں۔ ان کے عقائد اور تصورات پر نہایت معقول طریقہ سے گفتگو ہونی چاہیے۔ سورۃ النحل کے آخری رکوع میں ارشاد ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ

(انھیں حکمت اور اچھے کام کے ساتھ اپنے رب کی راہ کی طرف بُلا اور بہترین بات سے اُن سے مباحثہ کر۔)

مولانا شبیر احمد عثمانی رح نے اس آیت کی نہایت دلاویز شرح لکھی ہے اسے ادنیٰ تبدیلی کے ساتھ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

"اس آیت میں جناب پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو تعلیم دی جا رہی ہے کہ لوگوں کو راستہ پر کس طرح لانا چاہیے۔ اس کے تین طریقے بتائے: حکمت، موعظت حسنہ اور جدال بالتی ھی احسن۔

(۱) حکمت سے مراد یہ ہے کہ نہایت پختہ اور اٹل مضامین مضبوط دلائل و براہین کی روشنی میں حکیمانہ انداز سے پیش کئے جائیں جن کو سن کر فہم و ادراک اور علمی ذوق رکھنے والا طبقہ گردن جھکا سکے۔

(۲) موعظہ حسنہ: اس سے مراد مؤثر اور رقت انگیز نصیحتیں ہیں جن میں نرم خوئی اور دل سوزی کی روح بھری ہو۔ اخلاص، ہمدردی، شفقت اور حسنِ اخلاق سے خوبصورت اور معتدل پیرایہ میں جو نصیحت کی جاتی ہے اس سے بسا اوقات پتھر کے دل بھی موم ہو جاتے ہیں اور مردوں میں جانیں پڑ جاتی ہیں۔

بالخصوص جو زیادہ عالی دماغ اور ذکی و فہیم نہیں ہوتے مگر طلب حق کی چنگاری سینے میں رکھتے ہیں ان میں مؤثر وعظ و پند سے عمل کی ایسی سٹیم بھری جا سکتی ہے جو بڑی اونچی عالمانہ تحقیقات سے ممکن نہیں۔

(۳) دنیا میں ایسی جماعت بھی رہا کی ہے جن کا کام ہر چیز میں الجھنا اور بات بات میں کج بحثی نکالنا اور

نہ حکمت کی باتیں قبول کرتے ہیں نہ وعظ و نصیحت سنتے ہیں بلکہ چاہتے ہیں کہ ہر مسئلہ میں بحث و مناظرہ کا بازار گرم ہو۔
بعض اوقات اہلِ فہم و انصاف اور طالبینِ حق کو بھی شبہات گھیر لیتے ہیں اور بدوں بحث کے تسلی نہیں پاتے۔ اس لیئے جَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فرمایا کہ اگر ایسا موقع پیش آئے تو بہترین طریقہ سے تہذیب، شائستگی، حق شناسی اور انصاف کے ساتھ بحث کرو۔ اپنے حریفِ مقابل کو الزام دو تو بہترین اسلوب سے دو۔ خواہی نخواہی دل آزار اور جگر خراش باتیں مت کرو جن سے قضیہ بڑھے اور معاملہ طول کھینچے۔ مقصود تفہیم اور احقاقِ حق ہونا چاہیئے۔ خشونت، بداخلاقی، سخن پھندی اور ہٹ دھرمی سے کچھ نتیجہ نہیں۔"

کسی قوم یا ملت کو تبلیغ کرنے سے پہلے یہ اچھی طرح دیکھنا چاہیئے کہ کیا اس کو اسلام سے کسی بات میں اتفاق بھی ہے یا نہیں۔ دونوں ملتوں میں جس قدر مشترکہ امور نظر آئیں سب سے پہلے اُن سے ابتداء کرنی چاہیئے تاکہ سننے والا ایک بار توجہ سے اسلام کی صدا پر کان لگائے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اختلافی امور کو چھونا چاہیئے۔ لیکن اس انداز کے ساتھ کہ کوئی رنجش یا کراہت پیدا نہ ہونے پائے۔

اہلِ کتاب کا دعویٰ ہے کہ ہم توحید کے علم بردار ہیں۔ قرآنِ حکیم ان کے اس دعوے کی بنیاد پر ان سے آغازِ سخن کرتا ہے:

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ ؛

(اے نبی!) کہہ دیجئے اہلِ کتاب سے کہ آؤ ایک بات کی طرف جو ہمارے تمہارے درمیان برابر ہے کہ صرف اللہ کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور آپس میں ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب نہ مانیں)۔

اخلاقی کشش

اسی شخص کا کلام دل پر اثر کرتا ہے جو اپنے کہے پر عمل پیرا بھی ہو۔ ترے گفتار کے غازی کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ مبلغ کا کلام ہزار شیریں ہو لیکن اس کا اخلاق دلآویز نہ ہو تو وہ اثر نہیں کرتا۔ جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآنِ حکیم کا جو پیغام سنایا اور خود جس بات کی تلقین فرمائی اس پر ہو بہو عمل بھی کر کے دکھایا۔ آپ مجسّم قرآن تھے۔ آپؐ نے اپنی حیاتِ مبارک کا ایک ایک گوشہ نگاہِ عالم کے سامنے کھول کر رکھ دیا تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ شاید زندگی کا فلاں گوشہ جو ہماری نگاہوں سے اوجھل رہ گیا ہے اس میں (نعوذ باللہ) کوئی خامی یا عیب ہوگا۔ بڑے بڑے اعداء بھی آپؐ کے اخلاقی اعجاز کے سامنے مہر بہ لب رہ جاتے تھے۔ ابوجہل ایسا کینہ پرور دشمن بھی آپ کے اخلاقِ کمال کا معترف تھا۔

اشاعتِ اسلام کی تاریخ دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ تبلیغ کا کارنامہ زبانی پند سے زیادہ عملی تاثیر کا مرہون تھا۔ ملتِ اسلامیہ کا کردار رحمتِ خداوندی کی جھلک دکھاتا تھا۔ فاتح افواج جہاں جہاں پہنچیں وہاں کے باشندے ان کے حسنِ اخلاق سے مسحور ہو کر اسلام کے حلقہ بگوش ہوتے گئے۔ یہ حالت صدیوں رہی۔ خلافتِ راشدہ کے ایام پر نگاہ ڈالیے، اموی دور کا تصور آنکھوں کے سامنے لائیے اور غور کیجئے کہ وہ کیا مبارک دور تھا جب کہ بحرِ اوقیانوس

سے لے کر انڈونیشیا تک کا ایک عالم اسلامی عساکر اور افراد کے دل نواز کردار کا فریفتہ ہو کر دینِ اسلام کا جان و دل سے پیرو ہو گیا۔ آج پھر اسی حسین عمل کی ضرورت ہے۔

یوں تو ہر مسلمان کو جامع فضائل ہونا چاہیے لیکن غیر مسلموں کے مقابل اس میں خصوصیت سے صبر و تحمل، عفو اور دل جوئی ایسے خصائص ہونے چاہئیں کہ وہ اس کی سیرت کے اسیر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ فرمانِ خداوندی ہے:

قُلْ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَغْفِرُوْا لِلَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ اَیَّامَ اللّٰہِ

(اے نبی! اہلِ ایمان سے کہہ دیجئے کہ کافروں سے درگزر کیا کریں۔)

سورۂ حٰمٓ السجدہ میں ارشاد ہے:

نیکی اور بدی میں برابری نہیں۔ بہتر چیز سے بدلہ دیا کر۔ پھر تو دیکھ لے گا کہ تیرا دشمن بدل کر گویا قریبی دوست ہو جاتا ہے۔

قرآنِ حکیم کی یہ ہدایات مسلم و غیر مسلم سب کے بارے میں ہیں۔ سورۂ توبہ میں ارشاد ہے کہ اگر کوئی مشرک تمہارے پاس طالبِ پناہ ہو کر آئے تو اُسے پناہ دو۔ اسے قرآنِ حکیم سناؤ اور اُسے جائے امن تک حفاظت سے پہنچا دو۔ حضرتِ علیؓ کی عدل پروری کو دیکھ کر ایک یہودی کے اسلام لانے کا واقعہ گزر چکا ہے۔ ایران کا ایک آتش پرست گورنر حضرتِ عمرؓ کی سادگی دیکھ کر اسلام لے آیا تھا۔ اسلام کی تاریخ ایسے بے شمار واقعات سے لبریز ہے۔

اگر اہلِ اسلام میں اخلاق کی کمی ہو تو وہ لوگ جو قرآنِ حکیم اور اسلامی اصول سے متاثر ہو کر اسلام کی طرف مائل ہوں وہ بھی قدم روک لیں گے۔ سورۂ نحل میں اہلِ اسلام سے ارشاد ہے کہ اپنی قسموں کو اپنے درمیان دھوکے کا حیلہ

نہ بناؤ۔ اگر تم ایسا کرو گے تو جما ہوا قدم بھی اُکھڑ جائے گا مراد یہ ہے کہ کوئی غیر مسلم اسلام لانے کا پختہ ارادہ کئے بیٹھا ہو تو ہو سکتا ہے کہ تمھاری بدعہدی یا دروغ گوئی دیکھ کر اس کا قدم ڈگمگا جائے۔

قرآنِ حکیم نے نومسلموں کی تالیفِ قلب یعنی دلداری کی بہت تاکید کی ہے اور بیت المال سے ان پر خرچ کرنے کا حکم دیا ہے۔ جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مؤلفۃ القلوب یعنی وہ نومسلم جن کی دل جوئی کی جاتی تھی ان کو بہت بڑے عطیے دیتے تھے (مدارج پر بہت نوازش فرماتے تھے۔ حضرت صفوان بن اُمیّہ حالتِ شرک میں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خون کے پیاسے تھے۔ اُن کا بیان ہے کہ حضورؐ نے مجھے حُنین کی غنیمت سے مال دیا۔ اس کے بعد بھی بخشش کرتے رہے۔ آپؐ مجھے دُنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہو گئے۔

تبدیلیِ مذہب میں جبر نہیں

اسلام اس بات کی قطعاً اجازت نہیں دیتا کہ کسی کو جبراً مسلمان بنایا جائے۔

قرآنِ حکیم کا اعلان ہے: لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ (دین میں کوئی جبر نہیں)

مسلمان کا کام فقط یہ ہے کہ وہ اسلام کو نہایت وضاحت کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کر دے اس کے بعد بزورِ شمشیر کسی کو اسلام قبول نہیں کروا سکتا۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے:

فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ

(اے نبی! اگر وہ اسلام لائیں تو انھوں نے ہدایت پائی۔ اگر وہ منہ

موڑ جائیں تو آپ کے ذمہ صرف پیغام مبین ہے) (سورۂ کہف)

تاریخ ثبوت پیش کرتی ہے کہ اہل اسلام نے اپنے زریں اصُول پر ہمیشہ عمل کیا۔ اسلام ہمیشہ تبلیغ سے پھیلا ہے اس سلسلہ میں علماء اور صوفیۂ کرام نے نہایت بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ ایک وقت تھا کہ آتش پرست تاتار نے تقریباً آدھی اسلامی دُنیا کو تہ و بالا کر دیا۔ یہ لوگ مسلمانوں کے خُون کے پیاسے تھے لیکن کچھ عرصہ بعد اسلام کی تعلیمات سے متاثر ہو کر اس دین کے نام لیوا ہو گئے۔ ہندوستان کے جن علاقوں میں مسلمان بادشاہوں کا دارالملک تھا وہاں مسلمان اقلیت میں رہے۔ لیکن چین وغیرہ کے علاقے جہاں کبھی اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی وہاں کروڑوں کی تعداد میں مسلمان اب بھی موجود ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلام کا فروغ اس کی حقانیت کے سبب سے تھا۔ اب بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ دُنیا کے سامنے اسلام کی صداقت کا ثبوت قولاً اور عملاً پیش کیا جائے۔

جہاد

مفہوم

جہاد کے لفظی معنی ہیں جدوجہد یا کوشش کرنا۔
جہاد فکری، قولی، عملی اور مالی ہر لحاظ سے ہو سکتا ہے علوم و مسائل میں غور و فکر کی کاوشیں، دعوتِ حق کی راہ میں زبان و قلم کی مشقتیں، میدانِ عمل میں جان و بدن کی سخت کوشیاں اور مال و متاع کی قربانیاں سب جہاد میں شمار ہوتی ہیں۔

جہاد اپنے اندر معنی و مفہوم کی ایک وسیع دنیا پنہاں رکھتا ہے۔ جہاد کی پکار کبھی جان و تن کی حفاظت کا تقاضا کرتی ہے اور کبھی اسے راہِ خدا میں لٹا دینے کا اشارہ کرتی ہے، کبھی اولاد و اقربا کی خدمت گزاری کا حکم دیتی ہے اور کبھی خدا کی خاطر ان سے بے نیاز ہو جانے کی طالب ہوتی ہے۔ الغرض جہاد اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کا دوسرا نام ہے۔ خدا کی راہ میں زندگی وقف کر دینا اور اسی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس کے ہر حکم اور ارشاد کے تابع ہو جانا جہاد ہے۔ یہی اسلام اور یہی ایمان ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے کہ کوئی ہے جو اپنے کو رضائے الٰہی کی قیمت کے عوض بیچ دیتا ہے (بقرہ ۲۰۷) ایک اور مقام پر اہلِ اسلام کو حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل میں محنت کا حق ادا کرو۔ (الحج۔ آخری آیت)

زندگی کا ایک ایک ثانیہ جہاد ہے بشرطیکہ زندگی کو نیک مقاصد کے تابع کر دیا جائے۔ ایک طالب علم کے سامنے اگر فقط یہی مقصد ہو کہ وہ علم و ہنر میں کمال حاصل کر کے اپنی اور خاندان کی ترقی کا باعث ہو گا اور بس، تو اس کی شبانہ روز کی عرق ریزی چاہے اسے دنیاوی ترقی کے معراج پر پہنچا دے اللہ تعالےٰ کے نزدیک اس کی کامگاریاں مستحسن نہیں ہوں گی اور اگر اپنی طالب علمانہ مساعی کو خدا تعالےٰ کی رضا اور قوم کی فلاح کا ایک ذریعہ سمجھے تو حصولِ علم کے لئے اس کی ادنےٰ جنبش بھی جہاد میں محسوب ہو گی۔

جہاد کی وسعت ساری زندگی کو چھائے ہوئے ہے۔ قرآن کا ایک ایک حرف اور ہادیِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک ایک اشارہ جہادِ زندگی کی تلقین کرتا ہے۔ مگر اصطلاحی معنیٰ میں جہاد سے مراد اپنے اور حق کے دفاع کے لیئے ظاہر و پوشیدہ دشمن کے مقابلے پر جنگ کی تیاری یا جنگ ہے (انفال۔ ۶۰)

جہاد اور عام جنگ میں بہت فرق ہے۔ جنگ ایک مطلق لفظ ہے۔ اگر اس پر نیکی، انسانیت اور شرافت کی پابندیاں لگا دی جائیں، تو اسے جہاد کہا جائے گا۔ اسلام سے قبل عرب میں جنگ کے لئے حرب کا لفظ مستعمل تھا۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس لفظ کو کراہت کی نگاہ سے دیکھا کیونکہ اس کے ساتھ عرب کی مدتِ مدید کی سنگدلانہ اور وحشیانہ روایات وابستہ تھیں۔ آپؐ نے عربوں کو جہاد کے لفظ سے روشناس کیا۔ جہاد وہ جنگ ہے جو خدا کی راہ میں نیکی کی حفاظت کے لیئے انتہائی مجبوری کی حالت میں لڑی جائے اگر اس سے تجاوز کیا جائے اور ظلم اور بے انصافی کو راہ

دی جائے تو یہ جہاد نہ رہے گا۔ بلکہ اسے حرب کہیں گے۔ اسلام سے قبل عربوں کی خون آشام طبیعت کو لفظِ حرب سے اتنی محبت تھی کہ بعض افراد کا نام حرب رکھا جاتا۔ مگر آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ نام رکھنے سے منع فرمایا۔ حرب کے لفظ کو عربی لغت سے مٹانا مشکل تھا، اسے باقی رہنے دیا گیا۔ اور بعد میں اسلامی جنگوں کے لئے اسے بھی استعمال کیا گیا۔ مگر اصطلاحی لفظ بہرحال جہاد ہی ہے۔

اہمیت اس دارو گیر اور تنازع للبقا (STRUGGLE FOR EXISTANCE) کی زندگی میں جہاد سے کنارہ کشی ناممکن ہے۔ کائنات کا کارخانہ تضاد اور مسابقت کے اصول پر چل رہا ہے۔ عناصر اور طبائع میں ازل سے آویزش اور مسابقت جاری ہے۔ تاریکی اور روشنی، نرمی اور سختی، دوستی اور نادرستی، صحت اور مرض، نیکی اور بدی کی جنگ روزِ آفرینش سے بھڑکتی چلی آئی ہے۔ اس کی آنچ کبھی ٹھنڈی نہیں ہوئی اور نہ ہوگی۔ حق اور باطل دو مقابل قوتیں ہیں۔ ان دونوں نے ہمیشہ ایک دوسرے کو دبانے کی کوشش کی ہے ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

(اقبال)

حق و باطل کی جنگ میں حق کو یہ امتیاز رہا ہے کہ اس نے ہمیشہ اپنے بچاؤ کا پہلو اختیار کیا ہے۔ اگرچہ نیکی بجائے خود بدی کی حریف ہے مگر بدی پر نیکی نے کبھی از خود حملہ نہیں کیا۔ نیکی نام ہی اس وصف کا ہے کہ کسی کے خلاف اقدام نہ کیا جائے۔ مگر ادھر بدی کی روح یہ ہے کہ

دوسروں کو ستایا جائے اور جو چیز اس کے بُرے ارادوں کی راہ میں آئے اسے تباہ کر دیا جائے۔ اس لئے وہ ہمیشہ نیکی پر حملہ آور ہوتی ہے۔ اور نیکی بھی ایک قوت ہے۔ ضعف یا عدم وجود کا نام نہیں۔ اس لئے زور دکھا کر سامنے آتی ہے اور تصادم لامحالہ رونما ہو جاتا ہے۔

ہر قوت کے لئے ایک نہ ایک مخالف قوت اور ہر قوم کے لئے ایک نہ ایک حریف قوم ہوتی ہے۔ مسلمان اس قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں۔ انھیں بھی روزِ اوّل سے بدخواہوں اور عداوت کیشوں سے سابقہ پڑا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں انھیں ہمیشہ کیل کانٹے سے لیس رہنے کا حکم دیا ہے۔

دشمن کی دشمنی ضرور نہیں کہ کھلے بندوں ہی ہو۔ دشمن دو قسم کے ہوتے ہیں یعنی ظاہر اور پوشیدہ (انفال - ۶۰)۔ جن اعداء کی عداوت ظاہر ہو ان کے خلاف تو حفاظت کی تدابیر لازم ہیں ہی مگر ان دشمنوں سے بھی حذر کرنا چاہیئے جن کی عداوت ان کے دلوں میں پوشیدہ ہے۔ وہ کسی وقت بھی گھات سے نکل کر دھاوا بول سکتے ہیں۔ ان کے اچانک حملوں سے محفوظ رہنے کے لئے ضروری ہے کہ حسبِ استطاعت قوت فراہم کی جائے۔ سرحدوں کو مضبوط رکھا جائے اور قوت و شوکت کی وہ نمود ہو کہ دشمن کو قدم بڑھانے کا حوصلہ ہی نہ پڑے۔ (انفال ۶۰)

دُنیا میں امن کے قیام کے لئے جہاد از بس ضروری ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (البقرہ ۲۵۰)

ترجمہ: (اگر اللہ تعالےٰ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ باز نہ رکھتا تو زمین میں فساد ہو جاتا لیکن اللہ تعالیٰ سب جہانوں پر رحم کرنے والا ہے)

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ جہاد اللہ تعالےٰ کی رحمت کا بہانہ ہے۔

جہاد فرضِ کفایہ ہے اور اعلیٰ ترین عبادات میں سے ہے۔ آں حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالےٰ کی راہ میں ایک دن محاذِ جنگ پر گزارنا دُنیا و ما فیہا سے بہتر ہے [۱]

جہاد کی کن حالات میں اجازت ہے

اہلِ اسلام کا اوّلین ہتھیار صلح ہے۔ قرآنِ حکیم کی تعلیم یہ ہے کہ کوئی لاکھ بدخواہ اور زحمت رساں ہو اس سے حتی الوسع درگزر کیا جائے۔ اس کی مخالفتوں سے چشم پوشی کی جائے اور اس کی بُرائی کو حُسنِ سلوک سے شرمسار کیا جائے۔ (المائدہ ۱۳۔ آلِ عمران ۱۸۶)

صلح دعوتِ اسلام کا دیباچہ ہے۔ اس لئے ہر مسلمان کو صلح کی فضا پیدا کرنے کے لئے کوشاں رہنا چاہیئے۔ مگر جیسا کہ سورۂ بقرہ کی پہلی رکوع سے خوب واضح ہوتا ہے دنیا میں وہ لوگ بھی تو ہیں جو نہ صلح کی آواز سنتے ہیں اور نہ نیکی کی صدا سے متاثر ہوتے ہیں۔ ان کے دِل پتھر سے بھی سخت ہیں اور ان پر کفر و عصیاں کے تہ بتہ پردے پڑے ہیں۔ فساد

---

[۱] ریاض الصالحین باب الجہاد۔

ان کا مایۂ خمیر ہے وہ شیطنت سے کبھی باز نہیں آتے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جابجا تصریح کی ہے کہ ان کی شر انگیزی حد سے بڑھنے لگے تو برابر کا جواب دو اور ان کی فتنہ کاریوں کا استیصال کرو۔ حسب ذیل میں سے کوئی صورت پیش آئے تو دشمن سے جنگ آزما ہونا ضروری ٹھہرتا ہے۔

(۱) دشمن اسلامی ملک پر حملہ آور ہو۔

(۲) دشمن اہل اسلام کو ظلم و ستم کا نشانہ بنائے۔ (انفال۔ ۷۲)

(۳) دشمن لوگوں کو راہِ خدا پر چلنے سے روکے یا دین اور مذہب پر پابندیاں عائد کرے چاہے یہ پابندیاں اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا ہی پر کیوں نہ ہوں۔ خدا تعالیٰ یہ قطعاً اجازت نہیں دیتا کہ کسی کو تبدیلِ مذہب پر مجبور کیا جائے یا کسی مذہب کی عبادت گاہوں کو نقصان پہنچایا جائے (الحج۔ ۶)

(۴) دشمن شکستِ عہد یا غداری کا مرتکب ہو یا اس کی منافقت عیاں ہو جائے۔ (۸۔ ۶۲)

(۵) دشمن فتنہ و فساد پیدا کرے اور پھیلائے۔

مذکورہ بالا صورتوں میں سے کوئی صورت پیش آجائے تو ظاہر ہے کہ یہ اسلام اور اہل اسلام کے لئے ایک خطرہ ہوگا۔ اس کا انسداد نہ کیا جائے تو مسلمان مٹ کر رہ جائیں۔ (انفال۔ ۲۵) مسلمانوں کی خیریت اسی میں ہے کہ وہ مل کر فتنہ پرور قوتوں کے خلاف جنگ کریں۔ اس جنگ میں ان کے لئے زندگی کا سامان ہوگا۔ (انفال۔ ۶)

مسلمان کو قطعاً اجازت نہیں کہ دنیاوی اغراض کے لئے خون بہاتا پھرے اللہ تعالیٰ کو اس کی ذات سے مقصود یہ ہے کہ اس سے حق کی سچائی اور

باطل کی بے ثباتی ثابت کرے (انفال - ۷)

اسلام کے مجاہدین جب بھی میدانِ جہاد میں نکلتے ہیں حق کی مدافعت کے لئے۔ سورۂ انفال کی چوتھی آیت میں اللہ تعالےٰ کا آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صاف ارشاد ہے کہ میں نے آپؐ کو امرِ حق میں مدینہ سے نکال کر مشرکوں کے مقابلہ پر روانہ کیا۔

جہاد کی پکار کا کس طرح جواب دیا جائے؟

(۱) حق کے لئے سینہ سپر ہونا اہلِ اسلام کا فرضِ اوّلین ہے۔ جب حالات سے ظاہر ہو کہ اب خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بتائے ہوئے اصول کے موافق میدانِ جنگ کی طرف چلنا ناگزیر ہے تو توقف نہ کرو۔ یہ گویا خدا اور اس کے رسولؐ کی پکار ہے۔ جس کا جواب لازم ہے۔

(۲) اولاد کی محبت اور نقصان جان و مال کا اندیشہ قطعاً راہ میں حائل نہ ہوں۔ ایسے موقعوں پر اولاد اور مال کی محبّت آزمائش بن کر سامنے آتی ہے۔ اس آزمائش میں جو ناکام ہو اس کا ٹھکانا دوزخ کی آگ ہے۔ (انفال - ۲۸)

(۳) اگر دشمن مُلک پر چڑھ آئے تو اپنی قلت اور دشمن کی کثرت کو نہ دیکھو۔ (انفال - ۴۹) بارہا قلیل فوجیں کثیر فوجوں پر غالب آتی ہیں۔ تم نیکی کے جذبہ کو لے کر اُٹھوگے تو کوئی وجہ نہیں کہ فتح تمہارا ساتھ نہ دے۔ تمھاری اس فتح سے جیسا کہ بدر کی جنگ میں ثابت ہوا اللہ تعالےٰ دو کام لے گا۔ ایک تو دُنیا پر واضح ہو جائیگا کہ حق ظاہری طور پر کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو بالآخر ظفرمند ہوتا ہے۔ یہ ثبوتِ حق کی ایک کھُلی دلیل ہوگی اور دُوسرے یہ فتح تمھارے لئے خدائی نعمتوں کے دروازے کھول دے گی (انفال

ہمیں جنگِ بدر اور اس سے پہلے کے واقعات سے ایک نہایت بصیرت افروز سبق ملتا ہے۔ مسلمان جب مکہ میں تھے تو تعداد میں کم اور سامان میں کم تر تھے۔ مشرک انھیں پرِکاہ بھی کم جانتے تھے اور انھیں طرح طرح کے دکھ دیتے تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں گوناگوں منصوبے باندھتے تھے۔ کبھی قید، کبھی قتل اور کبھی جلا وطنی کی تجویزیں ہوتی تھیں۔ مگر اللہ تعالےٰ نے ایسی تدبیر کی کہ اُن کی ساری چالیں اکارت گئیں۔ مسلمانوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے مدینہ کو قرارگاہ بنایا جس میں دیکھتے ہی دیکھتے اُنھوں نے مستحکم طاقت پیدا کر لی۔ مشرک اسے بھی نہ دیکھ سکے اور مکہ سے ایک بڑا لشکر لے کر چلے تاکہ مدینہ کے مسلمانوں کو ختم کر دیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اپنی مٹھی بھر فوج کے ساتھ دارالہجرت یعنی مدینہ سے روانہ ہوئے۔ اہلِ اسلام کی بے سروسامانی کا یہ حال تھا کہ گویا جانتے بوجھتے ہلاکت کے منہ میں جا رہے ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے اُن کی مدد کی۔ دشمن کے دِلوں میں اُن کا رُعب ڈال دیا۔ فرشتوں کی کمک بھیجی۔ جنگ کی سکون شکن فضا میں انھیں پرسکون نیند دی۔ آسمان سے بارش کا پانی بھیجا اور جب فوجوں کی ٹکر ہوئی تو دشمن کے سر پکے ہوئے پھلوں کی طرح گرنے لگے۔ ان کے کشتوں کے پشتے لگ گئے باقی ماندہ فوج نے فرار کی راہ لی۔

جنگِ بدر کے بعد اور بھی کئی معرکے ہوئے جن میں مسلمانوں کو اس جنگ کی سی اعجازی کامیابیاں نصیب ہوئیں۔ کیا ان مثالوں کے ہوتے ہوئے بھی انھیں حق پہنچتا ہے کہ وہ بزدلی دکھائیں؟ نہیں ہرگز نہیں! انسان کے دل میں خدا کا اور غیرِ خدا کا دو خوف جمع نہیں ہو سکتے ان میں سے فقط ایک کو انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ مومن کو اللہ کا خوف رہتا ہے۔ خدا کا نام

سن کر اس کا دل دہل جاتا ہے (انفال-۲۰) وہ کسی ماسوا طاقت سے نہیں ڈرتا - اللہ تعالیٰ کا یہ واضح ارشاد ہے کہ جنگ میں بزدلی مت دکھاؤ۔ بزدلوں پر اللہ کا غضب ہوگا۔ بغیر جنگی ضرورت کے پیٹھ تک موڑنا حرام ہے - (انفال-۱۶) بزدلی کو خدا اور اس کے رسولؐ سے غداری قرار دیا گیا ہے۔

فتح کا انحصار

جنگ کثرتِ نفوس سے نہیں جیتی جاتی (انفال-۱۹)۔ اس میں کامیابی مندرجۂ ذیل اسباب پر منحصر ہے :

۱- خدا کو بہت یاد کرو (انفال-۴۵)

۲- خدا اور اس کے رسولؐ کے احکام مانو اور ان سے منہ نہ موڑو- (انفال-۴۶) اخلاق نیک رکھو، اگر تم پرہیزگار بنو گے تو خدا تعالیٰ تمھارے لئے نمایاں امتیاز قائم کر دے گا. عبادت کرو اور خیانت سے باز رہو۔

۳- کامیابی پر پھول نہ جاؤ، غرور کا سر نیچا ہوتا ہے۔ مکّہ کے مشرک جنگِ بدر کے لئے بڑے فخر و ناز کی چال سے نکلے تھے۔ انھیں اپنی طاقت کا بڑا گھمنڈ تھا اُن کے شیطانی دل کہتے تھے کہ آج ہم سے کون جیت سکتا ہے۔ مگر مسلمانوں کے مقابل ہوئے تو چند گھڑیوں میں ہوش کھو بیٹھے۔ (انفال ۴۷-۴۸)

۴- ثابت قدم رہو۔ جس فوج میں عزم و ثبات ہو وہ اپنے سے دس گنا لشکر کو زیر کر دیتی ہے اور اگر بہت بے سروسامان بھی ہو تو کم از کم دوگنے لشکر کو شکست دے سکتی ہے۔ (انفال-۴۵-۶۵)

۵۔ متحد رہو۔ اگر تم میں اختلاف ہوا تو تمھاری ہوا اکھڑ جائیگی
جنگِ بدر کی فتح کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر یہ
بہت بڑا احسان جتایا ہے کہ میں نے تمھارے دلوں میں محبت
پیدا کر دی ہے حالانکہ اس سے قبل تم عرب ہمیشہ سے ایک
دوسرے کے خون کے پیاسے تھے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ
وآلہ وسلم ساری دنیا کے خزانے بھی خرچ کر ڈالتے تو تم میں باہمی
محبت پیدا نہ کر سکتے۔

اس اتحاد نے مسلمانوں کو دشمن پر فتح دلوائی (انفال۔۴۳)

سورۂ انفال ہمیں بتاتی ہے کہ جہاد کی پکار ہو تو مندرجۂ بالا اصولوں کو
سامنے رکھ کر مسلمانوں کو جنگ میں بے خطر کود پڑنا چاہیے۔ مسلمان جب
صلح کے تمام طریقے آزما چکیں (آیت۔۶۱) اور بالآخر تلوار سے تلوار بھڑانا
ہی پڑے تو بے جگری سے لڑیں اور دشمنوں کا بند بند کاٹ ڈالیں۔
(آیت۔۱۲)

جب تک دشمن ہتھیار نہ ڈالے بازارِ قتال کی گرمی بڑھاتے چلیں۔
فساد کے کارندے اچھی طرح دُھن جائیں تو تبھی فتنوں سے باز آئیں گے
(انفال۔۶۷) مسلمان اس وقت تک لڑتے رہیں جب تک دشمن فتنہ سے
باز نہیں آتے اور مذہبی امور سے خود ساختہ قیدیں نہیں اٹھاتے اور ہاں!
جب دشمن سپر ڈال دے تو مسلمان بھی جنگ سے ہاتھ اٹھا لیں۔

قیدی ہاتھ آئیں تو حُسنِ مروت سے انھیں اسلام کی دعوت دیں
وہ مان لیں تو بہتر ورنہ جبر نہ کریں کیونکہ تبدیلِ مذہب میں جبر نہیں۔

غنیمت

اس لفظ کا مادہ غَنِمَ (اس نے حاصل کیا) ہے۔ غنیمت

کے معنی ہیں حاصل کرنا۔

عرب میں اسلام سے پہلے حصولِ مال کا بڑا ذریعہ جنگ کی لوٹ تھا۔ اس لئے اسے بھی غنیمت کہنے لگے۔ ایک خیال ہے کہ اس کا مادہ غَنَم[1] ہے۔ عربوں کے سرمائے کا بڑا حصہ بکریوں کے ریوڑ ہوتے تھے۔ دو قبیلوں کی جنگ میں فریقِ غالب کو مغلوب کا جو مال ہاتھ آتا اس میں زیادہ تر بکریاں ہوتی تھیں۔ اس لئے جنگ سے چھنے ہوئے مال کو غنیمت کہنے لگے۔ غنیمت میں مال واسباب کے علاوہ گرفتار شدہ قیدی بھی شامل ہیں۔

اس کے قریب المعنیٰ ایک اور لفظ فَے ہے جو قرآن مجید میں بھی آیا ہے۔ فَے اس مال کو کہتے ہیں جو کسی ملک یا قوم نے بغیر جنگ کے مرکزِ اسلام کو پیش کیا ہو۔

غنیمت کے لئے قرآنِ حکیم نے انفال کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔

غنیمت کی سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ نہتے قافلے پر حملہ نہ کیا جائے۔ صرف مدافعتی جنگ میں غنیمت کی اجازت ہے اور وہ بھی اس صورت میں کہ جنگ خوب زوروں سے چھڑ چکی ہو۔ اس میں چونکہ مسلمانوں کا جانی اور مالی نقصان ہوتا ہے اس لئے تلافی کے لئے غنیمت مباح اور حلال ہے موجودہ عہد میں بھی مغلوب فریق سے تاوانِ جنگ وصول کیا جاتا ہے۔ غنیمت بھی درحقیقت تاوانِ جنگ ہی کا ایک نام ہے۔ یاد رہے کہ اس کے لئے یہ شرط ازبس ضروری ہے کہ جنگ میں پہل دشمن نے کی ہو۔

---

[1] بکریاں۔

شروع میں اسلامی فوج کی تنخواہیں مقرر نہ تھیں۔ انھیں مالِ غنیمت ہی سے حصّہ ملتا تھا۔ غنیمت کا سب مال ایک جگہ جمع ہوتا تھا پانچواں حصّہ الگ ہو کر بیت المال (قومی خزانے) میں جاتا تھا اور چار حصّے مجاہدین پر بٹتے تھے۔ جو حصّہ بیت المال میں جاتا تھا سورۂ انفال میں اس کے پانچ مصرف بتائے گئے ہیں:۔

۱۔ اللہ
۲۔ رسول
۳۔ ذوی القربیٰ
۴۔ مساکین
۵۔ ابنُ السبیل

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حصّے کا روپیہ رفاہِ عامہ کے کاموں پر خرچ ہوتا تھا۔ حضور کا ارشاد ہے کہ مَالِی اِلَّا الخُمُسُ وَالخُمُسُ مَرْدُوْدٌ لَکُمْ (میرے لئے پانچوں حصّہ ہے اور وہ بھی تمھیں کو واپس مل جاتا ہے) آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی گواہ ہے کہ آپؐ نے غنیمت کو کبھی وسیلۂ تعیش نہیں بنایا۔ آپ کی زندگی نہایت سادہ تھی، مہینوں گھر میں چولھا نہیں دہکتا تھا روکھی سوکھی کھا کر گزر کرتے تھے۔ حضرت عائشہ رضؓ کا بیان ہے کہ ہم کو پیٹ بھر کر کھانا آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد ہی نصیب ہوا۔

ذوی القُربیٰ (رشتہ دار) سے مراد آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رشتہ دار ہیں۔ انھوں نے شروع سے آپؐ کی حفاظت و نگہداشت میں بہت سی قربانیاں دی تھیں اور اس کے علاوہ ان پر زکوٰۃ کے صیغہ سے مدد

اور صدقہ لینا حرام تھا۔ اس لئے اس حصّہ سے ان کے مالی خسارے کی تلافی کی جاتی تھی (آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد آپؐ کے رشتہ داروں کا حصّہ جاتا رہا۔ ان کے وظیفے مقرر ہوگئے۔)

مساکین سے مراد وہ لوگ ہیں جو معذور ہوں اور محنت ومشقت سے عاجز ہوں۔ ابن السبیل مسافر کو کہتے ہیں۔ مساکین کی مدد اور مسافر کی سہولتوں پر جو روپیہ صرف ہوتا تھا اس کا ایک سرچشمہ خمُس بھی تھا۔

آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں نہ کوئی خزانہ تھا اور نہ حساب کتاب کا دفتر۔ غنیمت کا مال مسجد النبی کے صحن میں ڈھیر کردیا جاتا تھا اور وہیں سے بالعموم پہلے ہی دن لوگوں پر تقسیم ہوجاتا تھا۔

جنگ میں قیدی بنانے کا رواج آج بھی ہے۔ فرق یہ ہے کہ اسلام قیدیوں سے محبت آمیز سلوک کرنے کی ہدایت کرتا ہے جیساکہ جنگِ بدر کے واقعات سے ظاہر ہے۔ ان کے سامنے اخلاق کا عمدہ نمونہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ وہ اسلام کی طرف مائل ہوں۔ انھیں قتل کرنے کی اجازت نہیں۔ قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے کہ انھیں فدیہ لے کر یا بطورِ احسان رہا کردیا جائے (محمدؐ۔ ۴)

اگر ان کا کوئی فدیہ دینے والا نہ ہو اور انھیں غلامی ہی میں رکھا جائے تو ان کے ساتھ برادرانہ اور مساویانہ سلوک کیا جائے۔ غلام کو اختیار ہے کہ کسی وقت اپنی قیمت دے کر جان چھڑالے۔ اگر اس کا مالک اس پر ظلم کرے اور حاکمِ عدالت کو اس کا ثبوت مل جائے تو وہ اس کی آزادی کا حکم دے سکتا ہے۔ لوگ غلامی پر اعتراض کرتے وقت لفظِ غلام کو اپنی

لغت کے اعتبار سے دیکھتے ہیں۔ حالانکہ اسلامی مفہوم کے اعتبار سے غلام کی حیثیت بھائی کی سی ہے۔ یہاں تک کہ بعض صورتوں میں وہ اپنے مالک کا وارث بھی ہوتا ہے؛

بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن حیدر آباد نے بذریعہ
سرکلر نمبر SE/PUB/61-698 مورخہ 8-12-61 برائے انٹرمیڈیٹ منظور
فرمائی

اسلامی

نظامِ حیات

شیخ محمد اقبال ایم اے (عربی) - ایم اے (اسلامیات)

علمی کتاب خانہ، اردو بازار، لاہور